مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم، یونیورسٹی آف جموں، جموں

خودآموز مواد

ایم۔اے اردو

سمسٹر سوم

مضمون: غیر افسانوی ادب

کورس نمبر: 306

یونٹ: I - IV

اسباق: 1۔20

پروفیسر (ڈاکٹر) شہاب عنایت ملک

کورس کوآرڈی نیٹر، ایم اے اردو، سی، ڈی، او، ای

صدر شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں

ڈاکٹر پرشوتم پال سنگھ اسسٹنٹ پروفیسر

انچارج ٹیچر، اردو

سی، ڈی، او، ای، جموں یونیورسٹی، جموں

© جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ اس کتاب کا کوئی حصہ کسی شکل میں جموں یونیورسٹی کی تحریری اجازت کے بغیر شائع نہ کیا جائے۔

زیر اہتمام مرکز برائے فاصلاتی و آنلائن تعلیم، جموں یونیورسٹی، جموں

مضمون نگار:

ڈاکٹر شاہ عالم

پروفیسر، شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ

ڈاکٹر سید احمد

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو عالیہ یونیورسٹی کولکتہ ویسٹ بنگال

اڈیٹنگ/ پروف ریڈنگ

ڈاکٹر پرشوتم پال سنگھ

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، سی، ڈی، او، ای، جموں یونیورسٹی، جموں۔

استقبالیہ پیغام

عزیز متعلّم!

سمسٹر سوم کے کورس غیر افسانوی ادب میں آپ کا خیر مقدم ہے۔ یہ کورس اردو کے غیر افسانوی ادب، خصوصاً انشائیہ کی تعریف، فن، خصوصیات، آغاز وارتقا اور اس کی ادبی روایت سے آپ کو روشناس کرانے کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔ اس کے ذریعے آپ انشائیہ کی بنیادی خصوصیات اور اس کے فنی وفکری پہلوؤں کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ اردو انشائیہ کے ارتقا میں اہم انشائیہ نگاروں کی خدمات کا مطالعہ کریں گے۔ اس سلسلے میں سرسید احمد خاں، مولوی ذکاءاللہ، مولوی نذیر احمد، عبدالحلیم شرر اور خواجہ حسن نظامی کی ادبی خدمات کو بھی زیرِ مطالعہ لایا گیا ہے۔

کورس میں شامل منتخب متون کے مطالعے کے ذریعے آپ مختلف ادیبوں کے طرزِ اظہار، زبان و بیان، اسلوب، مشاہدے اور فکری انداز سے واقف ہوں گے۔ ''تعصب''، ''کیا غلط خیال ہے کہ زمانہ برسرِ تنزل ہے''، ''قت''، ''نسیم سحر'' اور ''تنکے کا سلوک'' جیسے متون کے مطالعے سے آپ انشائیہ کے مختلف فنی اور فکری پہلوؤں کو سمجھنے کے قابل ہوں گے۔ اسی طرح رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، مجتبیٰ حسین اور مشتاق لطیفی، کے منتخب متون کے ذریعے آپ اردو کے غیر افسانوی ادب میں طنز ومزاح، شگفتگی، مشاہدے، معاشرتی شعور اور تخلیقی اظہار کی مختلف صورتوں کا مطالعہ کریں گے۔ اس کورس کے مطالعے سے آپ اردو انشائیہ کی روایت اور ارتقا کو بہتر طور پر سمجھنے کے ساتھ ساتھ مختلف انشائیہ نگاروں کے فنی وفکری امتیازات کا جائزہ لینے کے قابل ہوں گے۔ منتخب متون کے مطالعے سے آپ میں ادبی متن کو سمجھنے، اس کی تشریح کرنے اور اس کے زبان واسلوب، طنز ومزاح اور فکری پہلوؤں کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہوگی۔ اس طرح یہ کورس آپ کے ادبی ذوق، تنقیدی شعور اور غیر افسانوی ادب کے مطالعے کو مزید وسعت دینے میں معاون ثابت ہوگا۔

مجھے امید ہے کہ اس کتاب کے بغور مطالعہ کے بعد آپ غیر افسانوی ادب کی روایت، اس کی فنی وفکری خصوصیات اور اس کے مختلف ادبی پہلوؤں کو بہتر انداز میں سمجھ سکیں گے۔ مزید معلومات اور بہتر تفہیم کیلئے اس کتاب میں درج حوالہ جاتی کتب سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ کتب خانے میں موجود متعلقہ کتب سے بھی استفادہ کریں تاکہ آپ کے مطالعے میں وسعت پیدا ہو اور موضوعات کی بہتر تفہیم حاصل ہو سکے۔

آپ کی علمی ترقی اور کامیابی کے لیے نیک خواہشات۔

ڈاکٹر پرشوتم پال سنگھ
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو
مرکز برائے فاصلاتی وآن لائن تعلیم
جموں یونیورسٹی، جموں

Syllabus and Courses of Studyin the Subject of Urdu under NON-CBCS Scheme (CDOE)

SEMESTER- III
COURSE CODE URD-306

Examination to be held in May 2026,2027 and 2028

Title: Study of Non Fiction غیرافسانوی ادب

Credits: 4

Duration of Examination: 2:30 hours

Maximum Marks: 100
(a) Semester Exam: 70
(b) Internal Assessment: 30

Objectives:

The purpose of this course is to acquaint the students with the rise and development of Inshaia (Essay) in Urdu besides making them conversant with its characteristics.

UNIT-I

۱۔ انشائیہ کی تعریف

۲۔ انشائیہ کا فن

۳۔ اُردو انشائیے کا آغاز و ارتقاء

۴۔ اُردو انشائیہ کے ارتقاء میں انشائیہ نگاروں کی خدمات

۵۔ اُردو انشائیہ کے ارتقا میں انشائیہ نگاروں کی خدمات

(اے) سرسید

(بی) مولوی ذکا ئاللہ

(سی) مولوی نذیر احمد (ڈی) عبدالحلیم شرر

(ای) خواجہ حسن نظامی

UNIT-II

متن کی تدریس

۱۔ تعصب۔سرسید

۲۔ کیسا غلط خیال ہے کہ زمانہ برسرتنزل ہے۔مولوی ذکاءاللہ

۳۔ وقت۔مولوی نذیراحمد

۴۔ نسیمِ سحر۔عبدالحلیم شرر

۵۔ تنکے کا سلوک۔خواجہ حسن نظامی

UNIT-III

متن کی تدریس

۱۔ وکیل صاحب۔رشیداحمد صدیقی

۲۔ میں ایک میاں ہوں۔پطرس بخاری

۳۔ غالب جدید شعرائکی مجلس میں۔کنہیالال کپور

۴۔ جنون لطیفہ۔مشتاق لطفی

۵۔ اُردو کا اخری قاری۔مجتبیٰ حسین

UNIT-IV

۱۔ اُردو انشائیہ میں طنز ومزاح

۲۔ اُردو انشائیہ کے ارتقائمیں انشائیہ نگاروں کی خدمات

۳۔ رشیداحمد صدیقی

۴۔ پطرس بخاری

۵۔ کنہیالال کپور

۶۔ مجتبیٰ حسین

۷۔ مشتاق یوسفی

Internal Assessment carry 30% marks in each course. The format of the Internal Assessment Assignments is given below:

ASSIGNMENT 1: Long Answer Questions
Two questions: one each from Unit I and Unit II shall be given. And the learner has to attempt any one question in 800-1000 words. (15 marks)

Assignment 2: Short Answer Questions
Three questions: one each from Unit III, Unit IV and unit V shall be given. And the learner has to attempt any two questions one from unit III, Unit IV and one from unit V in 350-450 words. (7.5x2=15)

Mode of Examination:-
There are four units in the course No:- 306

Mode of the examination:-The term end examination shall carry 70% marks in each course the format of the question paper is given below.

Term End Examination would be of 70 marks. Two short type questions from Unit I and II having 7 marks each be asked. Two descriptive type questions from Unit III and IV of 14 marks each be asked. Two short type questions from Unit III and IV having 7 marks each be asked. 14 objectives type questions of 14 marks carrying 1 mark each be also asked from Unit III and IV.

Books Prescribed. امدادی کُتب

۱۔ انتخاب اُردو نثر) ۱۸۵۷ء ۲۰۱۹ء ایجوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ۔

۲۔ انتخاب اُردو نثر ۲۰۱۹ء کے بعد ای جوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ

Books Recommended.

۱۔ مختصر تاریخ ادب اُردو۔ڈاکٹر سید اعجاز حسین ترجمہ واضافے ڈاکٹر سید محمد عقیل

۲۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح۔ ڈاکٹر وزیر آغا

۳۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح۔	غلام احمد فرقت کاکوروی
۴۔ رشید احمد صدیقی۔ شخصیت اور فن۔	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
۵۔ اُردو انشائیہ۔	وزیر آغا
۶۔ انشائیہ کے فنی سروکار۔	ڈاکٹر احمد امتیاز
۷۔ انشائیہ کی بنیاد۔	ڈاکٹر سلیم اختر
۸۔ فنِ انشائیہ اور انشائیے۔	ڈاکٹر فرحت شمیم
۹۔ انشائیہ کے خدوخال	وزیر آغا
۱۰۔ انشائیہ کی بنیاد	ڈاکٹر سلیم اختر
۱۱۔ انشائیہ اردو ادب میں	ڈاکٹر انور سدید
۱۲۔ انشائیہ	ڈاکٹر آدم شیخ
۱۳۔ ڈپٹی نذیر احمد احوال و آثار	محمد اکرام چغتائی
۱۴۔ مولوی نذیر احمد احوال و آثار	ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی
۱۵۔ لکچروں کا مجموعہ (مرتبہ)	محمد نذیر حسین
۱۶۔ نذیر احمد	نور الحسن نقوی
۱۷۔ فکر و نظر (ڈپٹی نذیر احمد نمبر) علی گڑھ	
۱۸۔ خواجہ حسن نظامی: شخصیت اور ادبی خدمات	نثار احمد فاروقی
۱۹۔ خواجہ حسن نظامی کی نثر	ڈاکٹر مولا بخش
۲۰۔ خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری	سید محمد نیر رضوی
۲۱۔ خواجہ حسن نظامی کتاب نما	خصوصی شمارہ

فہرست

UNIT-I

۱۔ انشائیہ کی تعریف _____ 9

۲۔ انشائیہ کا فن _____ 20

۳۔ اُردو انشائیے کا آغاز وارتقاء _____ 30

۴۔ اُردو انشائیہ کے ارتقاء میں انشائیہ نگاروں کی خدمات _____ 44

UNIT-II

متن کی تدریس

۵۔ تعصب۔سرسید _____ 65

۶۔ کیسا غلط خیال ہے کہ زمانہ برسرتنزل ہے۔مولوی ذکاءاللہ _____ 77

۷۔ وقت۔مولوی نذیر احمد _____ 93

۸۔ نسیمِ سحر۔عبدالحلیم شرر _____ 106

۹۔ تنکے کا سلوک۔خواجہ حسن نظامی _____ 117

UNIT-III

متن کی تدریس

۱۰۔ وکیل صاحب۔رشید احمد صدیقی _____ 131

۱۱۔ میں ایک میاں ہوں۔پطرس بخاری _____ 147

۱۲۔ غالب جدید شعرا کی مجلس میں۔کنہیالال کپور _____ 164

۱۳۔ جنون لطیفہ۔مشتاق یوسفی _____ 189

۱۴۔ اُردو کا اخری قاری۔مجتبیٰ حسین _____ 207

UNIT-IV

۱۵۔ اُردو انشائیہ میں طنز و مزاح _____ 225

۱۶۔ اردو انشائیہ کے ارتقا میں رشید احمد صدیقی کی خدمات _____238

۱۷۔ پطرس بخاری کے انشائیوں میں طنز و مزاح _____251

۱۸۔ کنہیالال کپور کی انشائیہ نگاری میں طنز و مزاح _____261

۱۹۔ مجتبیٰ حسین کی انشائیہ نگاری میں طنز و مزاح _____273

۲۰۔ مشتاق احمد یوسفی کے انشائیہ میں طنز و مزاح _____286

سبق نمبر-1: انشائیہ کی تعریف

شناخت

1.0 اغراض ومقاصد

1.1 تعارف

1.2 انشائیہ کی تعریف

1.3 سرگرمی

1.4 عمومی جائزہ

1.5 فرہنگ

1.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1.7 مشقی سوالات

1.8 مشقی سوالات کے جوابات/جوابات سرگرمی

1.9 امدادی کتب

1.0 اغراض ومقاصد:

عزیز متعلم اس سبق کے مطالعے کے بعد اس قابل ہو جائیں گے کہ

انشائیہ کے لغوی معنی سے واقف ہوں گے۔

انشائیہ کے اصطلاحی معنی سے واقف ہوں گے۔

انشائیہ کے بارے میں ادیبوں کے مختلف اقوال سے واقف ہوں گے۔

صنف انشائیہ سے واقف ہوں گے۔

انشائیہ کے خدوخال سے واقف ہوں گے۔

1.1 تعارف:

اردو کے نثری سرمائے کو افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ غیر افسانوی نثر کی مختلف اصناف میں انشائیہ ایک اہم صنفِ نثر ہے۔ انشائیہ نہایت لطیف صنف ادب ہے۔ اس میں تازگی اور تاثر کے ساتھ انسانی فکر، زندگی اور کائنات کی پراسرار حقیقت بھی سامنے آجاتی ہیں۔ انشائیہ میں موضوع اور مواد کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اس کو کسی بھی موضوع پر فکری یا نیم فکری مواد کے ساتھ آزادانہ طور پر قلم بند کیا جاسکتا ہے۔ کسی بھی صنف کی خصوصیات، موضوعات، طرز اظہار اور امتیازی خوبیوں کو سمجھنے میں اس کی تعریف مددگار ثابت ہوتی ہے۔ انشائیہ کا معاملہ دیگر اصناف سے مختلف ہے۔ انشائیہ کیا ہے؟ اس کی صنفی خصوصیات کیا ہیں؟ انشائیہ میں کس قسم کی تحریروں کو شامل کیا جائے؟ اس سے متعلق ناقدین اور انشائیہ نگاروں کی مختلف آرا ہیں۔ انشائیوں کے متعلق ادب کے ناقدین نے تنقیدی مضامین تحریر کیے۔ اس پر سوالات قائم کر کے بحث ومباحثہ کے ذریعے انشائیہ کے بارے میں قابل قدر معلومات فراہم کی ہیں۔

1.2 انشائیہ کی تعریف:

ادب کی بعض دوسری اصناف کی طرح انشائیہ کی کوئی حتمی تعریف متعین نہیں کی جاسکی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس کے موضوعات اور زبان وبیان کے لحاظ سے کوئی حد مقرر یہ نہیں کی جاسکتی۔ انشائیہ ابتدائی دور میں مختلف ناموں سے بھی جانا جاتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کی الگ پہچان بھی قائم ہوئی۔ آئیے سب سے پہلے اس کے لغوی معنی پر غور کرتے ہیں۔ 'انشائیہ' عربی لفظ 'انشاء' سے بنا ہے، جس کے معنی تخلیق، عبارت آرائی، تحریر یا دل سے کوئی بات کرنا، کے ہیں۔ اردو کی لغات میں انشائیہ کے مختلف معنی درج ہیں۔ نوراللغات میں انشاء کے یہ معنی بیان کیے گئے ہیں:

عبارت لکھنا

دل سے کوئی بات پیدا کرنا

عبارت، طرز تحریر

وہ کتاب جس میں خطوط۔ اور قواعد خط کتابت لکھے ہوں۔

فرہنگ آصفیہ میں انشاء کے یہ معنی بیان کیے گئے ہیں:

کچھ بات دل سے پیدا کرنا

عبارت، تحریر

علم معانی و بیان، صنائع و بدائع، خوبی، عبارت طرز تحریر

وہ کتاب جس میں خط و کتابت سکھانے کے واسطے ہر قسم کے واسطے ہر قسم کے خطوط جمع ہوں

لیٹر بکس چٹھیوں کی کتاب۔

انشائیہ کی ابتدا مغرب میں ہوئی۔ انگریزی ادب نے اس صنف یعنی Essay کو پروان چڑھایا۔ انگریزی میں کئی اہم ادیبوں نے اپنی قابل قدر نگارشات کے ذریعے اس صنف کو عالمی پیمانے پر مقبولیت سے ہمکنار کیا۔ انگریزی کے ادیبوں اور تنقید نگاروں کے خیالات کا جاننا اس صنف کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ انشائیہ کی مختلف تعریفیں درج ذیل ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹی کا میں ایسے کی تعریف درج ذیل ہے:

> "The English mind the true Essay is a composition of moderate length, usually in prose which deals in an easy, cursory way with the chosen subject and with the relation of that subject to the writer."

جارج سینٹ بری کے نزدیک 'ایسے' کسی دلچسپ قسم کے آدمی کی گفتگو ہے جسے ہر قسم کی معلومات ہے اور انداز ایسا جو عام طور پر کھانے کے بعد پر لطف بات چیت کا ہوا کرتا ہے۔

> "After dinner monologue of an interesting and well informed man."

ڈبلیو ایم ہڈسن انشائیہ کو ایک ایسی تحریر کے روپ میں دیکھتے ہیں جو مصنف کے ذہن اور شخصیت کی عکاسی کرتی ہے۔ سچے انشائیہ کی بنیادی صفت یہ ہے کہ مصنف کا ذہن اور کردار اس کی تحریر کے مواد سے ظاہر ہو۔ ڈبلیو ای ولیم کے خیال میں ''انشائیہ عام طور پر ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہوتا ہے تاہم انشائیہ نگار نکتہ آفرینی کے لیے کسی چھوٹے سے واقعے کو بھی استعمال کرسکتا ہے اور اپنے زاویہ خیال کی تمثیلی وضاحت کے لیے ناول سے ایک ورق لے کر اس سے کردار بھی تخلیق کرسکتا ہے۔ لیکن واضح رہے کہ انشائیہ نگار کا بڑا مقصد کہانی کی پیش کش نہیں بلکہ انشائیہ نگار معاشرے کا فیلسوف، ناقد اور حاشیہ نگار ہے۔''

انشائیے کے سلسلہ میں جانسن کی یہ تعریف سب سے زیادہ مشہور ہوئی:

"An Essay is a sally of the mind, an irregular indigested piece, not regular and orderly composition."(The English Essay and Essaists)

''انشائیہ ذہن کی آزاد ترنگ اور بے قاعدہ اور غیر منظّم عمل ہے''۔

جانسن منصوبہ بند فکر سے گریز اور سوچ کی آزاد روی کو انشائیہ کا شناختی نشان قرار دیتا ہے۔

بیکن کے مطابق:

''ایسی مختصر تحریریں جن میں بغیر کسی تجسس اور کھوج کے کسی حقیقت کا اظہار ہو جائے میری نظر میں انشائیہ ہیں۔''

ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں کہ لفظ انشاء کے ادبی مفہوم کی مقبولیت سے قبل لغوی معنوں میں عبارت اور تحریر کے لیے روزمرہ زندگی میں یہ لفظ عام تھا۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے :

انشاء کا لفظ ابتدا میں ایک دفتری اصطلاح تھا۔ اس کا اطلاق سرکاری فرامین اور مکتوبات کے رف ڈرافٹ پر ہوتا تھا اور صاف شدہ مسودہ کو تحریر کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ جس محکمہ کے سپرد مسودہ تیار کرنے کا کام ہوتا تھا اس نے دیوان الانشاء کا نام پایا۔ رفتہ رفتہ فرامین اور مکتوبات کی تحریر و ترتیب کے لیے انشاء کا لفظ مستعمل ہو گیا۔ درباداری کے زیر اثر فارسی نثر میں نثر سادہ کے پہلو بہ پہلو مصنوع (نثر رنگین) ساسانی دور ہی سے رائج ہو چکی تھی۔ یہی نثر احکام و فرامین اور مکتوبات کی زبان قرار پائی۔ اس نثر میں خطابت کا عنصر جزو اعظم تھا۔ اس سے انشاء پردازی کی وہ نسج وجود میں آ گئی جس کو ہم انشائیہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔''

کلیم الدین احمد کا خیال مختلف ہے۔ کلیم الدین احمد نے انشائیہ کو مشرقی ادبی روایت سے نہیں جوڑا۔ ان کے نزدیک انشائیہ خالصتاً مغرب کی دین ہے۔ کلیم الدین احمد انشائیہ کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انشائیہ کوئی نئی صنف نہیں، یہ وہی صنف ہے جسے انگریزی میں ایسّے Essay کہتے ہیں۔ خط کی طرح انشائیہ بھی اپنی تلاش اور اپنی دریافت ہے جس میں انشائیہ نگار اپنے کردار کے سرچشموں کو پالیتا ہے، جس میں اس کی شخصیت کے متضاد عناصر ابھر آتے ہیں۔ یہ انمل، بے جوڑ اور ہم آہنگی سے عاری نظر آتی ہے۔ وہ اپنی کمزوریوں اور خامیوں کو ابھارتا

ہے۔ وہ اس طرح ان سے نجات پالیتا ہے۔ اس کا اصل موضوع اس کی شخصیت اور اس کی آزادی ہے۔ کیونکہ دانش مند وہی ہے جو اپنی شخصیت کو پالے اور اپنی فطری آزادی کو ہاتھ سے جانے نہ دے۔''

مشکور حسین یاد لکھتے ہیں:

''چونکہ انشائیہ ادب کا ایک فطری اظہار ہیاس لیے ہر ادیب اس کا موجد ہوتا ہے۔ دنیا کی ہر زبان میں جب اسکے ادب کا آغاز ہوا تو انشائیہ وجود میں آیا اس لیے کسی کا یہ پ دعویٰ کرنا کہ صرف وہی انشائیہ کا موجد ہے ایک کھلی حماقت کے سوا اور کچھ نہیں۔ انشائیہ کی تعریف لفظوں میں نہیں ہوا کرتی، انشائیہ کی تعریف یا تو انشائیہ پڑھنا یا انشائیہ لکھنا''

(ممکنات انشائیہ)

نظیر صدیقی کے مطابق:

''انشائیہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں حکمت سے لے کر حماقت تک اور حماقت سے لے کر حکمت تک کی ساری منزلیں طے کی جاتی ہیں۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں بے معنی باتوں میں معنی تلاش کیے جاتے ہیں۔ اور بامعنی باتوں میں مہملیت اور مجہولیت اجاگر کی جاتی ہے۔'' (شہرت کی خاطر)

اردو میں انشائیہ کو انگریزی زبان کے لفظ Essay یا Light Essay یا personal Essa y کے متبادل کے طور پر استعمال کیا گیا جاتا رہا ہے۔ اردو میں اس انشائیہ کے لیے ادب لطیف، انشائے لطیف یا لطیف پارہ وغیرہ ناموں سے جانا جاتا تھا۔ اس کے زمرے میں وہی تحریریں آتی تھیں جس میں تخیل اور جذبات کی شدت اور اسلوب بیان میں شگفتگی ہو۔ خیالات کے اظہار میں دلکشی کا پہلو مقدم رہتا ہے۔ انشائیہ نگار کسی بھی موضوع پر طبیعت کی ترنگ میں اپنے خیالات قلم بند کرتا ہے۔ چونکہ موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی اس لیے انشائیہ نگار اپنے موضوع کا انتخاب آزادانہ طور پر کرتا ہے۔ اس لیے انشائیوں میں اسلوب کی تازگی اور جولانی طبع کی رنگینی نمایاں نظر آتی ہے۔

اُردو میں ایک زمانے تک مضمون نگاری اور انشائیہ نگاری کو ایک ہی سمجھا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ دونوں میں فرق کیا جانے لگا۔ مضمون نگاری کے لیے Essay اور انشائیہ نگاری کے لیے Light Essay کی اصطلاح استعمال کی جانے لگی۔ انشائیہ اپنے مقاصد، وسعت، تنوع اور تخلیقی تناظر کے اعتبار سے مضمون سے مختلف ہوتا ہے۔ دونوں اصناف کے درمیان فرق کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ مضمون معلوماتی اور انشائیہ احساس ہوتا ہے۔ مضمون اپنے نکات (Points) کے اعتبار سے متعین (Fixed) ہوتا ہے جب کہ انشائیہ اپنے اندر بے پناہ ہمہ گیریت

رکھتا ہے۔مضمون میں موضوع کوخصوصیت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے جب کہ انشائیہ میں عمومی اعتبار سے۔مضمون میں خارجیت کا غلبہ ہوتا ہے جب کہ انشائیہ میں داخلیت کا۔دونوں اصناف ایک دوسرے سے قریب ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ذیل میں انشائیہ کی مختلف ناقدین کی آرا بیان کی جارہی ہیں جن سے انشائیہ کے معنی ومفاہیم کو سمجھنے میں مدد ملے گی ۔بقولڈاکٹر وزیر آغا:

''انشائیہ اس صنف نثر کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیا یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور پر گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آ کر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔''(انشائیہ کے خدوخال)

انشائیہ کی تعریف سید احتشام حسین نے کچھ اس طرح سے کی ہے:

''انشائیہ کو ایک ایسی فلسفیانہ شگفتگی کا حامل ہونا چاہیے جو پڑھنے والے کے ذہن میں استدلال کے ذریعے نہیں بلکہ محض خوشگوار استعجاب اور بے ترتیب انداز بیان کے ذریعے اپنا تاثر قائم کرے۔''

(اردو انشائیہ)

اختر اورینوی کا خیال ہے کہ:

انشائیہ فلسفیت اور رنگینی کا مجموعہ ہوتا ہے۔ایسی فلسفیت جس میں دل جلے پن،خشونت یا وحشت خیز سنجیدگی نہ ہو، یہاں فلسفہ ہوتا ہے مگر بغیر زندھے ہوئے چہرے کے،رنگینی ہوتی ہے مگر ذمہ داری کے ساتھ۔''

(مقدمہ 'ترنگ' علی اکبر قاصد)

بقول نظیر صدیقی:

''انشائیہ نام ہے اس مضمون کا جس کی لمبائی ایک سے بیس یا تیس صفحے تک کچھ بھی ہوسکتی ہے۔جس میں کسی بھی موضوع سے بحث کی جاسکتی ہے۔جو اپنے مشن اور اسلوب دونوں اعتبار سے شخصی ہوتا ہے۔جو انداز فکر یا انداز نظر یا انداز بیان کے اعتبار سے غیر سنجیدہ یعنی لائٹ ہوتا ہے۔جس میں گہری سے گہری بات بھی سہل اور سرسری انداز میں کہی جاتی ہے۔ جس میں عدم سنجیدگی اور لاابالی پین کی فضا پائی جاتی ہے۔جس میں طنز ومزاح کے عناصر جلی بھی ہوسکتے ہیں اور خفی بھی جس کا مقصد قاری کو محظوظ کرنا بھی ہوسکتا ہے اور اسے سوچنے پر مائل کرنا بھی۔'' (انشائیہ کیا ہے؟)

عبادت بریلوی کے مطابق:

''انشائیہ ادب لطیف کی وہ صنف ہے، جسے عام طور پر ہلکے پھلکے ادب (Light Literature) سے منسوب کرتے ہیں، یعنی جس میں انشا پردازی کا مقصود علمی وادبی یا سماجی واصلاحی نہیں بلکہ محض نشاطی اور انبساطی ہے۔''

(انشائیہ نمبر 'ادیب'، علی گڑھ)

ان تمام ناقدین کی آرا سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انشائیہ کی کوئی حتمی تعریف متعین نہیں کی جاسکتی۔ لیکن ان تعریفوں کی روشنی میں انشائیہ کے معنی و مفاہیم تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ ان تعریفوں میں ایک چیز قدر مشترک ہے اور وہ یہ کہ انشائیہ میں شگفتگی، رنگینی اور نشاط وانبساط کی کیفیت لازم ہے۔ اچھا انشائیہ پڑھنے کے بعد قاری نشاط وانبساط کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ انشائیے میں رمز واشارے میں بات کہنے کا ایسا انداز اختیا کیا جاتا ہے کہ فلسفیانہ خیالات اور پیچیدہ مسائل سے بھی لطف حاصل ہونے لگتا ہے۔ بلا شبہ مختلف تعریفوں سے انشائیہ کے ظاہری و باطنی خصوصیات اور خدوخال نمایاں ضرور ہوئے ہیں۔ ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ انشائیہ کی بنیادی صفت عبارت آرائی اور حسن بیان میں مضمر ہے۔

اردو میں انشائیہ نگاری کے دو اسالیب رائج ہیں، ایک مزاحیہ اور دوسرا سنجیدہ۔ انھیں دونوں اسالیب کی وجہ سے اکثر مغالطے پیدا ہوئے ہیں اور اسے متنازعہ بھی بنا دیا گیا ہے۔ اردو میں انشائیہ لکھنے والوں کا طریقہ بھی جدا جدا رہا ہے۔ ایک طبقہ انگریزی انشائیہ کو اختیار کر کے وہی انداز پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جب کہ دوسرا طبقہ اپنی تحریر میں آزادانہ سمعت دینے کی سعی کرتا ہے تا کہ الطاف کی خوبیاں پیدا ہوسکیں۔ کوئی طنز و مزاح کو انشائیے کے لیے سم قاتل سمجھتا ہے تو کوئی اسے تریاق۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں اسالیب اپنی اپنی جگہ درست اور ذہنی وقلبی سکون میں معاون اور نشاط وانبساط کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ اسلوب کی رنگارنگی سے ہی فن کو جلا ملتی ہے۔ نظیر صدیقی نے لکھا ہے:

''انشائیہ کا بنیادی مقصد ناظر کو مسرت بہم پہنچانا ہو، یا اسے سوچنے پر مائل کرنا، طنز و مزاح دونوں مقاصد کی تکمیل کے لیے معاون ہیں۔ کیوں کہ طنز و مزاح میں مسرت آفرینی اور خیال انگیزی دونوں کی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ رہا یہ سوال کہ انشائیے میں طنز و مزاح کا تناسب کیا ہو تو اس معاملے میں کوئی طبی نسخہ تیار نہیں کیا جاسکتا کہ انشائیہ میں دو ماشے طنز ہو اور تین تولے مزاح، یہ تو لکھنے والے کی افتاد طبیعت پر منحصر ہے۔'' (انشائیہ کیا ہے)

1.3 سرگرمی: آواپنی معلومات جانچیں

خالی جگہیں پر کیجیے:

1-انشائیہ عربی لفظ۔۔۔۔۔۔۔۔سے بنا ہے۔

2-اردو میں ایک زمانے تک مضمون نگاری اور۔۔۔۔۔۔۔کو ایک ہی سمجھا جاتا تھا۔

3-انشائیہ میں۔۔۔۔۔۔کی کوئی حد نہیں ہوتی۔

4-انشائیہ۔۔۔۔۔۔۔سے درآمد شدہ ہے۔

5-انشائیہ اپنے اندر ۔۔۔۔۔۔۔رکھتا ہے۔

1.4 عمومی جایزہ:

اردو نثر کے طریق اظہار اور زبان واسلوب کو ایک نیا آہنگ ایک نئی طرز اور اظہار وابلاغ کے متعدد نئے زاویے دستیاب ہوئے۔سنجیدہ ادب میں بھلے ہی انشائیے کی گنجائش کم ہو لیکن زبان و بیان، طریق اظہار اور اپنے لہجے کے اعتبار سے اس صنف نے اردو کو بہت کچھ دیا ہے۔ انشائیے نے اردو نثر کے پر تکلف انداز بیان کو غیر رسمی اور بے تکلف بنایا۔نثر میں انشائیہ واحد صنف ہے جس میں مصنف اپنا دل و دماغ کھول کر رکھ دیتا ہے۔اس میں انشائیہ نگار موضوع کو مزاج کی داخلیت سے محسوس کرتا ہے۔انشائیہ نے اردو نثر کو داخلیت کے اظہار کا سلیقہ سمجھایا۔ایجاز واختصار بھی اردو نثر میں انشائیہ کی دین ہے۔انشائیہ کا غیر رسمی انداز فکر جو تحریر کو بوجھل ہونے سے بچاتا ہے، اردو نثر میں انشائیہ کے ذریعہ ہی پہنچا ہے۔الفاظ کو روایتی معنوں سے ہٹ کر استعمال کرنے کا رواج جو مخصوص سیاق وسباق سے ممکن ہے اردو نثر میں انشائیہ کی دین ہے۔انواع واقسام کے خیالات، افکار اور موضوعات کو لے کر نئے نئے الفاظ اختراع کرنا الفاظ کے فقروں اور فقروں کی جملوں میں نحوی ترتیب میں الٹ پھیر کرنا۔جس سے اردو نثر میں تنوع آیا ہے۔اس کے علاوہ انشائیوں نے اردو نثر کو جو نیا اسلوب دیا ہے۔انشائیوں نے اردو کو استعاراتی نثر لکھنے کی ترغیب بھی دی ہے۔یہ بات اس لیے اہم ہے کہ یہ ادبی نثر کی معراج ہے، انشائیہ میں نثر کی تخلیقی قوت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔کیونکہ انشائیہ میں خاص زور طرز بیان پر ہوتا ہے اس لیے اس صنف میں قدم قدم پر زبان و بیان کے نت نئے شگوفے پھوٹتے ہیں جس سے زبان کا دامن وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

1.5 فرہنگ:

الفاظ	:	معنی
پراسرار	:	پیچیدہ، جس میں کچھ راز یا بھید ہو
درآمد شدہ	:	باہر کے ملک سے آیا ہوا مال
وسعت	:	پھیلاو، کشادگی
تنوع	:	قسم قسم کا ہونا، رنگ برنگ کا ہونا
داخلیت	:	خیالی وذہنی امور یا قلبی واردات کا انعکاس
نکات	:	باریکیاں، نکتہ کی جمع
استدلال	:	دلیل لانا، سند لانا
وحشت	:	گھبراہٹ، جنون
اسالیب	:	طور طریقے، آداب
انبساط	:	خوشی، شادمانی
مسودہ	:	لکھا ہوا، وہ تحریر جو سرسری لکھا جائیاور جس کو صاف کرنے کی ضرورت پڑے۔
خدوخال	:	چہرہ مہرہ، شکل وصورت کی ساخت
انداز نگارش	:	اسلوب تحریر
پروان چڑھنا	:	کمال کو پہنچنا

1.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات:

1- انشائیہ کی تعریف بیان کیجیے۔

2- انشائیہ کی اہم خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

3- انشائیہ کے کیا معنی ومفاہیم پر روشنی ڈالیے۔

1.7 مشقی سوالات:

1- جانسن نے انشائیہ کی کیا تعریف بیان کی ہے؟

2- وزیر آغا کے نزدیک انشائیہ کیا ہے؟

3- انشائیہ اور مضمون میں کیا فرق ہے؟

4- انشائیہ کی بنیادی صفت کیا ہے۔

1.8 مشقی سوالات کے جوابات /جوابات سرگرمی

1- جانسن کے نزدیک 'انشائیہ ذہن کی آزاد ترنگ اور بے قاعدہ اور غیر منظّم عمل ہے'

2- ''انشائیہ اس صنف نثر کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیا یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور پر گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آ کر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

3- انشائیہ اور مضمون میں گرق یہ ہے کہ مضمون معلوماتی اور انشائیہ احساس ہوتا ہے۔ مضمون اپنے نکات (Points) کے اعتبار سے متعین (Fixed) ہوتا ہے جب کہ انشائیہ اپنے اندر بے پناہ ہمہ گیریت رکھتا ہے۔ مضمون میں موضوع کو خصوصیت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے جب کہ انشائیہ میں عمومی اعتبار سے۔ مضمون میں خارجیت کا غلبہ ہوتا ہے جب کہ انشائیہ میں داخلیت کا۔ دونوں اصناف ایک دوسرے سے قریب ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

4- انشائیہ کی بنیادی صفت عبارت آرائی اور حسن بیان میں مضمر ہے۔

1- انشاء

2- انشائیہ

3- موضوعات

4- مغرب

5- بے پناہ ہمہ گیریت

1.9 امدادی کتب:

امدادی کُتب Books Prescribed.

۱۔ انتخاب اُردو نثر) ۱۸۵۷ء ۲۰۱۹ء ایجوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ۔

۲۔ انتخاب اُردو نثر ۲۰۱۹ء کے بعد ای جوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ

Books Recommended.

۱۔	مختصر تاریخ ادب اُردو۔ڈاکٹر سید اعجاز حسین ترجمہ واضافے	ڈاکٹر سید محمد عقیل
۲۔	اُردو ادب میں طنز ومزاح۔	ڈاکٹر وزیر آغا
۳۔	اُردو ادب میں طنز ومزاح۔	غلام احمد فرقت کاکوروی
۴۔	رشید احمد صدیقی۔شخصیت اور فن۔	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
۵۔	اُردو انشائیہ۔	وزیر آغا
۶۔	انشائیہ کے فنی سروکار۔	ڈاکٹر احمد امتیاز
۷۔	انشائیہ کی بنیاد۔	ڈاکٹر سلیم اختر
۸۔	فن انشائیہ اور انشائیے۔	ڈاکٹر فرحت شمیم
۹۔	انشائیہ کے خدوخال	وزیر آغا
۱۰۔	انشائیہ کی بنیاد	ڈاکٹر سلیم اختر
۱۱۔	انشائیہ اردو ادب میں	ڈاکٹر انور سدید
۱۲۔	انشائیہ	ڈاکٹر آدم شیخ

سبق نمبر۔2: انشائیہ کا فن

ساخت

2.0 اغراض ومقاصد
2.1 تعارف
2.2 انشائیہ کا فن
2.3 سرگرمی
2.4 عمومی جائزہ
2.5 فرہنگ
2.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات
2.7 مشقی سوالات
2.8 مشقی سوالات کے جوابات/جوابات سرگرمی
2.9 امدادی کتب

2.0 اغراض ومقاصد:

عزیز متعلم اس سبق کے مطالعے کے بعد اس قابل ہو جائیں گے کہ

انشائیہ کے فن سے واقف ہوں گے۔

انشائیہ کے بنیادی عناصر سے واقف ہوں گے۔

انشائیہ کی تعمیر وتشکیل میں فنی باریکیوں سے واقف ہوں گے۔

انشائیہ کی خصوصیات سے واقف ہوں گے۔

انشائیہ کے خدوخال سے واقف ہوں گے۔

2.1 تعارف:

تخلیق کار اپنے تخلیقی اظہار کے لیے مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے اس کے تخلیقی اظہار کی بہترین صورت ادب میں دیکھی جا سکتی ہے۔ادب کے نثری اظہار میں غیر افسانوی نثر کی مختلف صورتوں میں انشائیہ بھی ایک صنفِ نثر ہے۔ انشائیہ تخلیقی اظہار ہی کی ایک اہم صنف ہے۔ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ ہر صنف ادب کے تقاضے ہیں۔ان کی تعمیر وتشکیل میں اسکے فنی تقاضوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ انشائیہ کے فن کا بنیادی مقصد زبان و بیان میں نئی تازگی پیدا کرنا اور موضوع سے متعلق نئے تاثرات کو جنم دینا ہے۔اس عمل سے انسانی فکر، زندگی اور کائنات کی نئی حقیقت سامنے آتی ہے۔انشائیہ کا دائرہ بہت وسیع ہے۔اس میں موضوع اور مواد کی کوئی قید نہیں ہوتی۔کسی بھی موضوع پر آزادانہ طور پر اظہار خیال کیا جا سکتا ہے۔انشائیہ کے لیے ضروری ہے کہ موضوع اور مواد نئے تناظر میں ہوں اور اس میں تفہیم کی تازہ کاری سے نیا زاویہ بھی پیدا ہو، تاکہ پیش کردہ موضوع میں انوکھا پن ہو۔ جب ہم کسی موضوع کو کسی نئے زاویے سے یا زاویہ بدل کر دیکھتے ہیں تو اس میں سے نئی حقیقت دریافت ہوتی ہے۔اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ موضوع سے نئی حقیقت کو دریافت کرنا ہی انشائیہ کے فن کا اصل مقصد ہے۔

2.2 انشائیہ کا فن:

انشائیہ غیر افسانوی اردو نثر کی اصناف میں سے ایک صنف ہے۔ ہر صنف ادب کا اپنا مزاج اور اس کی حدود ہوتی ہیں جن کے دائرے میں اس صنف کی اپنی شناخت قائم ہوتی ہے۔غیر افسانوی نثر کی دوسری اصناف کی طرح اس نثری صنف کے بھی اپنے تقاضے ہیں۔انشائیہ نثری صنف ہے لیکن اس میں شعر وسخن کا سا لطف ہوتا ہے۔اس تازگی اور تاثر سے انسانی فکر، زندگی اور کائنات کے پر اسرار حقائق سامنے آجاتے ہیں۔اس میں موضوع کی کوئی پابندی نہیں ہوتی ہے۔انشائیہ کسی بھی موضوع پر فکری یا نیم فکری مواد کے ساتھ آزادانہ طور پر قلم بند کیا جا سکتا ہے، تاہم یہ خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ موضوع اور مواد کا کی تازہ کاری سے نیا زاویہ اور پیش کردہ موضوع میں انوکھا پن ظاہر ہو۔ جب کسی موضوع کو

کسی نئے زاویے سے یا زاویہ بدل کر پیش کیا جاتا ہے تو اس میں نئی حقیقت دریافت ہوتی ہے۔اس لیے کہا جاتا ہے کہ نئی حقیقت کو دریافت کرنا ہی انشائیہ کے فن کی اصل غرض و غایت ہے۔انشائیہ کے فن میں تین چیزیں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔اول خیال، دوم معنی اور سوم بیان۔ان تینوں کی ہم آہنگی سے ہی انشائیہ کا فن نمو پاتا ہے اور کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔انشائیہ کے بارے میں مختلف ادبا و ناقدین نے مختلف طرح کے تاثرات و خیالات کا اظہار کیا ہے۔یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> انشائیہ نگار کو اس کا اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ اپنے انشائیہ کو خیالات سے بوجھل نہ بنا دے کہ اس کا بوجھ مخاطب برداشت نہ کر سکے ورنہ اس کی حیثیت مضمون کی سی ہو جائے گی جس میں مختلف مسائل زیر بحث آتے ہیں اس کو یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ کس بات پر زور دیا جائے اور کسے یونہی روا روی میں بیان کر دیا جائے۔انشائیہ نگا اپنی تخلیق میں منطق سے بھی گریز کرتا ہے اور اپنی بات کو دلیلوں سے ثابت نہیں کرتا بلکہ اسے اپنے ذاتی احساسات کے ذریعے دوسروں کو پہنچاتا ہے۔ (انشائیہ۔اطہر پرویز)

> انشائیہ جس صنف سے سب سے زیادہ قریب ہے وہ غزل ہے۔انشائیہ نگار سے انشائیے کا مطالبہ وہی ہوتا ہے جو ایک اچھے غزل گو سے غزل کا ہوتا ہے۔۔۔۔۔مطلب یہ ہے کہ غزل میں بھرتی کا شعر نہیں ہونا چاہئے۔ٹھیک اسی طرح انشائیے میں بھرتی کے پیرا گراف نہیں ہونے چاہئیں۔اور اگر چہ انشائیے کو مضمون کی ایک قسم کہہ سکتے ہیں کیوں کہ انشائیہ مضمون کے فارم میں لکھا جاتا ہے۔افسانہ یا ناول کے فارم میں نہیں۔تاہم انشائیے کے اندر مضمونیت بالکل نہیں ہونی چاہئے۔انشائیے میں معنی آفرینی، نکتہ سنجی اور بصیرت کی گنجائش ضرور ہے لیکن حاص علمیت اور بقراطیت کے مظاہر کی گنجائش ہرگز نہیں ہے۔ (نظیر صدیقی، کچھ انشائیہ کے بارے میں)

انشائیہ کے بارے میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ انشائیہ ہماری سماجی زندگی کے کسی موضوع پر قلم کار کی ایک گپ ہے جس میں آپ بیتی اور جگ بیتی کی دھوپ چھاؤں ہوتی ہے۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انشائیہ میں ایک مرکزی بات سے کچھ ضمنی باتیں پھوٹ کر اپنا تانا بانا تیار کرتی ہیں۔اس میں رمزیت ہوتی ہے۔اختصار اور تہہ داری ہوتی ہے اور زبان و بیان میں کاٹ و بانکپن ہوتا ہے۔دراصل مسرت بہم پہنچانا انشائیے کا بنیادی کام ہے۔عدم تکمیل اس کی ایک اہم خصوصیت میں شامل ہے۔موضوع کی مرکزیت کے علاوہ اس میں ضمنی باتیں بھی ہوتی ہیں۔مضمون یا مقالہ کے مقابلے میں اس کا ڈھانچہ کہیں زیادہ لچیلا ہوتا ہے۔اس میں مرکزی خیال کے باوصف دلائل کا کوئی منضبط سلسلہ قائم نہیں کیا جاتا۔وہ دعوت فکر

دیتا ہے۔ اختصار اس کا بنیادی وصف ہے۔ انشائیہ کا موضوع اور نقطہ نظر انوکھا ہوتا ہے۔ جو قاری کی زندگی کی یکسانیت اور ٹھہراؤ سے اوپر اٹھ کر ماحول کا از سرنو جائزہ لینے پر مائل کرتا ہے۔ انشائیہ نگار کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی مشورہ دیتا ہے بلکہ وہ مخصوص انداز سے کسی موضوع پر سوچنے کی ترغیب دیتا ہے اور بس۔ انشائیہ میں فکر و خیال کی نئی نئی لہر موجزن رہتی ہیں۔ ہر خیال جو انشائیہ نگار کے ذہن میں وارد ہوتا ہے اسے پورے تاثیر کے ساتھ مختصر سے مختصر الفاظ میں ادا کرتا ہے۔ غزل کی طرح انشائیہ بھی ایسی صنف ہے جس میں وضاحت کی گنجائش نہیں۔ دراصل ایمائیت انشائیہ کا حسن ہے۔ بات جتنی اشاروں کنایوں میں ہو اتنی ہی خوبصورت اور فنکارانہ ہوتی ہے بشرطیکہ وہ سوچ اور خیال کے دروازے کھولتی جائے۔ انشائیہ میں اختصار ہونے کے باوجود انشائیہ کی تفہیم میں مشکل پیش نہیں آتی۔ انشائیہ میں وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

انشائیہ میں لطافت اور شگفتگی بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے انشائیہ لکھتے ہوئے انشائیہ نگار موضوع کے انتخاب میں محتاط رہتا ہے وہ ہر خیال کو انشائیہ میں شامل نہیں کرتا۔ وہ خیال کے حسن و نزاکت کی طرف نگاہ رکھتا ہے اور اپنے فن پارہ کے مجموعی حسن کو غارت نہیں کرتا۔

انشائیہ میں ہر خیال اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے ایک اچھے انشائیہ میں کوئی خیال اپنے نفس مضمون کے اعتبار سے زیادہ اہم اور کم اہم نہیں ہوتا۔ کسی ادنی سی بات کو ندرت فکر و نظر دینے کا نام ہی انشائیہ ہے اور انشائیہ میں اس کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ اچھے انشائیہ نگاروں نے اکثر ادنی باتوں کو انشائیہ کا موضوع بنایا ہے۔ بعض اوقات یہ موضوع اتنا معمولی دیکھائی دیتا ہے کہ اس میں کسی خیال آفرینی کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ عام انسان بھی ان موضوعات کے متعلق بہت کچھ جانتا ہے لہذا ان میں قطاً کسی ندرت فکر و نظر کا بظاہر کوئی امکان نہیں ہوتا مگر انشائیہ نگار جب اسی موضوع میں گہرائی، وسعت اور بلندی تلاش کرتا ہے اور اس موضوع پر غور کرنے کے نئے زاویئے ڈھونڈ نکالتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ عام آدمی کا تاثر و علم ان روزمرہ کے موضوعات پر کتنا سطحی ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار کی ژرف نگاہی، جودت فکر اور رعنائی خیال کن کن اسالیب سے اس ادنیٰ موضوع کو اٹھا کر فکر و فن کی بلندیوں پر لے جاتی ہے۔

انشائیہ کی ہلکی پھلکی فضا قاری کے ذہن کو گراں بار نہیں ہونے دیتی۔ انشائیہ نگار اپنے قاری کو ساتھ لے کر آگے چلتا ہے جہاں ہنستا وہاں اپنے قاری کو بھی ہنسنے پر مجبور کرتا ہے، جن کیفیات سے گزرتا ہے قاری کو بھی ان میں مبتلا کرتا ہے۔ انشائیہ نگار کے خیال کی گونج کو قاری اپنے دل میں محسوس کرتا ہے، انشائیہ کا ہلکا پھلکا سبک اور لطیف انداز اپنے اندر وہی کیفیت رکھتا ہے۔ اردو کی اصناف نثر میں انشائیہ مضمون کے زیادہ قریب ہے۔ مضمون کی فضا رسمی ہوتی ہے جہاں ہر بات ہر جملہ اور ہر پیراگراف مرکزی خیال کی منطقی وضاحت کرتا ہے۔ جب کہ انشائیہ غیر رسمی ماحول میں لکھا جاتا ہے۔ اس میں محض تاثرات ہوتے ہیں جو ذہنی ترنگ کے طابع ہوتے ہیں۔ مضمون میں موضوع پر سنجیدگی سے بحث ہوتی ہے اس میں

صراحت اور وضاحت کی بنیاد دلائل پر ہوئی ہے جب کہ انشائیہ میں داخلیت کی کارفرمائی ملتی ہے۔ ایجاز و اختصار اور رمز و اشاریت انشائیہ کا حسن اور حقائق کا اظہار، موضوع کی طرف شخصی ردعمل اور عدم تکمیل انشائیہ کے فنی اجزا ہیں۔ مضمون یا مقالے میں بات کو عالمانہ انداز سے کہنے اور معلومات فراہم کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ اس میں زیادہ تر علم و حکمت کی باتیں ہوتی ہیں۔ انشائیہ میں انداز بیان پر زیادہ زور ہوتا ہے۔ مضمون کے موضوعات محدود ہوتے ہیں جبکہ انشائیہ میں کسی بھی موضوع پر قلم اٹھایا جاسکتا ہے۔ انشائیہ نگار اپنی تحریر میں اپنی ذات کا انکشاف کرتا ہے۔ اس کی تحریر میں داخلی کیفیات کا بیان ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مضمون میں خارجی باتوں کا ذکر ہوتا ہے۔ انشائیہ میں مصنف اپنے تجربات اور مشاہدات پیش کرتا ہے جن کا مقصد اصلاح یا اپنے مشن کی تبلیغ کرنا نہیں ہوتا۔

انشائیہ میں جو نتیجہ اخذ کیا جائے، جو تاثر پیدا کیا جائے اس سے ہم انشائیہ نگار کی ذات کے حوالے سے دیکھیں تو وہ ایک زندہ تجربہ و خیال نظر آئے گا ایک جیتے جاگتے انسان کی سوچ جو ایک انسان سے منسوب ہونے کے باوجود ایک انسان کی سوچ نہیں، نوع انسانی کی سوچ دیکھی دیے گی، ہر شخص اس سے اپنی ہی ذات کا اظہار سمجھے گا انشائیہ نگار کا ہر خیال قاری کو اپنا خیال معلوم ہوگا۔ اپنے دل کی بات، صرف اظہار کا انداز انشائیہ نگار کا منفرد ہوگا۔ انشائیہ کی زبان، اسلوب، انداز فکر، ہیئت اور اس کا فن ایسے عناصر ہیں جو انشائیہ کی مختلف بنیادی خصوصیات ہیں جس سے کسی بھی تحریر کے انشائیہ ہونے یا نہ ہونے کا علم ہوتا ہے۔ انشائیہ نگاری میں تخلیق کار کا منفرد نقطۂ نظر انتہائی اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور اسے انشائیہ کا بنیادی عنصر بھی کہا جاسکتا ہے۔ انشائیہ کی ایک خاص بات یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا کے کسی بھی موضوع پر تحریر کیا جاسکتا ہے۔ انشائیہ تخلیق کار کی ذاتی یا شخصی ادراک کا نمونہ ہوتا ہے اسی لیے فن کار موضوع کے کسی خاص زاویے کو روشن کر کے ایک نئی تصویر خلق کرتا ہے اور اس کی تکمیلیت کو بھی اپنے اوپر لازم نہ کر کے قاری کے ذمہ کر دیتا ہے۔ انشائیہ ایسی صنف ہے جس میں انشائیہ نگار سے شخصیت کی رنگارنگی، ہمہ جہتی، زبان و اسلوب پر قدرت اور زبردست قسم کی ہنرمندی کا مطالبہ کرتی ہے۔ وزیر آغا نے لکھا ہے کہ انشائیہ میں ان تمام تر خوبیوں کے علاوہ جس اہم خوبی کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس کا تخلیقی فن پارہ ہونا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''چونکہ انشائیہ تخلیقی سطح کی نثر پیش کرتا ہے جو علمی، تنقیدی، مزاحیہ اور طنزیہ نثر سے مزاجاً مختلف ہے، لہٰذا لفظ 'انشاء' ہی سے اس کا رشتہ جوڑنا مناسب ہے جو طرز تحریر کی تخلیقی سطح کی نشان دہی کرتا ہے''۔ (ڈاکٹر وزیر آغا، انشائیہ کے خدوخال، 1991، ص 33)

آزادانہ تفکر اور زندگی کے متعلق کسی انوکھے یا دلچسپ پہلو کے متعلق اظہار خیال کو بھی انشائیہ کی امتیازی خصوصیات میں شامل کیا گیا ہے

۔کیونکہ بہت سے ماہرین کا خیال ہے کہ دراصل انشائیہ فطرت انسانی کے کسی تاریک یا نیم تاریک گوشے کو منور کرنے کا نام ہے۔ بلاشبہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انشائیہ دراصل متنوع عناصر کے حسن توازن کے نتیجے میں وجود پذیر ہوتا ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی عنصر کی عدم موجودگی کے سبب انشائیہ کا وہ معیار نہیں ہوتا جو ہونا چاہیے۔ صنف انشائیہ کا اسلوب بھی انتہائی اہم ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''انشائیہ کے اسلوب میں جو لچک ملتی ہے اس کی بنا پر دیگر اصناف کے اسلوب سے بھی بقدرِ ظرف استفادہ کیا جاسکتا ہے لیکن سلیقہ اور احتیاط کے ساتھ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذرا سی بے احتیاطی یا فنّی چوک کے نتیجے میں انشائیہ کا اسلوب اس رس سے محروم ہو جائے گا جو اس کا جوہر سمجھا جاتا ہے اور جس کے بغیر انشائیہ محض ایک روکھا پھیکا نثر پارہ بن کر رہ جاتا ہے۔....لطافت، شگفتگی، حس لطیف، رمز و ایما، غیر رسمی انداز، خوش طبعی یہ سب کچھ اس کے اسلوب کے مختلف عناصر ہیں اور ان ہی کے فنکارانہ امتزاج سے انشائیہ کے مخصوص اسلوب کی تشکیل ہوتی ہے۔''

(ڈاکٹر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد،، 1986، ص245)

انشائیہ اردو کی ایک اہم صنف سخن ہے۔ اس صنف میں انشائیہ نگار بے تکلف و بے ساختہ لب و لہجے میں اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کو بیان کرتا ہے۔ اس میں مصنف کی شخصیت کی جلوہ گری ملتی ہے۔ انشائیہ نگاری کا کوئی خاص اصلاحی مقصد نہیں ہوتا۔ بلکہ انشائیہ نگار کا مقصد قاری کو مسرت بہم پہنچانا ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ ہر بات انتہائی پر لطف انداز میں بیان کرتا ہے۔ اس کا لہجہ نرم ہوتا ہے، اس کی باتوں میں تازگی، شگفتگی اور سلاست و روانی جیسی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ ایجاز و اختصار، بے ترتیبی و بے ربطی اور دلچسپ انداز بیان اور اظہار حقیقت اس کی بنیادی خصوصیات میں شامل ہیں۔ مزاح کے عناصر کی موجودگی انشائیے کے لطف میں اضافہ کرتی ہیں۔

2.3 سرگرمی:

1- انشائیہ کے فن کا بنیادی مقصد زبان و بیان میں تازگی کے ساتھ۔۔۔۔۔۔۔۔۔دینا ہے۔

2- غزل کی طرح انشائیہ بھی ایسی صنف ہے جس میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نہیں۔

3- مسرت بہم پہنچانا انشائیے کا۔۔۔۔۔۔۔۔ہے۔

4- انشائیہ میں فکر و خیال کی نئی نئی۔۔۔۔۔۔۔۔رہتی ہیں۔

5- انشائیہ میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

2.4 عمومی جائزہ:

انشائیہ غیر افسانوی اردو نثر کی اصناف میں سے ایک صنف ہے۔ انشائیہ کے فن کا بنیادی مقصد زبان و بیان میں نئی تازگی پیدا کرنا اور موضوع سے متعلق نئے تاثرات کو جنم دینا ہے۔ اس تازگی اور تاثر سے انسانی فکر، زندگی اور کائنات کے پر اسرار حقیقت سامنے آجاتے ہیں۔ انشائیہ کسی بھی موضوع پر فکری یا نیم فکری مواد کے ساتھ آزادانہ طور پر قلم بند کیا جا سکتا ہے، تاہم یہ خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ موضوع اور مواد کا تعلق نئے تناظر سے ہو اور اس میں تفہیم کی تازہ کاری سے نیا زاویہ بھی پیدا ہوتا کہ پیش کردہ موضوع میں انوکھا پن ظاہر ہو۔ انشائیہ کا اسلوب نہایت دلکش، تازہ اور شگفتہ ہوتا ہے۔ اس میں موضوعات کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اس لیے معمولی موضوع بھی غیر معمولی بن جاتا ہے۔ ظرافت کی فضا سازی سے اس کی دلکشی بڑھ جاتی ہے۔ جب کسی موضوع کو کسی نئے زاویے سے یا زاویہ بدل کر پیش کیا جاتا ہے تو اس میں نئی حقیقت دریافت ہوتی ہے۔ اس لیے نئی حقیقت کو دریافت کرنا ہی انشائیہ کے فن کی اصل غرض و غایت ہے۔ انشائیہ کے فن میں تین چیزیں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اول خیال، دوم معنی اور سوم بیان۔ ان تینوں کی ہم آہنگی سے ہی انشائیہ کا فن نمو پاتا ہے اور کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔

2.5 فرہنگ:

الفاظ	:	معنی
تفہیم	:	سمجھ میں آنا
غرض و غایت	:	مقصد و مدعا
ہم آہنگی	:	مطابقت
خارجیت	:	بیرونی طور پر ہونے والے احساسات
انکشاف ذات	:	اپنے اندرونی جذبات، خوبیوں اور خامیوں کا ادراک
مستحکم	:	جسے استحکام حاصل ہوا ہو
امکانات	:	ممکن ہونے کی صورت حال
منطقی	:	اصول اور فطری رویے کے مطابق، مدلل

عدم تکمیل : پورا نہ ہونے والا

مشاہدات : کسی دریافت کے لیے بغور دیکھنا، عینی تجربہ

بادی النظر : پہلی نظر میں، سرسری نظر سے

2.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات:

1- انشائیے کے فن پر روشنی ڈالیے۔

2- انشائیے میں زبان و بیان کی کیا اہمیت ہے؟

3- انشائیے کی تشکیل میں کن باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے؟

4- انشائیے کی اہم خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

2.7 مشقی سوالات:

1- انشائیہ کے فن میں کون کون سی چیزیں اہم قرار دی گئی ہیں؟

2- صنف انشائیہ کس اصناف نثر سے سب سے زیادہ قریب ہے؟

3- انشائیہ میں کس چیز کی سب سے زیادہ اہمیت ہے؟

4- انشائیے کے اسلوب کی تشکیل کن عناصر سے ہوتی ہے؟

5- انشائیہ نگار کو انشائیہ لکھتے ہوئے کس بات کا خیال رکھنا چاہیے؟

2.8 مشقی سوالات کے جوابات: جوابات سرگرمی

1- انشائیہ کے فن میں تین چیزیں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اول خیال، دوم معنی اور سوم بیان۔

2- اردو کی اصناف نثر میں انشائیہ مضمون کے زیادہ قریب ہے۔

3- انشائیہ میں لطافت اور شگفتگی بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے انشائیہ لکھتے ہوئے انشائیہ نگار موضوع کے انتخاب میں محتاط رہتا ہے

وہ ہر خیال کو انشائیہ میں شامل نہیں کرتا۔ وہ خیال کے حسن و نزاکت کی طرف نگاہ رکھتا ہے اور اپنے فن پارہ کے مجموعی حسن کو غارت نہیں کرتا۔

4- انشائیہ کے مخصوص اسلوب کی تشکیل لطافت، شگفتگی، حس لطیف، رمز و ایما، غیر رسمی انداز، خوش طبعی کے مختلف عناصر کے فنکارانہ امتزاج سے ہوتی ہے۔

5- انشائیہ نگار کو اس کا اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ اپنے انشائیہ کو خیالات سے بوجھل نہ بنادے کہ اس کا بوجھ مخاطب برداشت نہ کر سکے ورنہ اس کی حیثیت مضمون کی سی ہو جائے گی جس میں مختلف مسائل زیر بحث آتے ہیں اس کو یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ کس بات پر زور دیا جائے اور کسے یونہی رواروی میں بیان کر دیا جائے۔ انشائیہ نگا اپنی تخلیق میں منطق سے بھی گریز کرتا ہے اور اپنی بات کو دلیلوں سے ثابت نہیں کرتا بلکہ اسے اپنے ذاتی احساسات کے ذریعے دوسروں کو پہنچاتا ہے۔

1- نئے تاثرات کو جنم

2- وضاحت کی گنجائش

3- بنیادی کام

4- لہر موجزن

5- لطافت اور شگفتگی

2.9 امدادی کتب:

امدادی کُتب Books Prescribed.

۱۔ انتخاب اُردو نثر) ۱۹۲۰ء ۱۸۵۷ء ایجوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ۔

۲۔ انتخاب اُردو نثر ۱۹۲۰ء کے بعد ای جوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ

Books Recommended.

۱۔ مختصر تاریخ ادب اُردو۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین ترجمہ و اضافے ڈاکٹر سید محمد عقیل

۲۔	اُردو ادب میں طنز و مزاح۔	ڈاکٹر وزیر آغا
۳۔	اُردو ادب میں طنز و مزاح۔	غلام احمد فرقت کاکوروی
۴۔	رشید احمد صدیقی۔ شخصیت اور فن۔	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
۵۔	اُردو انشائیہ۔	وزیر آغا
۶۔	انشائیہ کے فنی سروکار۔	ڈاکٹر احمد امتیاز
۷۔	انشائیہ کی بنیاد۔	ڈاکٹر سلیم اختر
۸۔	فنِ انشائیہ اور انشائیے۔	ڈاکٹر فرحت شمیم
۹۔	انشائیہ کے خدوخال	وزیر آغا
۱۰۔	انشائیہ کی بنیاد	ڈاکٹر سلیم اختر
۱۱۔	انشائیہ اردو ادب میں	ڈاکٹر انور سدید
۱۲۔	انشائیہ	ڈاکٹر آدم شیخ

سبق ں نمبر 3۔اردو انشائیے کا آغاز وارتقا

ساخت

3.0 اغراض ومقاصد
3.1 تعارف
3.2 اردو انشائیے کا آغاز وارتقا
3.3 سرگرمی
3.4 عمومی جائزہ
3.5 فرہنگ
3.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات
3.7 مشقی سوالات
3.8 مشقی سوالات کے جوابات/جوابات سرگرمی
3.9 امدادی کتب

3.0 اغراض ومقاصد:

عزیز متعلم اس سبق کے مطالعے کے بعد اس قابل ہو جائیں گے کہ

انشائیہ کے ابتدائی دور سے واقف ہوں گے۔

انشائیہ کے عہد بہ عہد ارتقا سے واقف ہوں گے۔

انشائیہ نگاروں سے واقف ہوں گے۔

نمائندہ انشایئے سے واقف ہوں گے۔

اہم انشائیوں سے واقف ہوں گے۔

3.1 تعارف:

انشائیہ اردو ادب کی مقبول صنف ہے۔ یہ صنف اردو میں انگریزی ادب سے ہو کر آئی ہے۔ غیر افسانوی نثر میں اسے خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس صنف میں ادیب غیر رسمی طریقے سے خود کلامی کرتا ہے اور اس کے دل و دماغ میں اٹھنے والے خیالات کو خوبصورت لفظوں اور پیرایوں میں ڈھال کر صفحہ قرطاس پر بکھیر دیتا ہے۔ اس کا لہجہ نرم ہوتا ہے، اس کی باتوں میں تازگی شگفتگی اور سلاست و روانی جیسی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ ایجاز و اختصار، بے ترتیبی و بے ربطی اور دلچسپ انداز بیان اور اظہار حقیقت اس کی بنیادی خصوصیات میں شامل ہیں۔ اردو میں اس کا آغاز کب ہوا اور اس کا موجد کون ہے اس جیسے سوال برسوں سے ہوتے رہے ہیں البتہ زیادہ تر لوگوں نے سرسید کے یہاں اس کے واضح نقوش ملنے پر اتفاق کیا ہے۔ ان کی تحریروں 'بحث و تکرار' اور 'امید کی خوشی' کو انشائیہ کا ابتدائی نمونہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اردو میں انشائیہ نگاری کی ایک توانا روایت ملتی ہے جن میں محمد حسین آزاد، عبدالحلیم شرر، مہدی افادی، میر ناصر علی دہلوی، عبدالماجد دریابادی، خواجہ حسن نظامی، مرزا فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، کنھیا لال کپور، یوسف ناظم، شفیق الرحمٰن، وزیر آغا، مشتاق یوسفی، نظیر صدیقی مجتبیٰ حسین، احمد جمال پاشا اور نریندر لوتھر وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ان لوگوں نے مختلف ادوار میں صنف انشائیہ کی نمائندگی کی اور اردو ادب میں عمدہ انشائیوں کا ایک بیش قیمت سرمایہ چھوڑا۔ اس سبق میں ہم انشائیہ نگاری کے ابتدائی نقوش، انشائیہ نگاری کی روایت اور چند اہم انشائیہ نگاروں کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کریں گے۔

3.2 اردو انشایئے کا آغاز و ارتقا:

اُردو میں انشائیہ کی ابتدا کے بارے میں مختلف آرا ہیں۔ جاوید وششٹ نے ملا وجہی کو اردو میں انشائیہ نگاری کا موجد قرار دیا ہے۔ یہ کتاب سترھویں صدی میں لکھی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں ملا وجہی کے یہاں بعض تخلیقی محاسن اور انشائیہ کے بعض عناصر ملتے ہیں جن سے سب

رس کے بعض حصوں میں انشائیہ نگاری کی جھلک نمایاں ہوتی ہے مگر چونکہ وہ تحریر بنیادی طور ایک دوسری صنف داستان کا حصہ ہے اور وہ تحریر بھی فارسی زبان سے مستعار ہے اسی لیے بقول ڈاکٹر نورالسعید اختر سب رس کو انشائیہ قرار دینا دونوں اصناف کے ساتھ زیادتی ہے۔ بعض ماہرین نے خطوط غالب میں بھی انشائیہ کے نقوش تلاش کیے ہیں۔ جیسا کہ شبلی نعمانی نے بھی لکھا ہے کہ سرسید مرحوم جس اردو انشاء پردازی کے مجدد تھے اس کے بنیاد گزار مرزا غالب تھے۔ بلاشبہ غالب کے خطوط میں سادگی و پرکاری، ظرافت و مزاح، اچھوتے فکر و خیال، شخصی اظہار جیسی بعض اہم خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ محمد اسداللہ لکھتے ہیں:

> ''اردو نثر کے ابتدائی نمونوں میں رقعات غالب انشائی اظہار کا سب سے گہرا نقش ہیں۔ اس کا اصل سبب انشائیہ کے بنیادی محاسن مثلاً آزادانہ تفکر، شخصیت کا اظہار، زندگی اور کائنات کے مظاہر کو نئے انداز سے دیکھنے کی قوت اور سلیقہ نیز انشائیہ میں پایا جانے والا گفتگو کا غیر رسمی انداز جو گہری سے گہری اور بصیرت افروز بات کو علمی طمطراق سے پاک رکھ کر پیش کرتا ہے، غالب کے خطوط میں بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔''
>
> (انشائیہ کی روایت مشرق و مغرب کے تناظر میں، ص 138-137)

بلاشبہ غالب کے خطوط میں انشائیہ کی جھلک واضح اور نمایاں ہے۔ لیکن وہ مستقل انشائیہ کی ہیئت میں نہیں ہیں تاہم انشائی محاسن سے لبریز ہیں اور اسی سبب انشائیہ نگاری کی روایت میں ان خطوط کی اہمیت ہے۔ لیکن تقریباً اب اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اردو میں انشائیہ نگاری کا آغاز انگریزی زبان کے زیر اثر ہوا۔ اور بطور صنف واضح طور پر اس کی علاحدہ شناخت بعد میں قائم ہوئی اور انشائیہ نگاری کی واضح شکل عہد سرسید میں منظر عام پر آئی۔ سرسید اور ان کے رفقا کے علاوہ اس وقت کے کئی اہم ادیبوں نے اس صنف کو مضبوط بنیادیں عطا کیں۔ سرسید کے جن مضامین میں انشائیہ کے عناصر ملتے ہیں ان میں 'امید کی خوشی' اور 'بحث و تکرار' شامل ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد کے یہاں بھی انشائیہ نگاری کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ 'نیرنگ خیال' میں شامل ان کے مضامین میں انشائی ادب کی خصوصیات ملتی ہیں۔ دراصل ان کا اسلوب بھی اس صنف کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ انھوں نے انگریزی انشائیہ نگاروں سے روشنی لے کر اپنے طبعی میلان اور تخلیقی جوہر کے سہارے وہ تحریریں پیش کی ہیں جن کا تذکرہ اردو میں انشائیہ کی روایت میں لازمی ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ محمد حسین آزاد کو تخلیقی سطح پر پہلا انشائیہ نگار تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ خواجہ الطاف حسین حالی، نواب محسن الملک اور مولوی نذیر احمد کی بعض تحریروں میں بھی انشائیہ کی فضا ملتی ہے مگر یہ شکل بہت واضح نہیں ہے۔ سرسید کے رفقا میں مولوی ذکاء اللہ کے مضامین میں انشائیے کا رنگ غالب ہے۔ انھوں نے انگریزی انشائیوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ شگفتگی اور

ندرت خیال ان کے مضامین کو انشائیہ سے قریب کرتا ہے۔عبدالحلیم شرر، مولوی وحیدالدین سلیم اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کی بعض تحریروں میں انشائی کیفیت ملتی ہے۔بعض ماہرین نے سرشار کو ان کے مضامین 'بنی نوع انسان' اور 'عشق' کی بنیاد پر انشائیہ نگاروں کی صف میں شامل کیا ہے۔

بیسویں صدی میں انشائیہ نگاری کو فکر وفن کی سطح پر وسعت حاصل ہوئی۔انشائیہ اردو کی دیگر اصناف کی حدود سے نکل اپنی الگ پہچان بنانے لگا۔اس نے مضمون کی سنجیدگی، ترتیب وتسلسل اور جامعیت کو پیچھے چھوڑ کر بے ترتیب اور بے تکلف گفتگو کے انداز کو قبول کیا اور انشائیہ نگاروں نے اپنے ذاتی تجربات ومشاہدات کو نہایت دلچسپ، ہلکے پھلکے اور انتہائی شگفتہ اسلوب میں پیش کرنا شروع کر دیا جسے بعد میں ماہرین نے انشائیہ کے بنیادی عناصر میں شمار بھی کیا۔کیونکہ انشائیہ کو گہری علمیت، قواعد وضوابط اور سنجیدگی سے کوئی خاص علاقہ نہیں ہے۔اس کا تو مقصد ہی ہوتا ہے قاری کو ذہنی تلذذ اور لطف وانبساط سے ہم کنار کرنا۔یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اردو میں انشائیہ لکھنے والے ایسے بھی ہیں جن کے انشائیوں میں کہیں مضمون نگاری اور کہیں طنز ومزاح نگاری کے عناصر پائے جاتے ہیں۔اسی لیے ایسا بھی ہوا کہ بعض انشائیہ نگار کہیں مضمون نگار کی حیثیت سے تو کہیں طنز ومزاح نگار کی حیثیت سے معروف ہیں۔

ملا وجہی سے لے کر سرسید اور ان کے معاصرین کی تحریروں میں انشائیہ کے جو نقوش تھے ان کی ایک حد واضح شکل میر ناصر علی دہلوی کے یہاں نظر آتی ہے۔بیسویں صدی کے اوائل میں انھوں نے جو مضامین تحریر کیے ان میں جذبات کے متوازن بہاؤ اور ندرت افکار کے سنگم پر شوخی اور شگفتگی کا ایسا حسین امتزاج ہے جو انشائیہ کے ساتھ مخصوص ہے۔سجاد حیدر یلدرم کو اردو انشائیہ کی روایت میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ان کے مضمون 'مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ' کو بہت سے ماہرین ادب نے اردو میں انشائیہ کا نقطۂ آغاز قرار دیا ہے۔ان کے مضامین اور افسانوں کے مجموعہ 'خیالستان' میں شامل 'چڑیا چڑے کی کہانی'، 'حضرت دل کی سوانح عمری' اور 'مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ' میں تجربات ومشاہدات کی تصویر انتہائی دلکش ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر نے یلدرم کے انشائیوں کو ہیجانی انشائیے کا نام دیا ہے اور حسن کاری کو یلدرم کے انشائیوں کی خصوصیت قرار دیا ہے۔مہدی افادی اپنے وقت کے بڑے انشاپردازوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ان کی تحریروں خصوصاً خطوط میں بھی انشائیے کی فضا قائم ہے۔سجاد انصاری کے مجموعہ مضامین 'محشر خیال' میں اختصار، ندرت خیال اور فکری تنوع جیسی انشائیہ کی نمایاں خوبیاں پائی جاتی ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد اردو کے بڑے ادیب اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ان کے خطوط کے مجموعے غبار خاطر میں ایسے عناصر کی کارفرمائی ملتی ہے جن کا وجود انشائیہ کے لیے ضروری خیال کیا جاتا ہے 'غبار خاطر' جو بظاہر مکاتیب کا مجموعہ ہے، زبان وبیان اور وسعت نظر کے اعتبار سے اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ان کی تحریروں میں خطیبانہ جوش وہیجان نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔'غبار خاطر' کے بیشتر حصے انشائیہ نگاری کے اعلیٰ

نمونے قرار دیے جاسکتے ہیں۔اپنے خطوط میں وہ انتہائی بے تکلف نظر آتے ہیں۔زندگی کی پراسرار سنجیدگی کو بڑے دل کش انداز میں سمجھاتے ہیں اوراپنے طرز سے انکشاف ذات کا کام لیتے ہیں۔آزاد کا ردعمل شخصی ہے گو کہ انھوں نے باقاعدہ انشائیے نہیں لکھے لیکن غیر شعوری طور پر اس صنف کی طرف انھوں نے قدم بڑھائے۔'غبار خاطر' کے 'چڑیا چڑے کی کہانی' اور 'زندگی اور وجود' اردو انشائیے کے ضمن میں قابل ذکر ہیں۔

آصف علی کی تحریریں انشائے لطیف کی بہترین مثالوں میں سے ہیں۔پرچھائیں اور 'ارمغان آصف' کے مضامین پر ٹیگوریت کا غلبہ نظر آتا۔آتا ہے۔وہ بڑی پر تکلف نثر لکھتے ہیں جس میں تے ہیں جس میں جمال وکمال دونوں ہیں۔الفاظ کے استعمال میں سلیقہ مندی اور تشبیہ واستعاروں میں ندرت ملتی ہے۔وہ چھوٹے چھوٹے سنورے اور ترشے ہوئے بلیغ جملوں سے اپنی نثر کو شاعری کے قریب لے جاتے ہیں۔انھیں تخلیقی نثر لکھنے پر قدرت حاصل ہے۔رمزیت واشاریت، غیر رسمی انداز فکر، جزیات نگاری اور موضوع کی طرف شخصی ردعمل ان کے انشائیوں کے اوصاف ہیں۔کبھی کبھی وہ تمثیلی انداز بیان بھی تیار کر لیتے ہیں۔خلیق دہلوی کے یہاں انشائی کا معیاری روپ ملتا ہے۔وہ تخلیقی نثر لکھتے ہیں جن میں انکشاف ذات اور موضوع کی طرف شخصی ردعمل ہوتا ہے۔ان کے یہاں 'میں' کی لے بہت تیز ہے جو اظہار ذات کا پتہ دیتی ہے۔'ادبستان' کے بیشتر مضامین جیسے 'درۂ موت'، 'باسی ہار' اور 'مرا سفر' وغیرہ اردو انشائیہ نگاری میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔سید یوسف بخاری کی بیشتر تحریریں دہلی کے گرد گھومتی ہیں۔جن میں وہاں کے رسم ورواج، طور طریقے اور زندگی کے شب روز کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔(یہ دلی ہے)۔انھوں نے انشائیے بھی لکھے ہیں (بازگشت) جہاں موضوعات کو اپنی افتاد طبع سے دیکھا گیا ہے۔تجسس رمزیت، برجستگی اور بات میں بات پیدا کرنا ان کے انشائیوں کی خصوصیات ہیں (ادبی چور، دلی کی سادہ کاری وغیرہ۔اشرف صبوحی کے یہاں خالص دہلی کا لہجہ ملتا ہے۔انھوں نے اپنی تحریروں میں زیادہ تر دہلی کے مرقعے پیش کیے ہیں۔(دلی کی چند عجیب ہستیاں) تاہم ان کے اندر چھپا ہوا انشائیہ نگار خاموش نہیں بیٹھتا اور ان کے قلم سے 'مرزا چپاتی' جیسی تحریر لکھواتا ہے۔یہ بظاہر ایک خاکہ ہے لیکن اس میں انشائیہ کے محاسن موجود ہیں۔اشرف صبوحی چھوٹے چھوٹے جملے لکھتے ہیں جن میں برجستگی کے علاوہ فقرے کسنے کا فن چھپا ہوا ہے۔مزاج کی شوخی وظرافت کا مظاہرہ وہ کرداروں کے بیان میں کرتے ہیں، ان کی تحریروں میں حقیقت کے اظہار شخصی ردعمل، مسرت بہم پہنچانے کی صلاحیت اور زبان وبیان کے بانکپن میں چھپی ہوئی ہے۔خواجہ محمد شفیع بھی خالص دہلی والے ہیں اور شہر دہلی ہی کو انھوں نے اپنا موضوع بنایا ہے (دلی کی بولی) وہ اپنی تحریروں میں دہلی کی بامحاورہ زبان استعمال کرتے ہیں۔

محمد حسنین کے انشائیوں میں گہرے مشاہدے اور لطیف انداز بیان کا حسین امتزاج ملتا ہے۔وہ موضوع ہی کو نہیں بلکہ اپنے کردار کے

مختلف پہلوؤں کو انوکھے زاویوں سے قاری کے سامنے لاتے ہیں۔انھیں انشائیے کے مزاج کو سمجھنے اور اسے تخلیقی پیکر میں ڈھالنے کا سلیقہ آتا ہے۔اس اعتبار سے 'نشاط خاطر' کے انشائیے بہت خوب ہیں۔اس کے علاوہ وحیدالدین سلیم (دوستوں کی ایذا رسائی)،محمد اسمعیل (وقت سرمایہ ہے)،سجاد حسین (ہولی)،عبدالقادر (گھر سے نکل کے دیکھو) اور سلطان حیدر جوش (ہولی) وغیرہ کے انشائیے ہمارے اس جائزے میں قابل قبول بھی ہیں اور قابل ستائش بھی۔

انشائیہ نگاری کی روایت میں خواجہ حسن نظامی کو نمایاں مقام حاصل ہے۔خواجہ حسن نظامی سے اردو میں انشائیہ نگاری کو بہت تقویت ملی ہے۔خواجہ حسن نظامی کے انشائیے ان کی کتاب 'سی پارۂ دل' بہت اہم ہے۔خواجہ حسن نظامی نے اپنی تحریریں سماج کے عام طبقے کے لیے لکھیں اور اسی سبب انھوں نے اپنے ماحول،عہد اور معاشرے سے متعلق موضوعات کا انتخاب کیا۔ہر چھوٹی اور معمولی چیز کو موضوع بنایا اور اس کے سہارے کسی نہ کسی اخلاقی و روحانی نکتے کی ترویج کی۔سیاسی،سماجی،اخلاقی،فلسفیانہ موضوعات کے علاوہ انھوں نے مکھی،مچھر،الو،جھینگر جیسی خدائی مخلوقات پر بھی توجہ دی جن کی جانب کوئی توجہ نہیں دیتا۔ان حقیر اور ذلیل نیز معمولی سمجھی جانے والی مخلوقات کے ان گنت گوشوں کو اجاگر کر کے ان کو عزت و وقار بخشا اور انسانی زندگی کے لیے ان کی ضرورت سے لوگوں کو آشنا کیا۔انھوں نے ٹیلی فون،بجلی،لفٹ،ٹرین کی خطرے کی زنجیر،ٹرام،برقی تار،موٹر،قلم،بید،کھرپا،ہل،سلائی مشین،دیا سلائی،رندہ،آری،لحاف،چادر،آب خورہ،سوئی،کمان،خنجر،تلوار،ڈھال،پستول،بندوق اور فٹ وغیرہ جیسی چیزوں پر دلچسپ مضامین تحریر کیے۔خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں کی خوبی جہاں موضوعاتی سطح کا تنوع ہے وہیں ان کا منفرد اسلوب بیان بھی انتہائی خصوصیت کا حامل ہے۔انھوں نے اپنے انشائیوں میں سادہ،بے تکلف اور بے ساختہ زبان استعمال کی۔عربی و فارسی زدہ نثری اسلوب سے بچتے ہوئے خالص عام بول چال کی زبان استعمال کی۔انھوں نے بات چیت کے انداز میں نثر نگاری کی اور اپنے حلقۂ قارئین تک پہنچنے میں کامیاب بھی ہوئے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کا شمار اردو کے طنز و مزاح نگاروں اور خاکہ نگاروں میں ہوتا ہے۔مگر ان کے خاکوں میں ان کا جو اسلوب ہے وہ انشائیہ کے لیے زیادہ سازگار ہے اور اسی لیے ان کے خاکوں میں انشائیہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ان کے انشائیے بھی بہت مقبول ہوئے ہیں۔'ایک اور ایک چار'،'بیوی کی انا'،'خفسانہ'،'مردہ بدست زندہ'،'پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر'،'نئی دلّی'،'دام خیال'،'عشق کی گولیاں'،'پٹنا'،'میری بیوی'،'کل کا گھوڑا'،'ایک وصیت کی تعمیل'،'مہینے کی پہلی تاریخ' اور 'اونٹھ' جیسے انشائیے اس فن پر ان کی قدرت کے غماز ہیں۔ان کے انشائیوں میں مزاح کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ان کی شگفتہ مزاجی،زندہ دلی اور ظرافت کا نظارہ ان کی انشائی تحریروں میں جا بجا کیا جا سکتا ہے۔ان کی تحریریں شستہ،شگفتہ اور

پرلطف ہیں۔ان کا انداز بیان بے ساختہ، واضح ،لطیف اور دلفریب ہے۔انھوں نے دہلی کی بامحاورہ ٹکسالی زبان، روزمرہ اور محاورات کو انتہائی خوبصورتی سے کیا اور اپنے زورِ قلم سے معمولی سے معمولی موضوع زندہ و پائندہ کر دیا ہے۔ان کے انشائیوں میں ہمیں اخلاقی اور اصلاحی نکتے بآسانی دیکھنے کو مل جائیں گے۔ان کے انشائیوں میں زندگی کی تشریح وتعبیر ملتی ہے۔افکار کی ندرت اور طرز بیان کی جدت ان انشائیوں کا خصوصی پہلو ہے۔ڈاکٹر سیدہ جعفر نے مرزا کو اچھے انشائیہ نگاروں میں شمار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی تحریروں میں ایک متین ظرافت اور ایک سنجیدہ انبساط کا احساس ہوتا ہے۔

رشید احمد صدیقی اردو میں انشا پردازی اور طنز ومزاح نگاری کے میدان میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ان کی کتاب مضامین رشید، طنزیات ومضحکات، شیرازۂ خیال اور نقش ہائے رنگ رنگ وغیرہ میں شامل ان کے مضامین قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور انہیں پڑھتے ہوئے وہ دیر تک لطف اندوز ہوتا رہتا ہے۔دراصل ان کا اسلوب اس قدر پرکشش ہے کہ ان کی نثر بھی شاعری سا لطف دیتی ہے۔انھوں نے جو انشائیے تحریر کیے وہ اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ان کے نمائندہ انشائیوں میں چارپائی، ارہر کا کھیت، گواہ، مغالطہ، پاسبان، دھوبی، سرگزشت عہد گل، وکیل وغیرہ شامل ہیں۔بلاشبہ رشید احمد صدیقی نے جو انشائیے تحریر کیے ان کی اپنی خصوصیات وامتیازات ہیں جس کے سبب وہ ہمارے اہم ترین انشائیہ نگاروں میں شامل ہیں۔ان کی تحریروں کی سب سے اہم خوبی منفرد مزاح ہے۔وہ بڑی سے بڑی بات ہنستے کھیلتے کہہ جاتے ہیں۔اولاً تو قاری مسکراتا ہے مگر جب اس پر غور کرتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ کس قدر باریک نکتہ پیش کیا گیا ہے۔اسی لیے ہم دیکھتے ہیں ان کی تحریروں میں بہت سے فلسفیانہ افکار وخیالات انتہائی ہلکے پھلکے انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔

پطرس بخاری کا شمار اردو کے سرفہرست طنز ومزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کی کتاب 'پطرس کے مضامین' میں شامل زیادہ تر مضامین طنزیہ ومزاحیہ ہیں البتہ انشائی کیفیت کی موجودگی سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔کرشن چندر نے بھی کئی انشائیے تخلیق کیے انشائیہ نگاروں کی صف میں شامل ہے اور ان کے مضامین کا مجموعہ 'ہوائی قلعے' اس حوالے سے بطور نمونہ پیش کیا جاسکتا ہے۔ان کے انشائیوں میں آزادیِ فکر، تخیل آفرینی، ندرت خیال اور تنوع جیسے عناصر انشائیہ کا تار وپود تشکیل دیتے ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی اردو کے بڑے انشا پرداز ہیں اور مزاح نگاری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ان کی انہی مزاحیہ تحریریں میں انشائی کیفیت کے مظاہر بھی روشن ہوئے ہیں۔مجتبیٰ حسین اردو کے بڑے انشا پرداز ہیں اور مزاح نگاری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ان کی انہی مزاحیہ تحریریں میں انشائی کیفیت کے مظاہر بھی روشن ہوئے ہیں۔مجتبیٰ حسین کے یہاں انشائیہ ایک زیریں لہر کی طرح جاری ہے اور ذہن کی آزاد ترنگ کا نظارہ پیش

کرتی ہے۔

انشائیہ کے فن وروایت سے متعلق بنیادی کام کرنے والوں میں وزیر آغا کا نام شامل ہے۔ان کا شمار اردو کے بڑے انشائیہ نگاروں میں بھی ہوتا ہے۔خیال پارے، چوری سے یاری تک، دوسرا کنارہ اور سمندر اگر میرے اندر گرے ان کے انشائیوں کے چار مجموعے ہیں جو زیور طبع سے آراستہ ہوکر مقبول ہو چکے ہیں۔ان کے انشائیوں کا فکری تناظر وسیع ہے۔ان کے یہاں سنجیدہ فکری مسائل اور فلسفیانہ بالیدگی کا اظہار ملتا ہے۔اظہار ذات کے ساتھ ساتھ انکشافات کائنات کا عمل ان کے انشائیوں کی خاص پہچان ہے۔وہ اپنے آس پاس کے موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں اور قاری کو زندگی کے مسائل پر غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ان کے انشائیوں میں زبان و بیان کی خوبی، اسلوب کی ندرت اور تشبیہات و استعارات پر قدرت جیسی خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ان کے انشائیوں کو دلچسپ بناتی ہیں۔خلیل الرحمٰن اعظمی نے وزیر آغا کے پہلے مجموعے 'خیال پارے' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''انشائیہ نگاری کی بنیادی شرائط کو وزیر آغا نے اپنے مضامین میں برتنے کی کوشش کی ہے اور موضوعات اور طرز نگارش دونوں اعتبار سے ان کے یہاں انشائیہ کی روح ملتی ہے۔...وزیر آغا کے ان مضامین کو جوں جوں پڑھتے جایئے ان جانی بوجھی اور روزانہ کی دیکھی اور آزمائی ہوئی چیزوں کے بارے میں یہ احساس ہوگا جیسے ہم انھیں پہلی بار دیکھ رہے ہیں یا اس سے پہلے ہم نے انھیں اس زاویئے سے کیوں نہ دیکھا۔تازگی اور تازہ کاری کا یہ عنصر ان مضامین کا نمایاں وصف ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ....زندگی کے تنوع، رنگارنگی اور ایک شے کے دوسری شے سے ربط وتعلق کے بارے میں نئے نئے انکشافات سامنے آتے ہیں۔''

(خلیل الرحمٰن اعظمی، مضامین نو، 1977، ص 167)

وزیر آغا نے انشائیہ کو تمام تر فنی لطافتوں اور طبعی خصوصیات سے روشناس کرایا۔بعض ماہرین فن نے اردو میں انشائیہ نگاری کے باضابطہ آغاز کا سہرا وزیر آغا کے سر باندھا ہے۔انشائیہ نگاری کی روایت میں داؤد رہبر کا نام بھی شامل ہے ان کے انشائیہ 'لمحے' کو خوب سراہا گیا ہے۔غلام جیلانی اصغر کے مجموعے 'نرم دمِ گفتگو' میں مکان بنانا، وراثت، سوال اٹھانا، تسخیر کائنات وغیرہ جیسے اہم انشایئے شامل ہیں۔مشتاق قمر کی کتاب 'ہم ہیں مشتاق' شگفتہ اور فکر انگیز انشائیوں سے پر ہے۔انور سدید کی شخصیت کئی جہات کی حامل ہے البتہ 'ذکر اس پری وش کا' اور 'آسمان میں پتنگیں' ان کے انشائیوں کا مجموعہ ہیں۔جمیل آذر کا انشائیوں کا مجموعہ 'شاخ زیتون'، جاوید صدیقی کے انشایئے 'بے ترتیبی'، 'میں ایک فلسفی ہوں' اور 'میں تنہائی کا

شیدائی ہوں'، نظیر صدیقی کے انشائیوں کا مجموعہ 'شہرت کی خاطر'، مشکور حسین یاد کے انشائیوں کی کتاب 'جوہر اندیشہ'، سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں کے مجموعے 'سرگوشیاں' اور 'آمنا سامنا'، کامل القادری کے انشائیے 'فٹ نوٹ'، 'ہارڈ بیڈ'، 'سریش کا درخت' اور 'الگنی'، احمد جمال پاشا کے انشائیے 'ہجرت'، 'بے ترتیبی' اور 'بلیوں کے سلسلے میں' اور رام لعل نابھوی کے انشائیوں کا مجموعہ 'آم کے آم' اردو میں انشائیہ نگاری کی روایت کے امین ہیں۔

احمد جمال پاشا کا نام انشائیہ نگار کے طور پر بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید محمد حسنین نے احمد جمال پاشا کو انشائیوں کے نقش جدید میں 'ماتھے پر سرخ بندی' قرار دیا ہے اور ان کے انشائیوں کا اصلی اور دیرپا رنگ مزاح بتایا ہے۔ 'چیخنا'، 'کچھ تنقید کے بارے میں'، 'بور'، 'ہجرت'، 'بے ترتیبی'، 'شور'، 'اصولوں کی مخالفت میں'، 'چغلی کھانا'، 'تنہائی کی حمایت میں' اور کچھ بلّیوں کے سلسلے میں' وغیرہ ان کے مشہور انشائیے ہیں۔ ان کے کچھ مضامین بھی ہیں جن میں انشائیہ کے عناصر کی شمولیت ہے۔ 'نیا پیسہ'، 'مونچھیں'، 'ٹائم ٹیبل'، 'آنی جانی قیامت'، 'ناپسندیدہ لوگ' اور چند لمحے آل پن کے ساتھ' وغیرہ کا ذکر مضامین کے ضمن میں کیا جاتا ہے لیکن ان میں انشائیہ کی خصوصیات غالب ہیں۔ ان کے انشائیوں میں وہ تمام خصوصیات ملتی ہیں جو انشائیہ کو اعلیٰ اور معیاری فن پارہ بناتی ہیں۔ انھوں نے اپنے انشائیوں کے لیے روزمرہ اور آس پاس کی زندگی سے موضوعات منتخب کیے اور زندگی کے بظاہر تاریک یا نیم تاریک پہلوؤں پر توجہ مرکوز کی۔ ان کے انشائیوں میں زندگی کی رنگارنگی اور اسلوب کی تازگی وشگفتگی کے علاوہ خیالات کی بے ربطی، موضوعات کا تنوع، غیر منطقی ربط، عدم تکمیل، ایجاز واختصار اور انداز بیان کا جادو نمایاں نظر آتا ہے۔

مرزا محمود بیگ کی تحریروں میں انکشاف ذات اختصار، مسرت بہم پہنچانے کی صلاحیت انداز بیان میں بانکپن اور مرکزی باتوں سے کچھ ضمنی باتوں کا ذکر ملتا ہے۔ (بڑی حویلی)۔ ان خصوصیات کے علاوہ وہ معمولی باتوں کو اپنے انشائیوں کا موضوع بناتے ہیں۔ انھیں چھوٹے چھوٹے بامعنی جملے لکھنے کا فن آتا ہے۔ دہلی کی بامحاورہ زبان کے استعمال میں ان کے یہاں برجستگی ہے، شوخی وظرافت کو ساتھ لے کر وہ واقعات (یا آپ بیتی) بیان کرتے ہیں۔ سید عابد حسین نے روایتی انداز سے ہٹ کر انشائیے لکھے ہیں (بزم بے تکلف) انھوں نے بلیغ اشاروں کے ساتھ انکشاف کیا ہے۔ تحریروں میں طنز ومزاح کا بہترین امتزاج بھی ملتا ہے۔ موضوع کی طرف شخصی ردعمل، حقیقت کا اظہار اور دعوت فکر جیسے انشائیوں کے فنی محاسن ان کے یہاں دیکھے جاسکتے ہیں۔ مکالموں کے استعمال سے ان کی تحریروں میں ڈرامائی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔

جاوید وشسٹ انشائیے کے مزاج سے بخوبی واقف ہیں۔ انھیں موضوع کو فنی معنویت کے ساتھ پیش کرنے کا نہ صرف فن آتا ہے بلکہ اپنے مخصوص انداز میں وہ تلخ حقائق کا پردہ چاک کرتے ہیں۔ اردو نثر میں ان کا اپنا لہجہ ہے جس میں شوخی بھی ہے اور گرمی بھی۔ انھیں زبان وبیان پر قدرت حاصل ہے۔ معمولی سی معمولی بات قلم کی زد میں آکر بڑی اہم بن جاتی ہے۔ حقیقت کا اظہار شخصی ردعمل، غیر منطقی ربط، اشاریت وغیر منطقی

ربط، اشاریت ورمزیت اور ایجاز واخت واختصار ان کی 'انشائیہ پچیسی' کی مجموعی خصوصیات ہیں۔ جوگندر پال بنیادی طور طور پر فکشن کے آدمی ہیں۔ انھوں نے بہت کم انشائیے لکھے ہیں جن میں داخلیت کا اظہار اور شخصی ردعمل ملتا ہے۔ وہ زندگی کے حقائق اور اس کے اندر چھپی ہوئی طبیعتوں کو اپنے مخصوص لہجہ میں بیان کرتے ہیں جو بے حد گرم اور نرم ہے اور پر اسرار بھی۔ جوگندر پال کی پر اسرار معصومیت اور بلیغ رمزیت ان کے فن کو منفرد بناتی ہے۔ عصر حاضر کی حیثیت اور اس کی دکھتی رگوں پر انھیں انگلیاں رکھنے کا فن آتا ہے۔ ذہنی ترنگ میں آکر کبھی کبھی بڑے پتے کی بات کہہ جانا ان کے انشائیوں کی ایک اہم خوبی ہے۔ محمد حسن نے بہت کم اور بہت پہلے چند انشائیے لکھے تھے جن کی چمک دمک آج بھی محفوظ ہے لیکن ان کے اندر کا چھپا ہوا انشائیہ نگار 'عصری ادب کے آڑے ترچھے آئینے' میں گاہے بگاہے دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ ان کی تحریروں میں جذباتی انداز بیان، موضوع کی طرف شخصی ردعمل اور چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے جملے اپنی تمام معنویت کے ساتھ آتے ہیں۔ وہ موضوع کو داخلیت کے آئینہ میں دیکھتے ہیں اور غیر رسمی انداز میں بعض اوقات اس پر خطرناک حد تک سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ ان کا انداز فکر فلسفیانہ ہے۔ بے ساختگی، جزیات نگاری اور بات سے بات پیدا کرنا بھی ان کی تخلیقی کاوشوں کی خصوصیات ہیں۔ فرقت کاکوروی کا میدان مزاح ہے جہاں وہ طنز کے نشتر بھی چلاتے ہیں۔ انھیں اپنا مذاق اڑنے اور سماج کی کمزوریوں پر ہنسنے کا فن آتا ہے۔ زندگی کے تلخ حقائق کو پیش کرنے کے لیے وہ مزاح کی بیساکھیاں استعمال کرتے ہیں۔ اظہار ذات شخص مردعمل اور زور بیان کی شکل میں ان کی تحریروں میں انشائیے کے ٹکڑے جگہ جگہ بکھرے نظر آتے ہیں۔ وہ واقعات لفظوں کے الٹ پھیر اور تضاد کی مدد سے مزاح پیدا کرتے اور اشعار میں مرضی کے مطابق ردوبدل کر کے ان کی معنویت کو اپنی تحریر کا جزو بنا لیتے ہیں۔

بلاشبہ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اردو انشائیہ کو کسی نہ کسی طرح اردو روایت کا حصہ بنائے رکھا اور ملا وجہی سے لے کر مجتبیٰ حسین تک اردو انشائیہ ادب میں ایک سیال کی طرح سفر کرتا رہا۔ اس سفر میں کئی پڑاؤ ایسے آئے جہاں اس کے نقوش واضح ہو کر سامنے آئے اور بہت سے مقامات سے وہ ایک ہلکی لہر کی صورت گزرتا رہا۔ چار صدیوں پر محیط یہ سفر جب موجودہ عہد میں پہنچا تو کئی بڑے ادیبوں نے اسے سہارا دیا۔ ان انشائیہ نگاروں میں وزیر آغا، داؤد رہبر، غلام جیلانی اصغر، مشتاق قمر، انور سدید، جاوید صدیقی، نظیر صدیقی، مشکور حسین یاد، احمد جمال پاشا محمد اسد اللہ وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ بلاشبہ انشائیہ نگاروں کی فہرست میں اور بھی کئی بڑے نام شامل ہیں۔ البتہ یہاں چند ہی کا ذکر کیا گیا ہے۔

3.3 سرگرمی:

خالی جگہیں پر کیجیے۔

1. انشائیہ کی ابتدا۔۔۔۔۔۔۔۔میں مختلف نوعیت کے مضامین سے ہوئی۔
2. فرحت اللہ بیگ نے اردو کے نثری اسلوب میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کو فروغ دیا۔
3. خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں میں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ملتی ہے۔
4. رشید احمد صدیقی اردو میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔کے میدان میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔
5. اردو میں انشائیہ نگاری کی ابتدا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کے زیر اثر ہوئی۔

3.4 عمومی جائزہ

انشائیہ ایک قدیم صنف سخن ہے۔بیسویں صدی میں انشائیہ نگاری کو فکر وفن کی سطح پر وسعت حاصل ہوئی اور اردو انشائیہ کی دیگر اصناف کی حدود سے نکل کر اپنی الگ پہچان بنانے لگا۔اس نے مضمون کی سنجیدگی ،ترتیب وتسلسل اور جامعیت کو پیچھے چھوڑ کر بے ترتیب اور بے تکلف گفتگو کے انداز کو قبول کیا اور انشائیہ نگاروں نے اپنے ذاتی تجربات ومشاہدات کو نہایت دلچسپ، ہلکے پھلکے اور انتہائی شگفتہ اسلوب میں پیش کرنا شروع کر دیا جسے بعد میں ماہرین نے انشائیہ کے بنیادی عناصر میں شمار بھی کیا۔ بلاشبہ ملا وجہی سے لے لے مولانا محمد حسین آزاد تک اردو انشائیہ کے نقوش کہیں واضح تو کہیں مبہم طور پر ملتے ہیں البتہ آزاد کی کتاب 'نیرنگ خیال' کو انشائیہ نگاری کی روایت میں کافی اہمیت حاصل ہے۔اس کتاب میں شامل انشائیے گرچہ انگریزی سے ترجمہ تھے مگر آزاد کے اسلوب کی نیرنگی نے انہیں اپنا بنالیا تھا اور ان میں انشائیہ کی خصوصیات نمایاں نظر آتی ہیں۔سرسید اور ان کے عہد کو اردو نثر کے لیے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔اس عہد کو انشائیہ کی روایت میں بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بہت سے ماہرین فن کا خیال ہے کہ سرسید کے مضامین سے ہی انشائیہ کی باضابطہ شروعات ہوئی ہے۔اس روایت میں عبدالماجد دریابادی، خواجہ حسن نظامی، مرزا فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، کنھیا لال کپور، یوسف ناظم، شفیق الرحمٰن، وزیر آغا، مشتاق یوسفی، نظیر صدیقی، مجتبیٰ حسین، احمد جمال پاشا وغیرہ کے علاوہ بہت سے اہم انشائیہ نگار شامل ہیں جنھوں نے اردو ادب کے دامن بہترین انشائیوں بھر دیے ہیں۔

3.5 فرہنگ:

الفاظ	:	معنی
صفحۂ قرطاش	:	کاغذ کا صفحہ
نقوش	:	نشانات
غیر رسمی	:	مروجہ روایت کے برعکس
مستعار	:	مانگا ہوا
امتزاج	:	دو یا زیادہ چیزوں کی آمیزش، اختلاط
ہیجانی	:	اضطرابی، جذباتی
محیط	:	حاطہ کرنے والا، گھیرے ہوئے
بالیدگی	:	نشوونما، پھولنے بڑھنے کا عمل
مبہم	:	وہ بات جس کا مطلب صاف نہ ہو

3.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات:

1۔ اردو انشائیے کے ابتدائی دور پر روشنی ڈالیے۔

2۔ اردو انشائیے کے ارتقا پر روشنی ڈالیے۔

3۔ اردو انشائیہ نگاروں کی انشائیہ نگاری پر اظہار خیال کیجیے۔

3.7 مشقی سوالات:

1۔ جاوید وشسٹ نے انشائیہ نگاری کا موجد کسے قرار دیا ہے؟

2۔ اردو میں انشائیہ نگاری کا آغاز کس کے زیر اثر ہوا؟

3۔ نیرنگ خیال کس کی تصنیف ہے؟

4۔ ارہر کا کھیت کس کا انشائیہ ہے؟

5۔ 'انشائیہ پچیسی' کس کی تصنیف ہے؟

3.8 مشقی سوالات کے جوابات جوابات سرگرمی:

1۔ جاوید وشسٹ نے ملا وجہی کو اردو میں انشائیہ نگاری کا موجد قرار دیا ہے۔

2۔ اردو میں انشائیہ نگاری کا آغاز انگریزی زبان کے زیر اثر ہوا۔

3۔ نیرنگ خیال مولانا محمد حسین کی تصنیف ہے۔

4۔ ارہر کا کھیت رشید احمد صدیقی کا انشائیہ ہے۔

5۔ 'انشائیہ پچیسی' جاوید وشسٹ کی تصنیف ہے۔

1۔ عہد سرسید

2۔ خوش طبعی

3۔ باریک بینی، مشاہدات کی گہرائی اور تجربات کی وسعت

4۔ انشا پردازی اور طنز و مزاح نگاری

5۔ انگریزی ادب

3.9 امدادی کتب:

امدادی کُتب Books Prescribed.

ا۔ انتخاب اُردو نثر) ۱۸۵۷ء ۱۹۲۰ء ایجوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ۔

۲۔ انتخاب اُردو نثر ۱۹۲۰ء کے بعد ای جوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ

Books Recommended.

۱۔	مختصر تاریخ ادب اُردو۔ڈاکٹر سید اعجاز حسین ترجمہ واضافے	ڈاکٹر سید محمد عقیل
۲۔	اُردو ادب میں طنز و مزاح۔	ڈاکٹر وزیر آغا
۳۔	اُردو ادب میں طنز و مزاح۔	غلام احمد فرقت کاکوروی
۴۔	رشید احمد صدیقی۔شخصیت اور فن۔	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
۵۔	اُردو انشائیہ۔	وزیر آغا
۶۔	انشائیہ کے فنی سروکار۔	ڈاکٹر احمد امتیاز
۷۔	انشائیہ کی بنیاد۔	ڈاکٹر سلیم اختر
۸۔	فنِ انشائیہ اور انشائیے۔	ڈاکٹر فرحت شمیم
۹۔	انشائیہ کے خدوخال	وزیر آغا
۱۰۔	انشائیہ کی بنیاد	ڈاکٹر سلیم اختر
۱۱۔	انشائیہ اردو ادب میں	ڈاکٹر انور سدید
۱۲۔	انشائیہ	ڈاکٹر آدم شیخ

سبق نمبر ۔4 اردو انشائیہ کے ارتقا میں انشائیہ نگاروں کی خدمات

ساخت

4.0 اغراض ومقاصد

4.1 تعارف

4.2 اردو انشائیہ کے ارتقا میں انشائیہ نگاروں کی خدمات

4.2.1 سرسید احمد خاں

4.2.2 مولوی ذکا اللہ

4.3.1 مولوی نذیر احمد

4.3.2 عبدالحلیم شرر

4.3.3 خواجہ حسن نظامی

4.4.3 سرگرمی

4.4 عمومی جائزہ

4.5 فرہنگ

4.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

4.7 مشقی سوالات

4.8 مشقی سوالات کے جوابات/جوابات سرگرمی

4.9 امدادی کتب

4.0 اغراض ومقاصد:

عزیز متعلم اس سبق کے مطالعے کے بعد اس قابل ہو جائیں گے کہ

اردو کے اہم انشائیہ نگاروں کی انشائیہ نگاری کے سے واقف ہوں گے۔

سرسید احمد خاں انشائیہ نگاری سے واقف ہوں گے۔

مولوی ذکا اللہ کی انشائیہ نگاری سے واقف ہوں گے۔

مولوی نذیر احمد کی انشائیہ نگاری سے واقف ہوں گے۔

عبدالحلیم شرر کی انشائیہ نگاری سے واقف ہوں گے۔

خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری سے واقف ہوں گے۔

4.1 تعارف:

اردو انشائیہ کے فروغ میں مختلف انشائیہ نگاروں نے غیر معمولی خدمات انجام دیں ہیں۔ان انشائیہ نگاروں کی طرز فکر اور طرز اظہار میں بڑی رنگا رنگی ہے۔ان انشائیہ نگاروں نے مختلف موضوعات اور اسالیب سے اردو انشائیہ کا دامن وسیع طر کیا۔اُردو کے اہم انشائیہ نگاروں میں سرسید احمد خاں،مولوی ذکا اللہ،مولوی نذیر احمد،عبدالحلیم شرر،خواجہ حسن نظامی، رشید احمد صدیقی ، احمد شاہ پطرس بخاری،مشتاق احمد یوسفی ، انجم مانپوری، کنہیالال کپور،احمد جمال پاشا اور مجتبیٰ حسین کے نام بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ان تمام انشائیہ نگاروں نے انشائیہ نگاری کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ان انشائیہ نگاروں میں چند کی انشائیہ نگاری پر مختصرا گفتگو کی جائے گی۔

4.2 اردو انشائیہ کے ارتقا میں انشائیہ نگاروں کی خدمات:

پچھلے سبق میں اردو انشائیہ کے ارتقا میں انشائیہ نگاروں کی خدمات کا جائز پیش کیا جا چکا ہے۔اس سبق میں سرسید احمد خاں،مولوی ذکا اللہ،مولوی نذیر احمد،عبدالحلیم شرر اور خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری کا جائزہ لیا جائے گا۔

4.2.1 سرسید احمدخاں کی انشائیہ نگاری:

سرسید بنیادی طور پر مصلح قوم تھے انہوں نے قوم کی اصلاح وترقی کے لئے مختلف کوششیں کیں اور ہر وہ طریقہ اختیار کیا جس سے قوم کی تقدیر کا ستارہ بلند ہوسکتا تھا،مختلف اداروں کا قیام اسی سلسلہ کی اہم کڑیاں ہیں۔انہوں نے اصناف ادب کے ذریعہ بھی قوم کی ترقی کا خواب شرمندۂ تعبیر کرنا چاہا اور نثر میں سادگی متانت اور استدلال کے ذریعہ قوم کی خامیوں کو درست کیا اور اسی کے ساتھ ساتھ اردو نثر کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔سرسید نے دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے طرز زندگی کو دیکھا ان کی ترقی کے اسباب وعلل پر غور کیا اور امت مسلمہ کو ترقی یافتہ قوموں کا طریقہ اختیار کرنے کی دعوت دی اسی مقصد کے پیش نظر لندن کا سفر کیا وہاں کی تہذیب وثقافت سے متأثر ہوئے اسی تہذیب اور طرز زندگی کو رائج کرنے کے لئے انہوں نے 1870 میں تہذیب الاخلاق جاری کیا اس رسالے کے ذریعہ قوم کی خامیاں اور کوتاہیاں بیان کیں ان کی اصلاح وترقی کے نسخے تجویز کئے۔تہذیب الاخلاق میں شائع شدہ سرسید کے مضامین پیغام اور نثر دونوں اعتبار سے انفرادیت اور اہمیت کے حامل ہیں۔انہیں اردو نثر کی تجدید کا آغاز سمجھا جاسکتا ہے انھی مضامین میں سے ایک قابل ذکر تعداد انشائیوں کی حیثیت سے شہرت حاصل کرچکی ہے۔

سرسید کے انشائیوں کا بنیادی وصف مقصدیت ہے۔انہوں نے تفریح طبع اور اپنے تجربات واحساسات کو بیان کرنے کے لئے انشائیہ تخلیق نہیں کیا بلکہ ان کا مقصد سماج ومعاشرہ کی تعمیر اور ترقی تھا انہوں نے اپنے انشائیوں میں معاشرے کو مہذب بنانے کے طریقے کا ذکر کیا اور معاشرہ کے ہر فرد کی اصلاح ودرستی کی جانب توجہ مرکوز کی اور اپنے انشائیوں میں اخلاق وکردار کی بلندی کو پیش نظر رکھا،اخلاق کی خامیاں اور ان کے نقصانات بیان کئے اور ان سے بچنے کی تاکید کی مثلاً ان کا انشائیہ بحث وتکرار اسی رنگ میں ہے،اس انشائیہ میں انہوں نے بحث وتکرار کی قباحت کو تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے، بحث وتکرار کے نقصانات اور اسباب علل پر روشنی ڈالی ہے۔سرسید نے اس حقیقت کو بھی بیان کیا ہے کہ اختلاف رائے ناگذیر ہے تمام لوگوں کی رائے ایک ہونا ممکن نہیں ہے اختلاف رائے کے وقت اپنی رائے ظاہر کرنے کا درست طریقہ کا ذکر کیا ہے اور کتوں کی طرح بحث کرنے سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے، بحث وتکرار کی خامیاں اور بحث وتکرار کے درست طریقے ذکر کئے ہیں۔خوشامد بھی سرسید کا ایک خوبصورت انشائیہ ہے۔اس انشائیہ میں انہوں نے خوشامد پسندی کے نقصانات اور خوشامد کو پسند کرنے کے اسباب کا تذکرہ کیا ہے۔ خوشامد پسندوں کو اپنی قابلیت اور صلاحیت میں ترقی کی نصیحت کی ہے اس سے ان کا معیار ومقام بلند ہوگا اور ان کی شخصیت کمالات کا مجموعہ بنے گی۔سرسید نے مثبت طریقے کی جانب رہنمائی کی ہے،اور جو شخص جس تعریف وتوصیف کا حقدار ہے اس کی تعریف وتوصیف اور اس کے کمالات کو بیان کرنے کے فوائد وثمرات ذکر کئے ہیں،تعریف کرنے والا اور جس شخص کی تعریف کی جارہی ہے،دونوں اس کے ثمرات سے فائدہ حاصل

کریں گے۔سرسید کے انشائیہ تعصب میں تعصب کے نقصانات بیان کئے گئے ہیں،تعصب انسانوں کومختلف شکلوں میں دھوکہ دیتا ہے اور تعصب میں انہیں ثواب نظر آنے لگتا ہے،اس انشائیہ میں تعصب کے مختلف رنگ اوران کے نقصانات بیان کئے گئے ہیں اور تعصب نہ کرنے کے فوائد وثمرات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔امید سرسید کا ایک طویل انشائیہ ہے اس انشائیہ میں سرسید نے امید کے فوائد وثمرات اور امید کا مذہبی رخ بھی بیان کیا ہے،ناامیدی اور مایوسی کے نقصانات کا تذکرہ کیا ہے،انسانوں کو امید کا دامن تھام کر آگے بڑھنے کی تلقین کی ہے۔مقصدیت سرسید کے انشائیوں کا نمایاں وصف ہے،ان کے تمام انشایئے کسی نہ کسی مقصد کے تحت لکھے گئے ہیں،جن میں فرد،معاشرے اور سماج کی اصلاح وترقی مرکزی مقصد ہے۔

سرسید کے انشائیوں میں بیانیہ رنگ بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ان کا انشائیہ گذرا ہوا زمانہ بیانیہ رنگ کی اہم مثال ہے،اس انشایئے میں سرسید نے ایک بوڑھے کا کردار تخلیق کیا ہے جو اپنی یادوں میں کھویا ہوا ہے،بچپن جوانی اور ادھیڑ عمر کے مراحل گزر جانے پر کف افسوس مل رہا ہے،زندگی کے آخری مراحل میں فکرمند ہے،ماں باپ بھائی بہن کے کرداروں کے ذریعہ ایک دلچسپ کہانی بننے کی کوشش کی ہے،اس انشائیہ میں بیانیہ اسلوب کے تمام تقاضے مکمل طور پر نظر آتے ہیں۔سرسید نے اس انشایئے میں انسان کو نیکی اور بھلائی کی تعلیم دی ہے،انسانوں کی خدمت اور بھلائی کو عظیم ترین نیکی گردانا ہے اور اس کو ایک خوبصورت دلہن سے تعبیر کیا ہے۔انشائیہ کا اختتام بہت ہی دلچسپ ہے،وہ انسان جو اپنی زندگی کے اختتام پر کف افسوس مل رہا تھا اچانک اس کی آنکھیں کھلتی ہیں اور اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بوڑھا نہیں ہوا ہے بڑھاپے کی کیفیت خواب تھی تو اس کی آنکھوں میں چمک آجاتی ہے،اور افسوس امید میں بدل جاتی ہے۔اس انشائیہ کا اختتام انسان کو غفلت سے بیدار کرنے کے لئے کافی ہے۔سرسید کے اس انشائیہ میں افسانوی رنگ اور ڈرامائی کیفیت پورے طور پر نظر آتی ہے۔سرسید کے بہت سے انشائیوں میں یہ رنگ موجود ہے۔بحث وتکرار میں بھی اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

سرسید کے انشائیوں کا ایک اہم پہلو سادگی اور سلاست ہے،انہوں نے آسان زبان اور سادہ انداز میں حقائق کو پیش کیا ہے عبارت کی رنگینی کو مرکز توجہ نہیں بنایا ہے،البتہ ان کے انشائیوں میں لطافت موجود ہے،نصیحت اور پیغام کے باوجود وہ ایک خشک مزاج واعظ کے وعظ معلوم نہیں ہوتا ہے بلکہ قاری کو متأثر کرتے ہیں اور تخلیق کے حسن سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرتے ہیں انشایئے پیغام سے بوجھل نہیں ہوتے ان کا حسن اور پیغام دونوں برقرار ہیں۔

سرسید نے اپنے انشائیوں میں استدلالی انداز اختیار کیا ہے اور ہر ایک بات کو عقل اور مذہب کی کسوٹی پر کسا ہے۔قارئین کے سامنے

زندگی سماج اور مذہب کے مختلف پہلوؤں کو اس طریقے سے پیش کیا ہے کہ وہ قاری کے ذہن کو اپیل کرتے ہیں اس کی سوچ اور فکر کے دھارے کو موڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان میں کوئی جملہ قاری کو منطقی اور استدلالی تقاضوں کی مخالفت کرتا ہوا معلوم نہیں ہوتا ہے۔

تمثیلی انداز بھی انشائیوں میں نظر آتا ہے۔سرسید نے تمثیلات کے ذریعہ انشائیوں کو دلچسپ اور مؤثر بنایا ہے اور پیغام کو قاری کی فہم سے قریب کرنے کی کوشش کی ہے۔سرسید کے انشائیوں میں سنجیدگی بخوبی نظر آتی ہے،ان کے انشائیوں کا مطالعہ شوخی اور ظرافت کی کمی احساس قلب پر طاری کرتا ہے چوں کہ ان یہاں مقصدیت کا غلبہ ہے اس لئے ان خامیوں کا ہونا قرین قیاس ہے،البتہ طنز کی دلکش کی مثالیں ان کے یہاں موجود ہیں اور ایسی خشکی بھی نہیں ہے جس ان کے انشائیہ علمی مضامین کی شکل اختیار کرلیں۔سرسید کے انشائیے اس صنف ادب کے ابتدائی نمونوں میں سے ہیں اس لیے ان کے یہاں معمولی خامیوں کا ہونا بعید از قیاس نہیں ہے۔سرسید نے اردو نثر کو ایک نئے اسلوب اور طرز ادا سے واقف کرایا،انشائیہ نگاری کی بنیاد ڈالی انشائیے کے تقاضوں کو بھی پورا کرنے کی کوشش کی اور پیغام کے ساتھ ساتھ انشائیے کا حسن برقرار رکھنے میں بھی کامیاب ہوئے،زبان کی سادگی اور بیان کے حسن نے سرسید کو مزید کامیاب اور مؤثر بنادیا ہے۔

4.2.2 مولوی ذکاءاللہ کی انشائیہ نگاری:

منشی ذکاءاللہ اردو کے ان ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے علمی،ادبی اور اصلاحی نثر کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ان کا بنیادی میدان ریاضی،تاریخ اور جغرافیہ تھا،لیکن ان کی ادبی شخصیت بھی خاصی ہمہ گیر تھی۔قدیم دہلی کالج کے علمی و ادبی ماحول نے ان کی ذہنی اور فکری تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ یہاں انہیں ماسٹر رام چندر،امام بخش صہبائی اور دیگر ہندوستانی وانگریز اساتذہ کی صحبت حاصل ہوئی۔اسی ماحول میں انہیں انگریزی زبان وادب اور مغربی علوم وافکار سے واقفیت حاصل ہوئی۔اس کے بعد سرسید احمد خاں کی تحریک سے وابستہ ہوکر انہوں نے اردو نثر کو جدید علمی،اخلاقی اور اصلاحی رجحانات سے ہم آہنگ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

مولوی ذکاءاللہ 20/ اپریل 1832 کو دہلی کے کوچہ بلاقی میں پیدا ہوئے۔والد کا نام ثناءاللہ تھا۔ان کے اجداد نے غزنی سے ہجرت کرکے ہندوستان میں سکونت اختیار کی تھی۔مولوی ذکاءاللہ کے خاندان کا شمار ان معزز خاندانوں میں ہوتا تھا جنھیں علم وفضل کی روایت ورثے میں حاصل تھی۔ چنانچہ ذکاءاللہ کی ابتدائی تربیت ایسے علمی ماحول میں ہوئی جس نے ان کے فطری رجحانات کو جلا بخشنے میں اہم کردار ادا کیا۔ابتدائی تعلیم کے بعد 1845ء میں ان کا داخلہ دہلی کالج میں ہوا۔دہلی کالج اس زمانے میں ہندوستان کی علمی زندگی کا ایک اہم مرکز تھا، جہاں

مشرقی علوم کے ساتھ جدید علوم کی تعلیم کا بھی اہتمام کیا جاتا تھا۔ دہلی کالج نے ذکاءاللہ کی ذہنی صلاحیتوں کے اظہار کے لئے بھرپور مواقع فراہم کیے۔ بچپن ہی سے ان میں ذہانت اور فطری ذکاوت کے آثار نمایاں تھے، تاہم دہلی کالج کے سازگار تعلیمی ماحول اور محمد حسین آزاد و ڈپٹی نذیر احمد جیسے ہم عصروں کی رفاقت نے ان کے علمی ذوق کو مزید جلا بخشی۔ وہ بہت جلد اپنی جماعت میں ممتاز ہو گئے اور اساتذہ وطلبہ دونوں کی نگاہ میں نمایاں مقام حاصل کر لیا یہاں تک کہ بہت جلد ان کا شمار رام چندر اور امام بخش صہبائی کے خاص تلامذہ میں ہونے لگا۔

ذکاءاللہ نے نثری تصانیف کے علاوہ اپنے عہد کے متعدد رسائل و جرائد میں بے شمار مضامین لکھے۔ ان کے مضامین کی مجموعی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان تحریروں کے مطالعے سے ان کی انشائیہ نگاری کے فنی محاسن کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ ان کے یہاں موضوعات کا غیر معمولی تنوع پایا جاتا ہے۔ وہ محض بڑے اور سنجیدہ موضوعات تک محدود نہیں رہتے بلکہ روزمرہ زندگی کی بظاہر معمولی اور غیر اہم چیزوں میں بھی غور و فکر کے نئے امکانات تلاش کرتے ہیں۔ وہ کسی معمولی موضوع سے کوئی فکری، اخلاقی یا معاشرتی نکتہ تلاش کر لینا ان کی نمایاں خصوصیات ہے۔

مولوی ذکاءاللہ کے نزدیک ادب محض لفظی آرائش، رنگین بیانی اور عبارت آرائی کا نام نہیں بلکہ اس کے پس پست ایک سنجیدہ مقصد کا ہونا ضروری ہے۔ ان کا تصورِ ادب بنیادی طور پر افادی، اصلاحی اور اخلاقی تھا۔ وہ مضمون نگار کو معاشرے کی اصلاح کا ذمہ دار سمجھتے تھے اور اس بات کے قائل تھے کہ اچھی تحریر انسان کے خیالات، عادات اور کردار پر مثبت اثر ڈالنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اسی لیے ان کے مضامین میں انسانی اخلاق، تہذیب، معاشرتی رویوں اور زندگی کی بنیادی اقدار پر خاص توجہ ملتی ہے۔ وہ اپنے عہد کے سماجی اور اخلاقی مسائل سے پوری طرح باخبر تھے اور چاہتے تھے کہ ادب زندگی کے حقیقی مسائل سے وابستہ ہو۔ ان کا زمانہ ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی میں بڑی تبدیلیوں کا دور تھا۔ مغلیہ سلطنت کا زوال، برطانوی اقتدار کا فروغ، جاگیردارانہ نظام کی شکست وریخت، مغربی علوم وافکار کی آمد اور معاشرتی اقدار میں تبدیلیاں اس عہد کی اہم خصوصیات تھیں۔ ذکاءاللہ نے ان تبدیلیوں کو محسوس کیا اور اپنی تحریروں میں جدید علمی وتہذیبی رجحانات کی ضرورت پر زور دیا۔ وہ ادب کو فرسودہ موضوعات اور محض تخیلی دنیا تک محدود رکھنے کے مخالف تھے۔ ان کے نزدیک ایک زندہ ادب وہی ہے جو اپنے عہد کے مسائل اور تقاضوں سے آگاہ ہو اور معاشرے کی فکری رہنمائی کر سکے۔ اسی وجہ سے ان کی تحریروں میں سیاسی بصیرت، تہذیبی آگہی اور معاشرتی شعور بھی نمایاں نظر آتا ہے۔

مولوی ذکاءاللہ کی ایک اہم خصوصیت مشکل اور غیر مانوس عربی و فارسی الفاظ، پیچیدہ تراکیب اور مصنوعی عبارت آرائی سے گریز ہے۔ ان کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ وہ اپنے خیالات کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے مثالوں، واقعات، تشبیہات اور استعارات سے بھی کام لیتے ہیں۔

ذکا اللہ کی انشائیوں میں ''خوشی'' اور ''آگ'' کے مطالعے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ''خوشی'' میں وہ انسانی زندگی میں خوشی کے مختلف اسباب اور صورتوں پر گفتگو کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک خوشی صرف جسمانی لذت کا نام نہیں بلکہ اس کا تعلق انسانی خیالات، علم، اخلاق، مذہب اور انسانی ہمدردی سے بھی ہے۔ اس طرح ''خوشی'' ایک عام اور روزمرہ موضوع ان کے یہاں اخلاقی اور اصلاحی مضمون کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس انشائیہ کا بیان منطقی، صاف، سلیس اور مقصدی ہے۔

انشائیہ 'آگ'' میں ذکاء اللہ کی تخلیقی اور ادبی صلاحیت زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ انہوں نے آگ کو حرارت اور توانائی کے ایک ذریعے کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی، تہذیب، مذہب اور معاشرت سے وابستہ ایک ہمہ گیر مظہر کے طور پر پیش کیا ہے۔ آگ کبھی انسان کی دوست ہے اور کبھی دشمن۔ وہ اسے ایک طرف گھروں کو گرم رکھنے، روشنی و زندگی کی ضرورت پوری کرنے والی قوت کے طور پر دیکھتے ہیں اور دوسری طرف اس کی تباہ کن طاقت کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ دیہات میں الاؤ کے گرد بیٹھے لوگوں کی گفتگو، قصوں اور معاشرتی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے وہ آگ کو انسانی میل جول کی ایک علامت بنا دیتے ہیں۔ اس کے برعکس آگ کے بھڑکنے اور تباہی پھیلانے کے مناظر میں ان کی تخیل آفرینی اور منظر نگاری نمایاں ہوتی ہے۔ تشبیہ، استعارہ، تمثیل، شگفتگی اور ادبی زبان کے استعمال نے ''آگ'' کو خاص ادبی حسن عطا کیا ہے۔

ذکاء اللہ کی انشائیہ نگاری کا ایک اور اہم وصف ان کا علمی اور سائنسی شعور ہے۔ ریاضی، تاریخ، جغرافیہ اور سائنس جیسے علوم سے گہری واقفیت کے باعث ان کی تحریروں میں معلومات کا وسیع ذخیرہ موجود ہے۔ وہ محض معلومات فراہم کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ انہیں انسانی زندگی اور معاشرتی مسائل سے مربوط کرتے ہیں۔ سائنس کو محض خشک معلومات نہیں بلکہ کائنات اور انسانی زندگی کو سمجھنے کا ذریعہ ہے۔ غرض یہ کہ ذکاء اللہ کی انشائیہ نگاری اردو نثر کے ارتقائی دور کی ایک اہم کڑی ہے۔ انہوں نے ایسے زمانے انشائیہ نگاری کو فروغ دیا جب اردو نثر جدید علمی، اخلاقی، اصلاحی اور تہذیبی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو رہی تھی۔ ان کی انشائیہ نگاری میں ادبی حسن، عصری شعور، اصلاحی مقصد، سادگی بیان، فکری گہرائی اور تخیل نمایاں ہے۔ انہی خصوصیات کی بنا پر انہیں اردو کے اہم انشائیہ نگاروں میں نمایاں مقام حاصل ہے۔

4.3 مولوی نذیر احمد کی انشائیہ نگاری:

مولوی نذیر احمد سرسید کے رفقا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ نذیر احمد نے اپنی تحریروں کو معاشرتی اصلاح اور اخلاقی تربیت کا ذریعہ بنایا۔ ان کی تصانیف میں تعلیم و تربیت، اخلاقی اقدار، عملی زندگی کے مسائل اور معاشرتی رویوں کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے اسلوب کی نمایاں

خصوصیات میں مقصدیت، سادگی، برجستگی، محاورہ بندی، جزئیات نگاری، مشاہداتی قوت اور روزمرہ زندگی سے گہری وابستگی شامل ہیں۔ اگرچہ ڈپٹی نذیر احمد نے باقاعدہ طور پر انشائیے نہیں لکھے، تاہم ان کے مضامین، خطوط، لیکچروں اور دیگر نثری تحریروں میں انشائیہ نگاری کے عناصر نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

مولوی نذیر احمد کا عہد اردو نثر کی تشکیلِ نو اور ارتقا کا اہم زمانہ تھا۔ سید احمد خان کی تحریک نے اردو نثر کو جدید علمی، عقلی اور اصلاحی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی راہ ہموار کی۔ اس دور کے ادیبوں کو ایک طرف مغربی علوم اور جدید تعلیم کے بڑھتے ہوئے اثرات کا سامنا تھا اور دوسری طرف ہندوستانی معاشرے کی اصلاح، اخلاقی تربیت اور تہذیبی اقدار کے تحفظ کا مسئلہ درپیش تھا۔ نذیر احمد نے ان دونوں تقاضوں کے درمیان ایک متوازن راستہ اختیار کیا۔ ان کی تحریروں میں جدید تعلیم، اخلاقی تربیت اور معاشرتی اصلاح باہم مربوط نظر آتی ہیں اور یہی عناصر ان کے نثری اسلوب کو انفرادیت عطا کرتے ہیں۔

نذیر احمد کے انشائیوں کے موضوعات کا تعلق زیادہ تر زندگی کے عام معاملات سے ہے، لیکن انہی موضوعات کے ذریعے بڑے اخلاقی اور معاشرتی نتائج اخذ کرتے ہیں۔ ان کا مضمون ''وقت'' اس کی عمدہ مثال ہے۔ اس میں وقت کی قدر و قیمت واضح کرنے کے لیے وہ قاری کو اس کی روزمرہ زندگی کے معمولات میں لے جاتے ہیں۔ صبح بیدار ہونے سے لے کر رات کے سونے تک انسان کی مختلف مصروفیات کا نقشہ پیش کرتے ہوئے وہ یہ احساس دلاتے ہیں کہ کس طرح چھوٹی چھوٹی مشغولیات میں پورا دن گزر جاتا ہے اور انسان کو وقت کے گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ یوں ایک معمولی موضوع انسانی زندگی کے ایک بنیادی مسئلے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہی انداز انشائیہ کی بنیادی روح سے قریب ہے کہ مصنف کسی عام سی چیز یا روزمرہ کے تجربے کو نقطۂ آغاز بنا کر اس سے زندگی کے وسیع تر مفاہیم اخذ کرے۔ نذیر احمد کے یہاں اگرچہ اصلاحی مقصدیت غالب ہے، لیکن روزمرہ زندگی کے مشاہدے اور اس کی جزئیات کے باعث ان کی تحریروں میں انشائیہ کا سا لطف اور رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔

نذیر احمد کے اسلوب میں مکالماتی اور خطابی آہنگ نمایاں ہے۔ وہ اپنے خیالات کو محض یک طرفہ بیان کے ذریعے پیش نہیں کرتے، بلکہ بعض اوقات قاری کو براہِ راست مخاطب کر کے اسے گفتگو کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ اس طرزِ اظہار سے تحریر میں ایک طرح کی قربت اور بے تکلفی پیدا ہوتی ہے۔ قاری خود کو محض ایک غیر جانب دار پڑھنے والے کے بجائے مصنف کے سامنے موجود ایک مخاطب محسوس کرتا ہے۔ ان کے نزدیک قاری محض معلومات حاصل کرنے والا شخص نہیں بلکہ ایسا فرد ہے جس کے رویے اور طرزِ عمل میں مثبت تبدیلی پیدا ہونی چاہیے۔ اسی لیے ان کی نثر میں مخاطبت، تلقین اور ترغیب کے عناصر نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔

نذیر احمد کی نثر میں سادگی اور برجستگی ہے۔ ان کی زبان میں غیر ضروری تصنع، لفظی نمائش اور بے جا تکلف نہیں پایا جاتا۔ وہ اپنے خیالات کو زیادہ سے زیادہ واضح، موثر اور قابلِ فہم انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نثر میں بعض اوقات طویل جملے بھی آتے ہیں، لیکن معنوی ربط برقرار رہتا ہے اور قاری کے لیے مفہوم تک پہنچنا دشوار نہیں ہوتا۔ ان کی زبان بنیادی طور پر اردو روزمرہ اور محاورے سے تشکیل پاتی ہے۔ اگرچہ عربی و فارسی الفاظ اور تراکیب بھی ان کی نثر میں ملتی ہیں، تاہم ان کا استعمال اس انداز سے ہوا ہے کہ زبان کی فطری روانی متاثر نہیں ہوتی۔ محاوراتی انداز ان کی تحریر کو زندگی کے قریب لے آتا ہے اور علمی و اصلاحی مقصدیت کے باوجود نثر میں اجنبیت پیدا نہیں ہونے دیتا۔

نذیر احمد کی نثر میں شوخی اور ظرافت کا عنصر بھی موجود ہے۔ وہ انسانی کمزوریوں اور معاشرتی برائیوں پر محض براہِ راست تنقید نہیں کرتے بلکہ بعض مواقع پر انھیں ایسے انداز میں پیش کرتے ہیں کہ قاری مسکرانے کے ساتھ ساتھ اپنے طرزِ عمل پر غور کرنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ طنز و مزاح کی یہ آمیزش ان کی اصلاحی نثر کو خشک اور یک رنگ ہونے سے بچاتی ہے۔ ان کے یہاں مزاح محض تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ اصلاح کا وسیلہ ہے۔ وہ ہنسی کے پردے میں انسانی کمزوریوں کو نمایاں کرتے ہیں اور یوں قاری کو احساس دلائے بغیر اس کے رویوں پر نظرِ ثانی کی طرف مائل کرتے ہیں۔ یہ انداز ان کی نثر میں انشائیہ کے مزاج کو تقویت پہنچاتا ہے۔

تعلیم و تربیت نذیر احمد کی نثر کا بنیادی موضوع ہے، لیکن ان کی تحریریں محض نصیحتوں کا مجموعہ نہیں۔ وہ اخلاقی اصولوں کو عملی زندگی کے مشاہدات اور تجربات سے مربوط کر کے پیش کرتے ہیں۔ پیچیدہ اخلاقی تصورات کو روزمرہ زندگی کی قابلِ مشاہدہ صورتوں میں منتقل کرنا ان کے اسلوب کا اہم وصف ہے۔ ان کی تحریروں میں یہ احساس نمایاں ہے کہ ادب کا تعلق انسانی زندگی سے براہِ راست ہونا چاہیے۔ اسی لیے وہ اخلاق، تعلیم، وقت کی قدر، گھریلو زندگی، انسانی عادات اور معاشرتی رویوں جیسے موضوعات کو اختیار کرتے ہیں۔ ان موضوعات کے ذریعے وہ فرد کی اصلاح کے ساتھ ساتھ معاشرے کی مجموعی اصلاح کا تصور بھی پیش کرتے ہیں۔

نذیر احمد کی تحریروں میں جزئیات نگاری نمایاں ہے۔ وہ زندگی کے معمولی سے معمولی واقعات اور اعمال پر گہری نظر رکھتے ہیں اور ان کی تفصیل اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ قاری کے سامنے صورتِ حال کا ایک واضح نقشہ ابھر آتا ہے۔ وہ کسی واقعے یا صورتِ حال کے صرف ایک پہلو پر توجہ مرکوز نہیں کرتے بلکہ اس کے مختلف پہلوؤں کو بیک وقت پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ اس طرح قاری کو انسانی زندگی کی پیچیدگی، معاشرتی ماحول اور کرداروں کے رویوں کو متعدد زاویوں سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ جزئیات نگاری کا یہ وصف ان کی تحریروں کو زندگی سے قریب اور اثر

انگیز بناتا ہے۔

نذیر احمد کی نثر میں استدلال کا عنصر ہے۔ وہ اپنے خیالات کو محض دعوے کی صورت میں پیش کرنے کے بجائے ان کی تائید میں متعدد مثالیں، واقعات اور بعض مواقع پر اشعار بھی پیش کرتے ہیں۔ اس طرزِ استدلال سے ان کی تحریر میں قطعیت اور علمی اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ مثالوں اور اشعار کا برمحل استعمال ان کی علمی وسعت اور مطالعے کی گہرائی کا بھی مظہر ہے۔ عربی، فارسی اور اردو زبان وادب سے ان کی واقفیت کے ساتھ مذہب اور فلسفے سے ان کی گہری وابستگی نے ان کے فکری نظام کو وسعت عطا کی۔ چنانچہ ان کی نثر میں مذہبی، اخلاقی، ادبی اور علمی حوالوں کا امتزاج جابجا نظر آتا ہے۔ تاہم یہ علمی عناصر ان کی بنیادی نثری روانی پر غالب نہیں آتے بلکہ ان کے استدلال کو مضبوط بنانے کا کام کرتے ہیں۔

نذیر احمد کی نثر کا بنیادی امتیاز یہ ہے کہ ان کے ہاں ادب اور زندگی کے درمیان گہرا رشتہ قائم ہے۔ ان کے موضوعات کسی مجرد فکری دنیا سے اخذ نہیں ہوتے بلکہ معاشرتی زندگی کے حقیقی تجربات سے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ وقت، تعلیم، گھریلو زندگی، اخلاق، تربیت اور انسانی عادات جیسے موضوعات اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ یہ عام انسان کی عملی زندگی سے براہِ راست وابستہ ہیں۔ ان کے نزدیک ادب زندگی سے فرار کا ذریعہ نہیں بلکہ زندگی کو سمجھنے، اس کی خامیوں کی نشان دہی کرنے اور اسے بہتر بنانے کا وسیلہ ہے۔ اسی لیے ان کی نثر میں فکر اور عمل، علم اور اخلاق، فرد اور معاشرہ ایک دوسرے سے مربوط نظر آتے ہیں۔ ان کی اصلاحی مقصدیت ان کے ادبی اظہار کو ایک واضح سمت عطا کرتی ہے، جبکہ سادگی، برجستگی، محاوراتی زبان، جزئیات نگاری، مکالماتی انداز، شوخی اور ظرافت ان کی تحریروں میں ادبی کشش پیدا کرتے ہیں۔

اگرچہ ڈپٹی نذیر احمد نے باقاعدہ انشائیہ نگار کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم نہیں کی، تاہم ان کی متعدد نثری تحریروں میں انشائیہ کے اہم عناصر نمایاں ہیں۔ روزمرہ زندگی کے موضوعات کا انتخاب، ذاتی اور معاشرتی مشاہدہ، مکالماتی و خطابی انداز، محاوراتی زبان، شوخی و ظرافت، جزئیات نگاری، تشبیہ و استعارہ اور قاری سے براہِ راست ربط ان کی نثر کو انشائیہ کے مزاج سے قریب کرتے ہیں۔ البتہ ان کے ہاں ان تمام ادبی عناصر کے پسِ پشت اصلاحی مقصدیت ہمیشہ کارفرما رہتی ہے۔ اس اعتبار سے ڈپٹی نذیر احمد کی نثر اردو نثر کے اس عبوری دور کی نمائندگی کرتی ہے جس میں ادب نے زندگی کے عملی مسائل سے اپنا رشتہ مضبوط کیا اور نثر کو معاشرتی شعور، اخلاقی تربیت اور اصلاحِ احوال کا موثر وسیلہ بنایا۔

4.3.1 عبدالحلیم شرر کی انشائیہ نگاری:

عبدالحلیم شرر اردو انشائیہ نگاری کی روایت میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ اگرچہ ادب میں ان کی شہرت بنیادی طور پر ناول نگار کی

حیثیت سے ہوئی لیکن ان کی انشائیہ نگاری بھی اردو ادب میں خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ان کی تحریروں میں علمی، ادبی، اصلاحی، اخلاقی اور معاشرتی رجحانات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔وہ غیر شاعرانہ اور معمولی موضوعات کو بھی تخیل کی شگفتگی اور حسن بیان کے ذریعے مؤثر اور دلکش بنا دیتے ہیں۔

عبدالحلیم شرر کی ادبی زندگی کا ایک نمایاں پہلو مختلف رسائل کا اجراء بھی ہے۔ان کی متحرک طبیعت اور ادبی ذوق نے انھیں یکے بعد دیگر کئی رسائل جاری کرنے پر آمادہ کیا۔ان رسائل میں محشر، دل گداز، پردہ عصمت اور اتحاد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان رسائل کے ذریعے انھوں نے مختلف النوع علمی، ادبی اور اصلاحی مضامین شائع کیے اور اردو نثر کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔

عبدالحلیم شرر کی مضمون نگاری میں سب سے اہم کارنامہ مضامین شرر ہے، جو آٹھ جلدوں میں شائع ہوا۔ان جلدوں میں ایک ہزار سے زائد مضامین شامل ہیں۔انھوں نے مضمون نگاری میں سرسید اور انگریزی مضمون نگاروں سے استفادہ کیا اور مختلف النوع موضوعات کو اپنے مخصوص اسلوب میں پیش کیا۔مضامین شرر کی پہلی جلد کے بارے میں خود شرر نے لکھا ہے کہ یہ شاعرانہ اور عاشقانہ مضامین پر مشتمل ہے۔اس جلد کے مطالعے سے سرسید، مولانا حالی اور محمد حسین آزاد کے اثرات کے ساتھ ساتھ مغربی مضمون نگاروں خصوصا ایڈیسن اور گولڈاسمتھ کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ان کے انشائیوں میں ''امید''، ''کامیابی''، ''آخر ہم اب کیا کریں''، ''سفر کامیابی کی کنجی ہے''، ''انجام''، ''دنیا''، ''ناکامی''، ''خود پسندی وخود پرستی''، امید وآرزو''، ''دنیا ایک طلسم''، ''آزادی'' ''زمانے کا تھیٹر''، ''سفرنامہ ہستی''، ''رنج والم''، ''دماغی دربار'' اور ''اتفاق و اختلاف کا مناظرہ اور فرشتوں کی دلبری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

عبدالحلیم شرر کے انشائیوں میں تخیل کی شگفتگی، منظر نگاری، تاریخی شعور اور فنکارانہ حسن بھی پوری قوت کے ساتھ موجود ہے۔شرر کے ابتدائی انشائیوں میں صنائع، رنگینی اور بیان کی آرائش زیادہ نمایاں ہے۔اس کی ایک وجہ ان کی لکھنوی تہذیب اور ادبی فضا سے وابستگی بھی ہے۔ لکھنو کی رنگین نثر اور وہاں کی تہذیبی فضا نے ان کے اسلوب کو رنگینی عطا کی۔''امید'' اس کی ایک اچھی مثال ہے۔اس انشائیے میں امید کے موضوع کو تخیل اور شاعرانہ زبان کے ذریعے نہایت خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔

عبدالحلیم شرر کے انشائیوں میں حسن وعشق کے موضوعات نمایاں ہیں،لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کے موضوعات میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ مذہب، فلسفہ، تاریخ، تمدن اور معاشرتی مسائل جیسے موضوعات حصہ بنتے گئے۔''دیہات کی زندگی''، ''غریب کا چراغ''، ''بزمِ قدرت''، ''سفرنامہ ہستی''، ''دنیا''، ''غریب کا جھونپڑا''، ''تماشائے گاہِ عالم''، ''ٹوٹا ہوا کھنڈر''، ''دیہات کی شام''، ''گنگا کنارے کا برگد''، ''کامیابی''، ''ناکامی''، ''موسیٰ ندی'' ''ایک روپیہ کی سرگزشت'' اور ''مغرور جوتا'' وغیرہ اسی نوع کے مضامین ہیں۔

عبدالحلیم شرر کی انشائیہ نگاری کا ایک اہم وصف منظر نگاری بھی ہے۔ وہ معمولی سے معمولی جزئیات کو بھی اپنی باریک نگاہ سے دیکھتے اور الفاظ کے ذریعے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ان کے اسلوب کی ایک اہم خصوصیت سادگی، سلاست اور روانی ہے۔ انھوں نے آزادانہ طرز نگارش اختیار کیا اور موضوع کو کسی خاص فنی پابندی میں محدود نہیں کیا۔ عربی، فارسی اور انگریزی الفاظ کے مناسب استعمال سے انھوں نے مضمون کی فضا کو مزید دلکش اور مؤثر بنایا۔ ان کے بیشتر انشائیوں میں رومانوی انداز بھی نمایاں ہے، خصوصاً جب وہ حسن، عشق، فطرت اور انسانی جذبات کو موضوع بناتے ہیں۔

شرر کے مضامین میں روشن خیالی اور نئی فکر کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کے بعض مضامین میں تمثیلی عناصر نمایاں ہیں۔ ان کا مضمون ''اتفاق و اختلاف کا مناظرہ''، تمثیلی رنگ کی ایک نمایاں مثال ہے۔ ان کے بعض انشائیہ میں کہانی کا انداز بھی ملتا ہے۔ ''غریب کا چراغ'' میں ایک غریب خاندان کے چھوٹے سے جھونپڑے اور اس میں جلتے ہوئے چراغ کا منظر نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح ''گنگا کنارے کا برگد'' میں بوڑھے برگد، ویران مسجد، اجڑے ہوئے مندر اور منہدم عمارتوں کے ذریعے تاریخی فضا پیدا کی گئی ہے۔ ''ایک روپیہ کی سرگزشت اور ''مغرور جوتا'' شرر کے ایسے شاہکار انشائیے ہیں جن میں تخیل، تاریخی شعور، زبان کی برجستگی اور اسلوب کی شگفتگی نہایت خوب صورتی سے مل جاتی ہے۔ ان انشائیوں سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک اعلیٰ درجے کا انشائیہ کس طرح عام اور غیر شاعرانہ موضوع کو تخلیقی قوت کے ذریعے فن پارے میں تبدیل کر دیتا ہے۔ ''موسیٰ ندی'' بھی شرر کی مثالی انشائیہ نگاری کا نمونہ ہے۔ اس میں ندی کو محض ایک قدرتی مظہر کے طور پر نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی شخصیت اور کردار کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ سیلاب، اس کی تباہ کاری اور حیدرآباد کے متاثرہ علاقوں کی منظر کشی نہایت مؤثر ہے۔ ''موسیٰ'' کے لفظ کو حضرت موسیٰؑ اور ان کے عصا سے جوڑ کر شرر نے لفظی مناسبت سے حسن میں تبدیل کر دیا ہے۔

شرر کی انشائیہ نگاری میں تاریخی شعور اور معلوماتی عنصر بھی اہم ہے۔ ''ترکانِ آلِ عثمان''، ''سایدین یا اہلِ خطا''، ''مسجدِ اقصیٰ''، ''جاپانیوں کی قومی کہانیاں''، ''ابن بطوطہ''، ''اٹلی کی سیر'' اور ''سوئٹزرلینڈ'' جیسے انشائیوں میں تاریخی اور جغرافیائی معلومات کے ساتھ حسنِ بیان بھی موجود ہے۔ البتہ بعض تحریروں میں محض معلومات کا غلبہ ہو جاتا ہے اور انشائیہ نگار کی شخصیت پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ اس کے باوجود جہاں شرر اپنی تخلیقی صلاحیت کو معلومات کے ساتھ شامل کرتے ہیں وہاں ان کی تحریر نہایت مؤثر اور دلکش ہو جاتی ہے۔

الغرض عبدالحلیم شرر نے مضامین شرر کے ذریعے اردو مضمون نگاری کی روایت کو وسعت عطا کی۔ انھوں نے اردو انشائیے کو مختلف موضوعات سے روشناس کرایا اور معمولی چیزوں کو بھی تخیل اور فن کے ذریعے قابلِ توجہ بنا دیا۔ ان کی تحریریں زیادہ تر اپنے عہد کے حالات، ذاتی

مشاہدات، ادبی ذوق اور مختلف موضوعات سے متاثر ہو کر وجود میں آئیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے متعدد مضامین میں انشائیہ کی خصوصیات نمایاں طور پر جلوہ گر ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے عبدالحلیم شرر کو اردو کے اہم انشائیہ نگاروں میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔

4.3.2 خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری:

خواجہ حسن نظامی کا تعلق صوفیا کے خاندان سے ہے۔ وہ مشہور صوفی بزرگ بابا فریدالدین گنج شکر کے داماد بدرالدین اسحاق کی نسل سے ہیں اور ان کا شجرہ حضرت علی مرتضیٰ سے ملتا ہے۔ ان کی ولادت بستی نظام الدین دہلی میں 2 محرم الحرام 1296 بروز جمعرات بمطابق 25 دسمبر 1878 کو ہوئی۔ پیدائش کے وقت خواجہ حسن نظامی کے والد حافظ سید عاشق علی نے انہیں قاسم علی کا نام دیا مگر ان کے ماموں سید بہادر علی شاہ ان کو علی حسن کے نام سے بلاتے تھے اور بالآخر یہی ان کا اصل نام قرار پایا۔ یہ نام تقریباً چوبیس برس تک چلتا اور پھر حسن نظامی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ خواجہ حسن نظامی کی والدہ کا نام سیدہ چہیتی بیگم تھا۔

خواجہ صاحب کی ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی۔ پانچ برس کی عمر میں مکتب گئے۔ وہاں انھوں نے ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ حدیثوں کی کئی کتابیں پڑھیں۔ ان کے اساتذہ میں مولانا محمد اسماعیل، ان کے بڑے بیٹے میاں محمد تھے جن سے انھوں نے باضابطہ حدیث کی کتابیں پڑھیں۔ مولوی عبدالعلی محدث، مولوی وصیت علی، حکیم وصی الحسن اور مولوی حکیم الہ دین بھی ان کے دہلی کے اساتذہ میں شامل ہیں۔ مولانا محمد یحییٰ جوان کے پرانے استاد مولانا محمد اسماعیل کے چھوٹے بیٹے تھے، انھوں نے ان کو گنگوہ لے جا کر وہاں کے مشہور و معروف مدرسے رشیدہ میں داخلہ دلایا جہاں خواجہ صاحب نے ڈیڑھ برس تک قیام کیا اور تعلیم حاصل کی۔ ان کی پوری تعلیم عربی و فارسی میں ہوئی اور ان دونوں زبانوں پر وہ قدرت کاملہ رکھتے تھے۔

پڑھنے پڑھانے کا شوق ابتدا سے ہی تھا۔ ابتدائی دنوں میں اخبارات کا مطالعہ کرنے کا اثر یہ ہوا کہ مضمون نگاری کے میدان میں قدم رکھ دیا۔ حالانکہ ان کی مضمون نگاری خاندان کے لوگوں کو پسند نہیں تھی مگر وہ چوری چھپے یہ کام کرتے رہے۔ سب سے پہلا مضمون 'انڈیا کی نازک حالت' انڈیا گزٹ بمبئی میں شائع ہوا۔ اس کے بعد منشی نظام الدین خاکسارؔ کی ایما پر عبدالحلیم شرر کی نثر کا تتبع کرتے ہوئے ایک ناول تحریر کیا جو بوجوہ شائع نہ ہو سکا۔ ہمت ٹوٹی ضرور مگر خاکسارؔ صاحب کی حوصلہ افزائی نے مضمون لکھنے کا سلسلہ جاری رکھوایا اور بالآخر وہ سید محمد علی حسن نظامی سے حسن نظامی بن گئے۔ حسن نظامی کے نام سے اخبار وکیل امرتسر میں ان کا پہلا مضمون شائع ہوا جس کا عنوان 'حلت زاغ' تھا۔

ان کی پہلی کتاب 'مفلسی کا مجرب علاج' ہے جس کی اشاعت 1900 میں ہوئی اور اس کے بعد یہ سفر کبھی رکا نہیں۔ وہ اپنی پوری زندگی مسلسل تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے اور بقول ملا واحدی انتقال کے وقت وہ تقریباً پانچ سو کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تصانیف میں سی پارۂ دل، بیگمات کے آنسو، غدر دلی کے افسانے، مجموعہ مضامین حسن نظامی، طمانچہ بر رخسار یزید، سفر نامہ ہندوستان اور کرشن کتھا قابل ذکر ہیں۔ بعد کی زندگی میں خواجہ حسن نظامی کی آمدنی کا بڑا ذریعہ ان کی یہی کتابیں تھیں۔ کتابوں کے کاروبار کے علاوہ انھوں نے ایک دواخانہ بھی شروع کیا تھا جس کا ذکر ان کے رسالے 'منادی' میں ملتا ہے۔

خواجہ حسن نظامی کو اردو زبان و ادب میں کئی حیثیتوں سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کی روزنامچہ نگاری کے سبب اردو میں روزنامچہ کو باقاعدہ صنف کی حیثیت حاصل ہوئی۔ بطور صحافی متعدد اخبارات و جرائد کے ساتھ ان کی وابستگی رہی۔ نظام المشائخ، روزنامہ رعیت، ماہانہ دین دنیا، منادی، ماہنامہ آستانہ، ہفتہ وار توحید وغیرہ ان اخبارات و رسائل میں شامل ہیں جن سے خواجہ صاحب کی کسی نہ کسی طور پر وابستگی رہی ہے۔ ان کی کتابیں مثلاً بیگمات کے آنسو، غدر کے اخبار، غدر کے فرمان، بہادر شاہ ظفر کا مقدمہ، غدر کی صبح و شام، محاصرہ دہلی کے خطوط وغیرہ بہت اہم ہیں۔ قرآن کی تفسیر ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ آپ بیتی اور سفر نامے بھی خواجہ صاحب کی ادبی و علمی زندگی کا حوالہ ہیں۔ دراصل یہ بات بغیر کسی جھجھک کے کہی جاسکتی ہے کہ خواجہ حسن نظامی کی تصنیف و تالیف کا دائرہ لامحدود ہے البتہ ادبی دنیا میں بطور انشائیہ نگار ان کی شہرت سب سے زیادہ ہوئی ہے۔ جھینگر کا جنازہ، گلاب تمہارا کیکر ہمارا، مرغ کی اذان، مچھر، مکھی، الّو ان کے مشہور انشائیوں میں شامل ہیں۔

خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں کی کتاب 'سی پارۂ دل' کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کتاب میں شامل سبھی انشائیے خواجہ حسن نظامی کے صاحب طرز ادیب ہونے کے غماز ہیں۔ ان کے بیشتر انشائیوں میں فن انشائیہ نگاری کی بنیادی ضرورتوں کا خیال رکھا گیا ہے اور وہ فن انشائیہ نگاری کا شاندار نمونہ ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان انشائیوں کی تخلیق کا مقصد خواجہ حسن نظامی کے نزدیک صوفیانہ افکار و خیالات کی ترویج و اشاعت تھا۔ انھوں نے اپنے منفرد استدلالی انداز میں اپنے انشائیوں کو زندگی سے قریب تر کرنے کی سعی کی ہے۔ اپنے مقصد تحریر کی وضاحت کرتے ہوئے وہ 'سی پارۂ دل' کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ''میں نے جو کچھ خامہ فرسائی کی ہے وہ محض اس لیے ہے کہ نئی روشنی کے لوگ جو صوفیوں کی پرانی کتابوں کو نہیں پڑھتے یا ان کتابوں کے قدیمی طرز تحریر کے سبب تصوف ہی سے غیر مانوس ہوتے جاتے ہیں، وہ میرے نئے انداز تحریر سے ادھر راغب ہوں اور کیف روحانی سے فائدہ اُٹھائیں۔'' (خواجہ حسن نظامی، مقدمہ سی پارۂ دل)

خواجہ حسن نظامی نے سیاسی، سماجی، اخلاقی، فلسفیانہ موضوعات کو ہی اپنے انشائیے کا موضوع نہیں بنایا بلکہ انھوں نے مکھی، مچھر، الو، جھینگر جیسی مخلوقات پر بھی توجہ دی جن کی جانب کوئی توجہ نہیں دیتا۔ ان حقیر اور ذلیل نیز معمولی سمجھی جانے والی مخلوقات کے ان گنت گوشوں کو اجاگر کر کے ان کو عزت و وقار بخشا اور انسانی زندگی کے لیے ان کی ضرورت سے لوگوں کو آشنا کیا۔ انھوں نے ٹیلی فون، بجلی، لفٹ، ٹرین کی خطرے کی زنجیر، ٹرام، برقی تار، موٹر، قلم، بید، کھرپا، ہل، سلائی مشین، دیا سلائی، رندہ، آری، لحاف، چادر، آب خورہ، سوئی، کمان، خنجر، تلوار، ڈھال، پستول، بندوق اور فٹ وغیرہ جیسی چیزوں پر دلچسپ مضامین تحریر کیے۔ ان کی تحریروں میں موضوعاتی سطح پر بڑا تنوع نظر آتا ہے۔ دراصل جہاں خواجہ حسن نظامی کا مشاہدہ بہت وسیع اور تیز تھا۔ ان کے پاس علم اور معلومات کا خزانہ تھا۔ ان کے وسیع تر تجربے کی جھلک ان کی تحریروں میں بآسانی محسوس کی جاسکتی ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ اپنے تجربے کو اس طرح پیش کرتے تھے کہ عام انسان بھی خود کو اس سے وابستہ محسوس کر سکے۔

خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں موضوعات کا تنوع اور اسلوب کی انفرادیت نمایاں نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنے انشائیوں میں سادہ، بے تکلف اور بے ساختہ زبان استعمال کی۔ عربی و فارسی زدہ نثری اسلوب سے بچتے ہوئے خالص عام بول چال کی زبان استعمال کی۔ انھوں نے بات چیت کے انداز میں نثر نگاری کی اور اپنے حلقۂ قارئین تک پہنچنے میں کامیاب بھی ہوئے۔ اسی لیے مولوی عبدالحق نے لکھا ہے:

> ''ان مضامین میں خواجہ صاحب کسی سے باتیں کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ کہیں وہ اپنے سے ہم کلام ہیں، کہیں راز و نیاز ہے، کہیں دردِ دل کی داستان ہے اور اپنا اور ہمارا دکھڑا رو رہے ہیں۔ کہیں تخیل کا زور عرش تک لے گیا، کہیں نثر میں وہ شاعری کی شان دکھائی کہ نظم مقفیٰ ہیچ ہے۔'' (مقدمہ سی پارۂ دل، ص 9,10)

خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں کا متصوفانہ رنگ بھی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی نثر کی سادگی، سلاست، شگفتگی اور مرصع کاری سرسید احمد خاں اور محمد حسین آزاد سے ملتی ہے۔ ان کے یہاں جو تشبیہات و استعارات استعمال ہوئی ہیں وہ روایتی نہیں بلکہ روزمرہ زندگی سے ماخوذ ہوتی ہیں۔ جزئیات نگاری میں انہیں کمال حاصل تھا۔ زبان اور الفاظ پر مکمل عبور تھا اسی لیے عربی، فارسی لفظوں کے استعمال سے بہت حد تک گریز کرتے تھے۔ انھیں اپنی بات مختصر لفظوں میں کہنے کی عادت تھی اسی لیے ہم دیکھیں گے کہ ان کے مضامین بہت مختصر ہوتے ہیں۔ یہ ایجاز و اختصار ان کے انشائیوں کی بڑی خوبی ہے۔ قدرتی مناظر اور مظاہر سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔ اسی لیے ان کی تحریروں میں مختلف موسموں اور شب و روز کے مختلف اوقات کی دلکش تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان کے انشائیوں میں ظرافت کا پہلو بھی نظر آتا ہے۔ الغرض یہ کہ خواجہ حسن نظامی ہمارے اہم

ترین انشائیہ نگار ہیں اور ان کے انشائیوں میں بے شمار خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ موضوعات کا تنوع، زبان و بیان پر قدرت، ایجاز و اختصار، سادگی و سلاست، شگفتگی و روانی، آسان اور سادہ الفاظ، صنائع و بدائع کا استعمال، بیساختہ پن اور سوز و گداز وہ اہم خوبیاں جو ان کے انشائیوں کو منفرد بناتی ہیں۔

4.3 سرگرمی:

خالی جگہیں پر کیجیے۔

1۔ سرسید کے انشائیوں کا بنیادی وصف ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔

2۔ ذکاءاللہ کی انشائیہ نگاری کا ایک اور اہم وصف ان کا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔

3۔ نذیر احمد کے انشائیوں کے موضوعات کا تعلق زیادہ تر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سے ہے۔

4۔ عبدالحلیم شرر کے انشائیوں میں ۔۔۔۔۔۔۔۔ کے موضوعات نمایاں ہیں۔

5۔ خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نمایاں نظر آتی ہے۔

4.4 عمومی جائزہ:

اس سبق میں ہم نے پانچ انشائیہ نگاروں کی انشائیہ نگاری کی خصوصیات کا جائزہ لیا۔ اس مطالعے سے یہ ظاہر ہے کہ ان تمام انشائیہ نگاروں کی انفرادیت مسلم ہے۔ بعض کے یہاں موضوعات کی یکسانیت کے باوجود ان کی طرز فکر اور طرز اظہار میں فرق نظر ہے۔ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ سرسید ایک مصلح قوم تھے اس لیے ان کی تحریروں میں اصلاح کا پہلو غالب نظر آتا ہے۔ سرسید نے اپنے انشائیوں میں استدلالی انداز اختیار کیا ہے اور ہر ایک بات کو عقل اور مذہب کی کسوٹی پر کسا ہے۔ قارئین کے سامنے زندگی سماج اور مذہب کے مختلف پہلوؤں کو اس طریقے سے پیش کیا ہے کہ وہ قاری کے ذہن کو اپیل کرتے ہیں اس کی سوچ اور فکر کے دھارے کو موڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان میں کوئی جملہ قاری کو منطقی اور استدلالی تقاضوں کی مخالفت کرتا ہوا معلوم نہیں ہوتا ہے۔

سرسید کے انشائیوں میں سنجیدگی بخوبی نظر آتی ہے، ان کے انشائیوں کا مطالعہ شوخی اور ظرافت کی کمی احساس قلب پر طاری کرتا ہے چوں

کہ ان یہاں مقصدیت کا غلبہ ہے اس لئے ان خامیوں کا ہونا فطری ہے۔سرسید کے انشائیے اس صنف ادب کے ابتدائی نمونوں میں سے ہیں اس لیے ان کے یہاں معمولی خامیوں کا ہونا بعید از قیاس نہیں ہے۔سرسید نے اردو نثر کو ایک نئے اسلوب اور طرز ادا سے واقف کرایا،انشائیہ نگاری کی بنیاد ڈالی انشائیے کے تقاضوں کو بھی پورا کرنے کی کوشش کی اور پیغام کے ساتھ ساتھ انشائیے کا حسن برقرار رکھنے میں بھی کامیاب ہوئے،زبان کی سادگی اور بیان کے حسن نے سرسید کو مزید کامیاب اور مؤثر بنا دیا ہے۔

مولوی ذکاءاللہ کی انشائیہ نگاری کا ایک اور اہم وصف ان کا علمی اور سائنسی شعور ہے۔ریاضی،تاریخ،جغرافیہ اور سائنس جیسے علوم سے گہری واقفیت کے باعث ان کی تحریروں میں معلومات کا وسیع ذخیرہ موجود ہے۔وہ محض معلومات فراہم کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ انہیں انسانی زندگی اور معاشرتی مسائل سے مربوط کرتے ہیں۔سائنس کو محض خشک معلومات نہیں بلکہ کائنات اور انسانی زندگی کو سمجھنے کا ذریعہ ہے۔ذکاءاللہ کی انشائیہ نگاری اردو نثر کے ارتقائی دور کی ایک اہم کڑی ہے۔انہوں نے ایسے زمانے انشائیہ نگاری کو فروغ دیا جب اردو نثر جدید علمی،اخلاقی ،اصلاحی اور تہذیبی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو رہی تھی۔ان کی انشائیہ نگاری میں ادبی حسن،عصری شعور،اصلاحی مقصد،سادگی بیان،فکری گہرائی اور تخیل نمایاں ہے۔انہی خصوصیات کی بنا پر انہیں اردو کے اہم انشائیہ نگاروں میں نمایاں مقام حاصل ہے۔

مولوی نذیر احمد بنیادی طور پر ناول نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں،تاہم ان کی متعدد نثری تحریروں میں انشائیہ کے اہم عناصر نمایاں ہیں۔روزمرہ زندگی کے موضوعات کا انتخاب،ذاتی اور معاشرتی مشاہدہ،مکالماتی وخطابی انداز،محاوراتی زبان،شوخی وظرافت،جزئیات نگاری،تشبیہ واستعارہ اور قاری سے براہِ راست ربط ان کی نثر کو انشائیہ کے مزاج سے قریب کرتے ہیں۔البتہ ان کے ہاں ان تمام ادبی عناصر کے پسِ پشت اصلاحی مقصدیت ہمیشہ کارفرما رہتی ہے۔اس اعتبار سے ڈپٹی نذیر احمد کی نثر اردو نثر کے اس عبوری دور کی نمائندگی کرتی ہے جس میں ادب نے زندگی کے عملی مسائل سے اپنا رشتہ مضبوط کیا اور نثر کو معاشرتی شعور،اخلاقی تربیت اور اصلاحِ احوال کا مؤثر وسیلہ بنایا۔

عبدالحلیم شرر نے مضامین شرر کے ذریعے اردو مضمون نگاری کی روایت کو وسعت عطا کی۔انھوں نے اردو انشائیے کو مختلف موضوعات سے روشناس کرایا اور معمولی چیزوں کو بھی تخیل اور فن کے ذریعے قابلِ توجہ بنا دیا۔ان کی تحریریں زیادہ تر اپنے عہد کے حالات،ذاتی مشاہدات ،ادبی ذوق اور مختلف موضوعات سے متاثر ہو کر وجود میں آئیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے متعدد مضامین میں انشائیہ کی خصوصیات نمایاں طور پر جلوہ گر ہوتی ہیں۔

خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں موضوعات کا تنوع اور اسلوب کی انفرادیت نمایاں نظر آتی ہے۔انھوں نے اپنے انشائیوں میں سادہ،

بے تکلف اور بے ساختہ زبان استعمال کی۔عربی و فارسی زدہ نثری اسلوب سے بچتے ہوئے خالص عام بول چال کی زبان استعمال کی۔ان کے انشائیوں میں صوفیانہ رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔خواجہ حسن نظامی ہمارے اہم ترین انشائیہ نگار ہیں اوران کے انشائیوں میں بے شمار خوبیاں پائی جاتی ہیں۔موضوعات کا تنوع، زبان و بیان پر قدرت، ایجاز واختصار، سادگی وسلاست، شگفتگی وروانی، آسان اور سادہ الفاظ، صنائع و بدائع کا استعمال، بیساختہ پن اور سوز و گداز وہ اہم خوبیاں جوان کے انشائیوں کو منفرد بناتی ہیں۔

4.5 فرہنگ:

الفاظ	:	معنی
متصوفانہ	:	تصوف سے متعلق،صوفیانہ
اسباب وعلل	:	اسباب اور وجوہات
تمرات	:	نتائج
سلاست	:	روانی، ہمواری
سکونت	:	رہائش، قیام
تخیلی	:	خیالی
سلیس	:	آسان، عام فہم، رواں
تصنع	:	بناوٹ
جذبات نگاری	:	احساسات کا اظہار کرنا، دلی کیفیت بیان کرنا
برجستگی	:	بے ساختگی، برمحل
تتبع	:	تقلید،نقل، پیروی

4.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات:

1۔ سرسید احمد خاں کی نثر کے امتیازات پر روشنی ڈالیے۔

2۔ مولوی ذکا اللہ کی انشائیہ نگاری پر اظہار خیال کیجیے۔

3۔ مولوی نذیر احمد کی انشائیہ نگاری کی خصوصیات بیان کیجیے۔

4۔ عبدالحلیم شرر کی نثر نگاری پر روشنی ڈالیے۔

5۔ خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری کا جائزہ لیجیے۔

4.7 مشقی سوالات:

1۔ سرسید کے انشائیوں کا بنیادی وصف کیا ہے؟

2۔ مولوی ذکا اللہ کا تصورادب کیا ہے؟

3۔ مولوی نذیر احمد کی نثر کی کیا خصوصیات ہیں؟

4۔ عبدالحلیم شرر نے کس طرح کے موضوعات کو اپنے انشائیوں میں پیش کیا ہے؟

5۔ خواجہ حسن نظامی نے اپنے انشائیوں میں کس طرح کی زبان استعمال کی ہے؟

4.8 مشقی سوالات کے جوابات جوابات سرگرمی

-1 سرسید کے انشائیوں کا بنیادی وصف مقصدیت ہے۔انہوں نے تفریح طبع اور اپنے تجربات واحساسات کو بیان کرنے کے لئے انشائیہ تخلیق نہیں کیا بلکہ ان کا مقصد سماج ومعاشرہ کی تعمیر اور ترقی تھا انہوں نے اپنے انشائیوں میں معاشرے کو مہذب بنانے کے طریقے کا ذکر کیا اور معاشرہ کے ہر فرد کی اصلاح ودرستی کی جانب توجہ مرکوز کی اور اپنے انشائیوں میں اخلاق وکردار کی بلندی کو پیش نظر رکھا، اخلاق کی خامیاں اور ان کے نقصانات بیان کئے اور ان سے بچنے کی تاکید کی ہے۔

-2 مولوی ذکا اللہ کا تصورِادب بنیادی طور پر افادی، اصلاحی اور اخلاقی تھا۔وہ مضمون نگار کو معاشرے کی اصلاح کا ذمہ دار سمجھتے تھے اور اس بات کے قائل تھے کہ اچھی تحریر انسان کے خیالات، عادات اور کردار پر مثبت اثر ڈالنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔اسی لیے ان کے مضامین میں انسانی اخلاق، تہذیب، معاشرتی رویوں اور زندگی کی بنیادی اقدار پر خاص توجہ ملتی ہے۔وہ اپنے عہد کے سماجی اور اخلاقی مسائل سے پوری طرح باخبر تھے اور چاہتے تھے کہ ادب زندگی کے حقیقی مسائل سے وابستہ ہو۔

3- نذیر احمد کی نثر میں سادگی اور برجستگی ہے۔ان کی زبان میں غیر ضروری تصنع ،لفظی نمائش اور بے جا تکلف نہیں پایا جاتا۔وہ اپنے خیالات کو زیادہ سے زیادہ واضح ،موثر اور قابلِ فہم انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی نثر میں بعض اوقات طویل جملے بھی آتے ہیں،لیکن معنوی ربط برقرار رہتا ہے اور قاری کے لیے مفہوم تک پہنچنا دشوار نہیں ہوتا۔ان کی زبان بنیادی طور پر اردو روزمرہ اور محاورے سے تشکیل پاتی ہے۔

4- عبدالحلیم شرر کے انشائیوں میں حسن وعشق کے موضوعات نمایاں ہیں،لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کے موضوعات میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔مذہب،فلسفہ،تاریخ،تمدن اور معاشرتی مسائل جیسے موضوعات حصہ بنتے گئے۔

5- خواجہ حسن نظامی نے اپنے انشائیوں میں سادہ، بے تکلف اور بے ساختہ زبان استعمال کی۔عربی و فارسی زدہ نثری اسلوب سے بچتے ہوئے خالص عام بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔

1۔ مقصدیت

2۔ علمی اور سائنسی شعور

3۔ زندگی کے عام معاملات

4۔ حسن وعشق

5۔ موضوعات کا تنوع اور اسلوب کی انفرادیت

4.9 امدادی کتب:

1۔ سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا کی نثر : ڈاکٹر سید عبداللہ

2۔ سرسید اور ان کا عہد : ثریا حسین

3۔ رسالہ جامعہ (سرسید نمبر)

4۔ مولوی ذکا اللہ : ڈاکٹر رشید اشرف

5۔ فکرِ نو (ذکا اللہ نمبر)

6۔ ڈپٹی نذیر احمد احوال و آثار : محمد اکرام چغتائی

7۔ مولوی نذیر احمد احوال و آثار : ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی

8۔ عبدالحلیم شرر : پروفیسر جعفر رضا

9۔ عبدالحلیم شرر: شخصیت اور فن : ڈاکٹر شریف احمد

10۔ خواجہ حسن نظامی: شخصیت اور ادبی خدمات : نثار احمد فاروقی

11۔ خواجہ حسن نظامی کی نثر : ڈاکٹر مولا بخش

12۔ خواجہ حسن نظامی (کتاب نما خصوصی شمارہ)

سبق نمبر 5۔تعصّب ۔سرسید

ساخت

5.0 اغراض ومقاصد
5.1 تعارف
5.2 تعصّب
5.2.1 متن کی تدریس
5.3 سرگرمی
5.4 عمومی جائزہ
5.5 فرہنگ
5.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات
5.7 مشقی سوالات
5.8 مشقی سوالات کے جوابات/جوابات سرگرمی
5.9 امدادی کتب

5.0 اغراض ومقاصد:

اس سبق کے مطالعہ سے طلبا سے توقع کی جاتی ہے کہ طلبہ.....

سرسید کے انشائیہ ''تعصّب'' سے متعارف ہوں گے۔

انشائیہ تعصب کے اغراض ومقاصد سے واقف ہوں گے۔

انشائیہ تعصب متن کے مشکل الفاظ کے معانی سے واقف ہوں گے۔

انشائیہ تعصب کے متن کی زبان واسلوب سے واقف ہوں گے۔

اس انشائیہ کی امتیازی خصوصیات سے واقف ہوں گے۔

5.1 تعارف:

عزیز طلبا وطالبات! سرسید نے اردو نثر کے فرغ میں اہم کردار ادکیا ہے۔اردو میں مضمون نگاری کا آغاز سرسید سے ہوتا ہے۔ان کی اس نوع کی بعض تحریروں میں افسانوی اور تمثیلی انداز بھی نظر آتا ہے۔انشائیہ کے نقوش بھی ان کی یہاں دیکھے جاسکتے ہیں۔اس سبق میں سرسید کے انشائیہ تعصب کا مطالعہ کریں گے۔سرسید احمد خاں علی گڑھ تحریک کے روح وروں تھے۔یہ بات آپ سب کو معلوم ہوگی کہ علی گڑھ تحریک ایک اصلاحی تحریک تھی۔معاشرے کی اصلاح اس کا بنیادی مقصد تھا۔اس لیے سرسید اور ان کے رفقا نے اصلاحی مضمون تحریر کیے جس سے سماج کی اصلاح ہوسکے۔ان انشائیہ میں بھی اس کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔

5.2 تعصّب

انسان کی بدترین خصلتوں میں سے تعصب بھی ایک بدترین خصلت ہے۔یہ ایسی بدخصلت ہے کہ انسان کی تمام نیکیوں اور اس کی تمام خوبیوں کو غارت اور برباد کرتی ہے۔متعصب گو اپنی زبان سے نہ کہے،مگر اس کا طریقہ یہ بات جتلاتا ہے کہ عدل وانصاف کی خصلت جو عمدہ ترین خصائل انسانی ہے اس میں نہیں ہے۔متعصب اگر کسی غلطی میں پڑتا ہے تو اپنے تعصب کے سبب اس غلطی سے نکل نہیں سکتا، کیونکہ اس کا تعصب اُس کے برخلاف بات کے سننے اور سمجھنے اور اس پر غور کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اگر وہ کسی غلطی میں نہیں ہے، بلکہ سچی اور سیدھی راہ پر ہے تو اس کے فائدے اور اس کی نیکی کو پھیلنے اور عام ہونے نہیں دیتا، کیونکہ اس کے مخالفوں کو اپنی غلطی پر متنبہ ہونے کا موقع نہیں ملتا۔تعصب انسان کو ہزار طرح کی نیکیوں کے حاصل کرنے سے باز رکھتا ہے۔اکثر دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی کام کو نہایت عمدہ اور مفید سمجھتا ہے،مگر صرف تعصب سے اس کو اختیار نہیں کرتا اور دیدہ ودانستہ برائی میں گرفتار اور بھلائی سے بیزار رہتا ہے۔

مذہبی تعصّبات کی نسبت بھی ہم کچھ تھوڑا سا بیان کریں گے،مگر اول امور تمدن ومعاشرت میں جو نقصان تعصب سے پیدا ہوتے ہیں ان

کا ذکر کرتے ہیں۔

انسان قواعد قدرت کے مطابق مدنی الطبع پیدا ہوا ہے، وہ تنہا اپنی حوائج ضروری کو مہیا نہیں کر سکتا۔ اس کو ہمیشہ مددگاروں اور معاونوں کی جو دوستی اور محبت سے ہاتھ آتے ہیں ضرورت ہوتی ہے، مگر متعصب سبب اپنے تعصب کے تمام لوگوں سے منحرف اور بیزار رہتا ہے اور کسی کی دوستی اور محبت کی طرف بجز ان چند لوگوں کے جو اس کے ہم رائے ہیں مائل نہیں ہوتا۔ عقل اور قواعد قدرت کا مقتضا یہ معلوم ہوتا ہے کہ امور متعلق تمدن و معاشرت میں جو باتیں زیادہ منفعت اور زیادہ آرام اور زیادہ لیاقت اور زیادہ عزت کی ہیں ان کو انسان اختیار کرے، مگر متعصب ان سب نعمتوں سے محروم رہتا ہے۔

وہ ان تمام دلچسپ اور مفید باتوں سے جو نئی تحقیقات سے اور نئے علوم اور فنون سے حاصل ہوتی ہیں محض جاہل اور ناواقف رہتا ہے۔ اُس کی عقل اور اس کے دماغ کی قوت محض بیکار ہو جاتی ہے اور جو کچھ اس میں سمائی ہوئی ہے، اس کے سوا اور کسی بات کے سمجھنے کی اس میں طاقت اور قوت نہیں رہتی۔ وہ ایک ایسے جانور کی مانند ہو جاتا ہے کہ اس کو جو کچھ بالطبع آتا ہے اس کے سوا اور کسی چیز کی تعلیم و تربیت کے قابل نہیں ہوتا۔

بہت سی قومیں ہیں جو اپنے تعصب کے باعث سے تمام باتوں میں کیا اخلاق میں اور کیا علم و ہنر میں اور کیا فضل و دانش میں اور کیا تہذیب و شائستگیمیں اور کیا جاہ و حشمت اور مال و دولت میں اعلیٰ درجے سے نہایت پست درجہ ذلت اور خواری کو پہنچ گئی ہے اور بہت سی قومیں ہیں جنھوں نے اپنی بے تعصبی سے ہر جگہ اور ہر قوم سے اچھی اچھی باتیں اخذ کیں اور ادنیٰ درجے سے ترقی کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجے پر پہنچ گئیں۔ مجھ کو اپنے ملک کے بھائیوں پر اس بات کی بدگمانی ہے کہ وہ بھی تعصب کی بدخصلت میں گرفتار ہیں اور اس سبب سے ہزاروں قسم کی بھلائیوں کے حاصل کرنے سے اور دنیا میں اپنے تئیں ایک معزز قوم کو دکھانے سے محروم اور ذلت اور خواری اور بے علمی اور بے ہنری کی مصیبت میں گرفتار ہیں اور اسی لیے میری خواہش ہے کہ وہ اس بدخصلت سے نکلیں اور علم و فضل اور مہر و کمال کے اعلیٰ درجے کی عزت تک پہنچیں۔

ہم مسلمانوں میں ایک غلطی یہ پڑی ہے کہ بعضی دفعہ ایک غلط نمائیکی کے جذبے سے تعصب کو اچھا سمجھتے ہیں اور جو شخص اپنے مذہب میں بڑا متعصب ہو اور تمام شخصوں کو جو اس مذہب کے نہیں ہیں اور تمام ان علوم و فنون جو اس مذہب کے لوگوں میں نہیں ہیں نہایت حقارت سے دیکھے اور برا سمجھے۔ اس شخص کو نہایت قابل تعریف اور توصیف کے اور بڑا پختہ اور پکا اپنے مذہب میں سمجھتے ہیں، مگر ایسا سمجھنا سب سے بڑی غلطی ہے جس نے حقیقت میں مسلمانوں کو برباد کر دیا ہے۔

ہمارا مذہب اور مذہبی علوم اور دنیا اور دنیاوی علوم بالکل علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں، پس بڑی نادانی ہے جو دنیاوی علوم اور فنون کے سیکھنے میں

کسی قسم کے تعصب مذہبی کو کام میں لاویں۔

اگر یہ خیال ہو کہ ان دنیاوی علوم کے سیکھنے سے ہمارے عقائد مذہبی میں سستی آتی ہے، کیونکہ مذہبی مسائل ان دنیاوی علوم کے پڑھنے سے مشتبہ یا غلط معلوم ہوتے ہیں تو نہایت ہی افسوس کا مقام ہے کہ مسلمان اپنے ایسے روشن اور مستحکم سچے مذہب کو ایسا ضعیف اور کمزور سمجھتے ہیں کہ دنیاوی علوم کی ترقی سے اس کی برہمی کا خیال کرتے ہیں، نعوذ باللہ منہا۔ مذہب اسلام ایسا مستحکم اور سچا مذہب ہے کہ جس قدر دینی اور دنیاوی علوم کی ترقی ہوتی جاوے گی اسی قدر اس کی سچائی زیادہ تر ثابت ہوگی۔ اب ہم یہ بات بتاتے ہیں کہ اپنے مذہب میں پختہ ہونا جدا بات ہے اور یہ ایک نہایت عمدہ صفت ہے جو کسی اہل مذہب کے لیے ہو سکتی ہے اور تعصب، گو کہ وہ مذہبی باتوں میں کیوں نہ ہو نہایت برا اور خود مذہب کو نہایت نقصان پہنچانے والا ہے۔ غیر متعصب، مگر اپنے مذہب میں پختہ ہمیشہ سچا دانا دوست اپنے مذہب کا ہوتا ہے۔ اس کی خوبیوں اور نیکیوں کو پھیلاتا ہے، اس کے اصول کو دلائل اور براہین سے ثابت کرتا ہے مخالفوں اور معترضوں اور برا کہنے والوں کی باتوں کو ٹھنڈے دل سے سنتا ہے اور خود بھی اس کے دفعے پر مستعد ہوتا ہے اور اور لوگوں کو بھی اس کے دفعے کا موقع دیتا ہے۔

برخلاف اس کے متعصب۔ نادان دوست اپنے مذہب کا ہوتا ہے۔ وہ سراسر اپنی نادانی سے اپنے مذہب کو نقصان پہنچاتا ہے۔ پہلی بسم اللہ ایسی خصلت اختیار کرنے سے جو ہر عقل مند کے نزدیک نفرت کے قابل ہے اپنے مذہب کے حسن اخلاق اور اُس کے نتیجوں کی خوبی پر داغ لگاتا ہے۔ اپنے مذہب کی خوبیوں کے پھیلنے اور لوگوں کو اس کی طرف راغب کرنے کے بدلے الٹا اس کا ہارج قوی ہوتا ہے۔ اپنے تعصب کے سبب بداخلاق اور مغرور اور متقشف سخت دل ہو جاتا ہے اور ٹھیک ٹھیک اس آیت کریمہ **لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا من حولک** سے مخالفت صریح کرتا ہے۔ مذہب میں متعصب شخص دوسروں کے اعتراضوں کو جو اس کے مذہب پر ہیں سننا یا مشہور ہونا پسند نہیں کرتا اور اس سبب سے ضمناً وہ اس بات کا باعث ہوتا ہے کہ مخالفوں کے اعتراض بلا تحقیقات کیے اور بلا جواب دیئے باقی رہ جائیں۔ وہ اپنی نادانی سے تمام دنیا پر گویا یہ بات ظاہر کرتا ہے کہ اس کے مذہب کو مخالفوں کے اعتراضوں سے نہایت اندیشہ اور اس کے برہم ہو جانے کا خوف ہے۔ پس یہ تمام باتیں مذہب کی دوستی کی نہیں ہیں۔ بلکہ مخالفوں کی فتح یابی اور میدان جیت لینے کی ہیں۔

غرضیکہ تعصب خواہ دینی ہو یا دنیاوی باتوں میں، نہایت برا اور بہت سی خرابیوں کو پیدا کرنے والا ہے۔

مغرور و متکبر ہو جانا اور اپنے ہم جنسوں کو سوائے چند کے نہایت حقیر و ذلیل سمجھنا متعصب کا خاصہ ہوتا ہے۔

اس کے اصول کا مقتضا یہ ہوتا ہے کہ تمام دنیا کے لوگوں سے سوائے چند کے کنارہ گزیں ہو، مگر ایسا کر نہیں سکتا اور بمجبوری ہر ایک سے ملتا

ہے اور اوپرے دل سے اُن کا ادب اور اپنی جھوٹی نیازمندی بھی ظاہر کرتا ہے اور ایسا کرنے سے ایک اور خصلت نفاق اور کذب اور دغا بازی اور فریب ومکاری کی اپنے میں پیدا کرتا ہے۔ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس نے خود ہی تمام کمالات اور تمام خوبیاں اور خوشیاں حاصل کی ہوں، بلکہ ہمیشہ ایک قوم نے دوسری قوم سے فائدہ اٹھایا ہو۔ مگر متعصب شخص ان نعمتوں سے بدنصیب رہتا ہے۔

علم میں اس کو ترقی نہیں ہوتی، ہنر وفن میں اس کو دست گاہ نہیں ہوتی، دنیا کے حالات سے وہ ناواقف رہتا ہے، عجائبات قدرت سے محروم ہوتا ہے، حصول معاش اور دنیاوی عزت اور تمول، مثل تجارت وغیرہ کے وسیلے جاتے رہتے ہیں اور رفتہ رفتہ تمام دنیا کے انسانوں میں روز بروز ذلیل وخوار اور حقیر و ناچیز ہوتا جاتا ہے۔ اس کی مثال ایک ایسے جانور کی ہوتی ہے جو اپنے ریوڑ میں ملا رہتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کے اور ہم جنس کیا کر رہے ہیں، بلبل کیا چہچہاتی ہے اور قمری کیا غل مچاتی ہے، کیا بن رہا ہے اور مکھی کیا چن رہی ہے۔

وہ بجز کوڑے پر کی گھاس چرنے کے اور کچھ نہیں جانتا کہ باغ کیوں بنا ہے اور پھول کیوں کھلا ہے، نرگس کیا دیکھتی ہے اور انگور کی تاک کیا تاکتی ہے۔ تعصب میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ جب تک وہ نہیں جاتا کوئی ہنر و کمال اُس میں نہیں آتا۔ تربیت وشائستگی، تہذیب و انسانیت کا مطلق نشاں نہیں پایا جاتا اور جب کہ وہ مذہبی غلط نمانیکی کے پردے میں ظہور کرتا ہے تو اور بھی سم قاتل ہوتا ہے، کیونکہ مذہب سے اور تعصب سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ انسان کے خراب و برباد کرنے کے لیے شیطان کا سب سے بڑا داؤں تعصب کو مذہبی رنگت سے دل میں ڈالنا اور اس تاریکی کے فرشتے کو روشنی کا فرشتہ کر کر دکھلانا ہے۔

پس میری التجا اپنے بھائیوں سے یہ ہے کہ ہمارا خدا نہایت مہربان اور بہت بڑا منصف ہے اور سچا سچائی پسند کرنے والا ہے، وہ ہمارے دلوں کے بھید جانتا ہے، وہ ہماری نیتوں کو پہچانتا ہے۔ پس ہم کو اپنے مذہب میں نہایت سچائی سے پختہ رہنا، گر تعصب کو جو ایک بری خصلت ہے چھوڑنا چاہیے۔ تمام بنی نوع انساں ہمارے بھائی ہیں، ہم کو سب سے محبت اور سچا معاملہ رکھنا اور سب سے سچی دوستی اور سب کی سچی خیر خواہی کرنا ہمارا قدرتی فرض ہے۔ پس اسی کی ہم کو پیروی چاہیے۔

5.2.1 متن کی تدریس:

زیر نظر انشائیہ تعصب کے جائزے سے قبل مضمون نگار سرسید احمد خان کی بنیادی خصوصیات کا تذکرہ مناسب معلوم پڑتا ہے۔ سرسید احمد خان سے ہی دراصل اردو میں جدید اردو نثر کی بنیاد پڑتی ہے۔ اس سے قبل نثر میں سارا زور انشا پردازی اور مقفیٰ، مرصع اور مسجع اسلوب پر صرف کیا

جاتا تھا۔سرسید احمد خان نے اردو نثر کو سادگی، سلاست، افادیت، قومی صلاح وفلاح اور تجزیہ واستدلال سے روشناس کیا۔

سرسید اپنی تحریروں کے ذریعہ قوم کی ذہنی، اخلاقی اور نفسیاتی تربیت کرنا چاہتے تھے، انہوں نے اس کے پیش نظر رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ انشائیہ 'تعصب' بھی اسی رسالے میں جلد اول شمارہ اول یکم شوال 1287 ہجری بمطابق 1870 عیسوی میں شائع ہوا تھا۔اس انشائیہ کا مقصد قوم کو یہ نصیحت کرنا تھا کہ وہ تعصب سے دور رہیں۔تعصب کا مطلب رنگ، نسل، مذہب، علاقہ، قوم، جنس، ذات یا کسی بھی بنیاد پر کسی کی بیجا طرف داری یا جانب داری کرنا ہے۔سرسید کہتے ہیں:

''انسان کی بدترین خصلتوں میں سے تعصب بھی ایک بدترین خصلت ہے۔ یہ ایسی بدخصلت ہے کہ انسان کی تمام نیکیوں اور اس کی تمام خوبیوں کو غارت اور برباد کرتی ہے۔متعصب گو اپنی زبان سے نہ کہے، مگر اس کا طریقہ یہ بات جتلاتا ہے کہ عدل وانصاف کی خصلت جو عمدہ ترین خصائل انسانی ہے اس میں نہیں ہے۔''

مذکورہ اقتباس میں تعصب کو اس لیے ایک بدترین خصلت قرار دیا گیا ہے کیونکہ یہ خصلت انسانی نیکیوں کو تباہ کر دیتی ہے۔ظاہر سی بات ہے کہ انسان کسی کی جانب داری میں یہ فراموش کر دیتا ہے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔کیا اچھا ہے اور کیا برا۔وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ یہ میرا اپنا فرد ہے۔چنانچہ اس کے لیے وہ کسی بھی حد تک چلا جاتا ہے۔اور عدل وانصاف کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔سرسید کے نزدیک تعصب کی دوسری سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس کے سبب وہ اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتا اور مسلسل غلط راہ اختیار کر لیتا ہے۔تعصب کے سبب انسان ہر اس نیکی اور خوبی سے محروم رہتا ہے جو اس کے مخالف گروہ میں پائی جاتی ہیں۔سرسید احمد خان نے بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

''انسان قواعد قدرت کے مطابق مدنی الطبع پیدا ہوا ہے، وہ تنہا اپنی حوائج ضروری کو مہیا نہیں کر سکتا۔اس کو ہمیشہ مددگاروں اور معاونوں کی جو دوستی اور محبت سے ہاتھ آتے ہیں ضرورت ہوتی ہے۔مگر متعصب سبب اپنے تعصب کے تمام لوگوں سے منحرف اور بیزار رہتا ہے اور کسی کی دوستی اور محبت کی طرف بجز ان چند لوگوں کے جو اس کے ہم رائے ہیں مائل نہیں ہوتا۔''

مذکورہ اقتباس میں سرسید نے تعصب کی جڑیں ہی کاٹ دی ہیں۔انسان ایک سماجی جانور ہے جب کہ تعصب انسان کو تنہا کر دیتا ہے۔ انسان دوستی، محبت، باہمی تعاون اور اتحاد کے ذریعے بہت سے مشکل کام انجام دے سکتا ہے۔لیکن تعصب اس کو ان نعمتوں سے محروم کر دیتا ہے۔ سرسید کا یہ انشائیہ ان کی دیگر تحریروں کی طرح سادہ، سلیس، تجزیاتی اور استدلالی ہے۔سرسید کے یہاں تمثیلی طرز تحریر بھی نمایاں ہے۔سرسید احمد

خان تعصب کو عقل اور قواعد قدرت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ :

''امور متعلق تمدن و معاشرت میں جو باتیں زیادہ منفعت اور زیادہ آرام اور زیادہ لیاقت اور زیادہ عزت کی ہیں ان کو انسان اختیار کرے۔ مگر متعصب ان سب نعمتوں سے دور رہتا ہے۔''

متذکرہ بالا عبارت سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تعصب سے انسان کا خود اپنا ذاتی نقصان ہے۔ وہ تعصب کے سبب بہت سی نفع بخش چیزوں سے خود کو محروم کر دیتا ہے۔ سر سید احمد خان ایک تمثیل کے سہارے سے نہایت مؤثر اسلوب میں کہتے ہیں کہ ایک متعصب شخص چونکہ عقل، علم اور اخلاق تینوں معاملات میں تعصب برتتا ہے لہذا اس میں اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہتا ہے۔ مزید آگے اس کی وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''بہت سی قومیں ہیں جو اپنے تعصب کے باعث سے تمام باتوں میں، کیا اخلاق میں اور کیا علم و ہنر میں اور کیا فضل و دانش میں اور کیا تہذیب و شائستگی میں اور کیا جاہ و حشمت اور مال و دولت میں اعلیٰ درجے سے نہایت پست درجہ مذلت اور خواری کو پہنچ گئی ہیں۔ اور بہت سی قومیں ہیں جنہوں نے اپنی بے تعصبی سے ہر جگہ اور ہر قوم سے اچھی اچھی باتیں اخذ کیں اور ادنیٰ درجے سے ترقی کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجے پر پہنچ گئیں۔''

سر سید احمد خان بنیادی طور پر مصلحِ قوم تھے۔ لہٰذا ان کی نظر قوموں کے عروج و زوال پر نہایت گہری تھی۔ متذکرہ اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا میں وہی قومیں ترقی کرتی ہیں جو تعصب سے پاک ہو کر تمام اقوام عالم سے مستفیض ہوتی ہیں اور وہ قومیں زوال آمادہ ہو جاتی ہیں جو تعصب کے سبب کسی قوم سے اچھی چیزیں اخذ نہیں کرتیں۔ سر سید احمد خان نے بطور خاص مذہبی تعصب پر زور دیا ہے۔ ان کے خیال میں کچھ سادہ لوگ اور معصوم لوگ اپنے ہم مذہبیوں کی ہر بات کو نیکی پر محمول کرتے ہیں۔ جب کہ دوسرے مذہب سے وابستہ ہر چیز کو برائی تصور کرتے ہیں۔ سر سید کے نزدیک یہ بہت نقصان دہ ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''ہمارا مذہب اور مذہبی علوم اور دنیا اور دنیاوی علوم بالکل علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ پس بڑی نادانی ہے جو دنیاوی علوم اور فنون کے سیکھنے میں کسی قسم کے تعصب مذہبی کو کام میں لاویں۔''

مذکورہ بالا اقتباس میں سر سید کا استدلالی اسلوب اپنے شباب پر دکھائی دیتا ہے۔ ان کی دلیل ہے کہ مذہبی علوم اور دنیوی علوم بالکل الگ الگ چیزیں ہیں تو پھر ہمیں دنوی علوم غیر مذہب کے لوگوں سے حاصل کرنے میں کون سی چیز روکتی ہے۔ اس سے ہم خود اپنے مذہب کے ماننے والوں کا نقصان کرتے ہیں۔ سر سید کے نزدیک تعصب ایک ایسی سنگین اخلاقی خرابی ہے جو انسان کو مغرور، بد اخلاق اور سنگ دل بناتی ہے۔ مذہبی

تعصب کے سبب وہ اپنے مذہب پر دوسرے مذاہب کے اعتراضات کو سننا تک گوارہ نہیں کرتا۔ جس کی وجہ سے وہ اس بات سے ناواقف ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ اس کے مذہب کے بارے میں کیا خیالات رکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ ان کے اعتراضات کا مدلل جواب دینے کا اہل بھی نہیں ہوتا چنانچہ اس سے ان کے خود اپنے مذہب کا نقصان ہوتا ہے۔ آگے چل کر سرسید نے اپنے اسی استدلالی اسلوب کو جاری رکھتے ہوئے تعصب کی دیگر خامیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔ مثلاً متعصب اپنے گروہ کے علاوہ پوری انسانیت کو حقیر اور ذلیل گردانتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ اس سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے۔ لیکن چونکہ بہت سی چیزوں میں وہ دیگر گروہوں سے رابطہ قائم کیے بغیر ترقی نہیں کرسکتا لہٰذا وہ خواہی نخواہی جبراً ان سے ملتا جلتا ہے چنانچہ اس کے اس رویے سے اس کے اندر منافقت، کذب اور مکروفریب کا مادہ پیدا ہوجاتا ہے۔

سرسید احمد خان کے نزدیک تعصب کے نتیجے میں متعصب گروہ علم، دولت، عزت، شہرت، ترقی اور بہت سی نعمتوں سے محروم رہ جاتا ہے۔ چنانچہ وہ تمثیلی اسلوب میں لکھتے ہیں:

> ''اس کی مثال ایک ایسے جانور کی ہوتی ہے جو اپنے ریوڑ میں ملا رہتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کے اور ہم جنس کیا کر رہے ہیں، بلبل کیا چہچہاتی ہے اور قمری کیا غل مچاتی ہے۔ بیا کیا بن رہی اور مکھی کیا چن رہی ہے۔ وہ بجز کوڑے کی گھاس چرنے کے اور کچھ نہیں جانتا کہ باغ کیوں بنا ہے اور پھول کیوں کھلا ہے، نرگس کیا دیکھتی ہے اور انگور کی تاک کیا تاکتی ہے۔''

خلاصہ کلام یہ ہے کہ سرسید احمد خان تعصب کو بہت سی برائیوں کی جڑ تصور کرتے ہیں۔

5.3 سرگرمی:

خالی جگہیں پر کیجیے۔

1۔ انسان کی بدترین خصلتوں میں سے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بھی ایک بدترین خصلت ہے۔

2۔ تعصب میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ جب تک وہ نہیں جاتا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اُس میں نہیں آتا۔

3۔ تعصب خواہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میں، نہایت برا اور بہت سی خرابیوں کو پیدا کرنے والا ہے۔

4۔ سرسید احمد خان بنیادی طور پر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تھے۔

5۔ سرسید احمد خان نے بطور خاص ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پر زور دیا ہے۔

5.4 عمومی جائزہ:

تعصّب بدترین خصلت ہے یہ انسان کی تمام نیکیوں کو نگل جاتی ہے۔متعصب شخص کے اندر عدل وانصاف کی روح ختم ہو جاتی ہے۔اس کے اندر اپنی غلطیوں کو تسلیم کرنے کا مادہ بھی باقی نہیں رہتا۔متعصب انسان بہت سی اچھی چیزیں حاصل کرنے سے صرف اس لیے محروم رہ جاتا ہے کیونکہ وہ ان لوگوں کے پاس ہوتی ہیں جس سے وہ تعصب رکھتا ہے۔متعصب انسان بہت سے اچھے لوگوں کی دوستی، محبت اور صحبت سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔وہ بہت سی نئی تحقیقات اور نئے علوم وفنون سے تعصب کی بنیاد پر ناواقف رہتا ہے۔مذہبی تعصب بھی نہایت بری چیز ہے۔اس بنیاد پر بھی وہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کی ایجادات وانکشافات سے لاعلم رہتا ہے اور اس سے مستفیض نہیں ہوتا۔انسان تعصب کے سبب کنویں کا مینڈھک بن جاتا ہے۔سرسید احمد خان کی یہ تحریر سادہ وسلیس بھی ہے۔دلکش اور پر اثر بھی۔سرسید نے ان انشائیہ میں تعصب کے جتنے نقصانات ہیں ان سب کی طرف توجہ دلائی ہے۔ان کا طرز تحریر استدلالی اور تجزیاتی انداز یہاں بھی جلوہ گر ہے۔

5.5 فرہنگ:

الفاظ	:	معنی
تعصب	:	جانب داری
خصلت	:	عادت
عدل	:	انصاف
متنبہ	:	آگاہ
دیدہ ودانستہ	:	جان بوجھ کر
مدنی الطبع	:	شہری مزاج
معاون	:	مددگار
منفعت	:	فائدہ
معزز	:	عزت والا

بالطبع	:	فطری طور پر
مستحکم	:	مضبوط
براہین	:	دلائل، برہان کی جمع
متقشف	:	پھٹے پرانے حال والا، مزاج کا روکھا
دست گاہ	:	مقدور، قدرت، اختیار
قمری	:	کبوتر یا فاختہ کی قسم کا ایک پرندہ
سم قاتل	:	مہلک زہر
نفاق	:	دوگلا پن، چھپانا، منافقت کرنا
کذب	:	جھوٹ
نعوذ باللہ منہا	:	اللہ کی پناہ ہے اس بات سے

5.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات:

1۔ انشائیہ تعصب کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

2۔ انشائیہ تعصب کا تنقیدی جائزہ پیش کیجیے۔

3۔ انشائیہ تعصب کی نثر پر اظہار خیال کیجیے۔

4۔ تعصب سے انفرادی اور اجتماعی زندگی پر کس طرح کے اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔

5.7 مشقی سوالات:

1۔ بہت سی قوموں نے بے تعصبی سے کیا حاصل کیا ہے؟

2۔ غیر متعصب آدمی کیسا ہوتا ہے؟

3۔ سرسید نے متعصب آدمی کی کس سے مثال دی ہے؟

4۔ سرسید کی تحریروں کی خصوصیات کیا ہیں؟

5۔ تعصب سے کیا نقصان ہوتا ہے؟

5.8 مشقی سوالات کے جوابات جوابات سرگرمی:

1۔ بہت سی قوموں نے دوسری قدموں سے اچھی اچھی باتیں اخذ کیں اور ادنیٰ درجے سے اعلیٰ درجے پر پہنچ گئیں۔

2۔ غیر متعصب آدمی اپنے مذہب میں پختہ دانا دوست اپنے مذہب کا ہوتا ہے۔

3۔ سرسید کے نذدیک متعصب آدمی کی مثال ایسے جانور کی ہوتی ہے جو اپنے ریوڑ میں ملا رہتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کے اور ہم جنس کیا کر رہے ہیں۔

4۔ سرسید کی تحریریں سادہ، سلیس، تجزیاتی اور استدلالی ہیں۔

5۔ تعصب سے انسان کا خود اپنا ذاتی نقصان ہے۔ وہ تعصب کے سبب بہت سی نفع بخش چیزوں سے خود کو محروم کر دیتا ہے۔

1۔ تعصب

2۔ ہنر و کمال

3۔ دینی ہو یا دنیاوی باتوں

4۔ مصلح قوم

5۔ مذہبی تعصب

5.9 امدادی کتب:

امدادی کُتب Books Prescribed.

ا۔ انتخاب اُردو نثر) ۱۸۵۷ء ۱۹۲۰ء ایجوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ۔

۲۔ انتخاب اُردو نثر ۱۹۲۰ء کے بعد ای جوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ

Books Recommended.

۱۔	مختصر تاریخ ادب اُردو۔ڈاکٹر سید اعجاز حسین ترجمہ واضافے	ڈاکٹر سید محمد عقیل
۲۔	اُردو ادب میں طنز و مزاح۔	ڈاکٹر وزیر آغا
۳۔	اُردو ادب میں طنز و مزاح۔	غلام احمد فرقت کاکوروی
۴۔	رشید احمد صدیقی۔شخصیت اور فن۔	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
۵۔	اُردو انشائیہ۔	وزیر آغا
۶۔	انشائیہ کے فنی سروکار۔	ڈاکٹر احمد امتیاز
۷۔	انشائیہ کی بنیاد۔	ڈاکٹر سلیم اختر
۸۔	فنِ انشائیہ اور انشائیے۔	ڈاکٹر فرحت شمیم
۹۔	انشائیہ کے خدوخال	وزیر آغا
۱۰۔	انشائیہ کی بنیاد	ڈاکٹر سلیم اختر
۱۱۔	انشائیہ اردو ادب میں	ڈاکٹر انور سدید
۱۲۔	انشائیہ	ڈاکٹر آدم شیخ

سبق نمبر 6۔ کیسا غلط خیال ہے کہ زمانہ برسرتنزل ہے مولوی ذکا اللہ

ساخت

6.0 اغراض ومقاصد

6.1 تعارف

6.2 کیسا غلط خیال ہے کہ زمانہ برسرتنزل ہے۔

6.2.1 متن کی تدریس

6.3 سرگرمی

6.4 عمومی جائزہ

6.5 فرہنگ

6.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

6.7 مشقی سوالات

6.8 مشقی سوالات کے جوابات/جوابات سرگرمی

6.9 امدادی کتب

6.0 اغراض ومقاصد:

عزیز متعلم اس سبق کے مطالعے کے بعد اس قابل ہو جائیں گے کہ

انشائیہ ’کیسا غلط خیال ہے کہ زمانہ برسرتنزل ہے‘ سے متعارف ہوں گے۔

انشائیہ ’کیسا غلط خیال ہے کہ زمانہ برسرتنزل ہے‘ کے اغراض ومقاصد سے واقف ہوں گے۔

انشائیہ ’کیسا غلط خیال ہے کہ زمانہ برسرتنزل ہے‘ کے متن کے مشکل الفاظ کے معانی سے واقف ہوں گے۔

انشائیہ ’کیسا غلط خیال ہے کہ زمانہ برسرتنزل ہے‘ کے متن کی زبان واسلوب سے واقف ہوں گے۔

اس انشائیہ کی امتیازی خصوصیات سے واقف ہوں گے۔

6.1 تعارف:

مولوی ذکا اللہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔انہیں ریاضی، سائنس، جغرافیہ اور تاریخ سے گہرا لگاو تھا۔انھوں نے بہت سی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا۔ذکا اللہ کے اخبار ورسائل میں مختلف موضوعات پر مضامین لکھے۔ذکا اللہ کی تحریروں کا اسلوب سادہ اور آسان ہے۔ان کی زبان میں وہ چٹخارہ نہیں جو خاص دلی والوں کا ہوتا ہے۔ان میں ان کے موضوعات کا بھی دخل تھا جو نہایت سنجیدہ تر تحریر کے متقاضی تھے۔ذکا اللہ نے کو مضامین اور انشائیے لکھے ہیں ان میں ان کی نثر کا جوہر نمایاں نظر آتا ہے۔اس سبق میں ہم ان کا انشائیہ ’کیسا غلط خیال ہے کہ زمانہ برسرتنزل ہے‘ کا مطالعہ کریں گے۔اور یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ ان کی انشائیہ نگاری کی کیا خصوصیات ہیں۔

6.2 کیسا غلط خیال ہے کہ زمانہ برسرتنزل ہے۔

زمانہ کے تنزل سے ہماری مراد ساری دنیا کے تنزل سے ہے بحیثیت مجموعی ہے، کسی خاص شخص یا خاندان وملک وملت سے نہیں ہے۔ دنیا میں یہ بات بھی ہوتی آئی ہے کہ پیرانِ سال خوردہ کا ایک گروہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ صبح وشام زمانہ قدیم کی حمد وثنا کا وظیفہ پڑھتا ہے اور زمانہ حال پر تبرا بھیجتا ہے۔اپنے زمانہ کی وہ ایسی تصویر بناتا ہے جس کا ہر جزو اور عضو بدنما اور برا معلوم ہو اور زمانہ قدیم کی باتوں کا ایسا بت بناتا ہے کہ جس کی ہر ادا اور انداز دل رُبا ہو۔اس کے دل میں یقین ہوتا ہے کہ جو صاحب فضل وکمال اور جامع صفات جلال وجمال پہلے زمانہ میں گزرے ہیں، اب وہ خواب خیال میں بھی نظر نہیں آتے۔جو پیغمبران سخن ہو چکے ہیں ان کا نظیر وعدیل ہونا محالات سے ہے۔جو سرور سرا حسن آرا پہلے پیدا ہوئے ہیں ان کا اب پیدا ہونا ساز معدوم کی صدا ہے۔غرض وہ انسان کے ایسے دشمن ہو جاتے ہیں کہ وہ اس کی انسانیت ہی کو اپنی باتوں سے اُڑانا چاہتے ہیں۔رات دن یہی بڑبڑایا کرتے ہیں کہ اب دین ودنیا کی ساری خوبیاں ختم ہو گئیں جتنے کمال تھے ان کا زوال آ گیا، جتنے عیب تھے اُن کا کمال ہو

گیا۔نقص کی بیشی اور کمال کی کمی ہے۔ ہنروری، دست کاری، صناعی، خوش خلقی، نیک سیرتی مروت، فتوت جودت، سینا، حلم وحیا، استقامت اور استقلال غرض جتنی اعلا درجہ کی روحانی وعقلی خوبیاں تھیں سب کی سبب رخصت ہوگئیں۔ یہاں تک کہ پہلی خوبیاں بھی پہلی سی نہ رہیں۔ نہ پہلے سے اب رستم تہمتن قوی بازو، توانا، تنومند آدمی پیدا ہوتے ہیں۔ نہ آدمیوں کی عمریں پہلی سی ہوتی ہیں، نہ وہ قدیمی صحیح المزاجی ہے۔ یہاں تک کہ ان کے دماغ میں مالیخولیا ہوجاتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ موسموں میں بھی پہلا سا اعتدال نہیں رہا۔ نہ برسات میں وہ بارشیں ہیں، نہ موسم گرما میں وہ گرمی، نہ موسم سرما میں وہ سردی۔ سرے سے آفتاب کی حرارت اور زمین کی برودت ہی کم ہوگئی۔ پیداوار ارضی زمین کے اندر تحت الثری کو چلا جاتا ہے۔ آسمان اب اور ہی چکر کھا رہا ہے، ہندوستان میں ہندو بیٹھا ہوا بک رہا ہے۔ پہلے ست جنگ تھا اب کلجگ ہے۔ مسلمان بڑھا نک رہا ہے کہ یہ تیرہویں صدی ہے۔ پھر اپنے کلام کی تائید میں شعراء کے اشعار بزرگوں کے قول، مذہبی پیشین گوئیاں بیان ہورہی ہیں۔ کوئی بہ آواز میں یہ غزل حافظ پڑھ رہا ہے ؎

این چہ شوراست کہ دردور قمر می بینم

جب کوئی بڑے میاں اس اپنی بکواس سے میرے کان کھاتے ہیں تو میں بھی ان سے عرض کرتا ہوں کہ ہاں حضرت سچ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ پہلے زمانہ کی بعض خوبیوں اور کمالوں میں زوال آگیا ہے مگر اس کی جگہ زمانہ حال میں بہت سی خوبیاں اور فضل وہنر اور کمال پیدا ہوگئے ہیں اور بہت سے عیوب قدیم زمانہ کے اب مٹ گئے ہیں۔ اگر زمانہ کی ترقی اور تنزل کو میزان عدالت میں عقل مستقیم سے تولیے تو اس زمانہ کی ترقی کا پلڑا ایسا بھاری ہوگا کہ پہلے زمانے کی ساری خوبیاں اس کے پاسنگ میں بھی نہ چڑھ سکیں گئی جنھوں نے زمانہ کے حالات کی تحقیقات کو پایہ کمال تک پہنچایا ہے۔ ان کا قول یہ ہے کہ زمانے کی چال اس خط میں ہے۔ ابتدا بائیں طرف سے ہے اور ترقی کا منہ دائیں طرف یعنی زمانہ آگے بڑھ کے پیچھے کو ہٹتا ہے مگر اس ہٹنے میں بھی پہلے زمانہ سے بھی آگے بڑھا ہوا رہتا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پیچھے اس لیے ہٹتا ہے کہ اپنے میں زور پیدا کر کے آگے جست اور ذقند مارے۔ غرض دنیا روز بروز ترقی کرتی جاتی ہے۔ اس کی ترقی کی ہزاروں باتوں میں سے دو چارہ کا بیان بطور مشتے نمونہ از خروارے کرتا ہوں اور ان کے دلائل بھی ساتھ لکھے دیتا ہوں۔ شاید کوئی نوجوان یہ کہے کہ آپ سب باتوں کے بتانے میں کیوں بخل کرتے ہیں؟ وہ کسی روز کے لیے اٹھا رکھے ہیں؟ تو میں بڑے میاں کی طرف آنکھ سے اشارہ کر کے کہوں گا کہ آپ جانتے ہیں کہ میں کس سے مخاطب ہورہا ہوں۔ وہ دو چار باتیں ہی میری سن لیں اور آپے سے باہر نہ ہوں تو بہت غنیمت جانوں۔

جس بات پر بوڑھے ہماری بڑی جان کھاتے ہیں، وہ یہ ہے کہ آج کل کے زمانے میں جیسا آدمیوں کا اخلاق بگڑ گیا ہے ایسا پہلے کبھی

نہیں ہوا۔ پہلے لوگوں کے جیسے اخلاق اوضاع، اطوار اچھے تھے، ایسے ہی اب بُرے ہیں۔ یہ ان کی خود بد طینتی اور خبث باطنی ہے کہ ہم کو بد جانتے ہیں۔ زمانہ حال میں روز یہ سننے میں آتا ہے کہ آج یہ علم و ہنر میں ایجاد ہوئی کل وہ، مگر کبھی یہ نہیں سنا جاتا کہ قتل، چوری، راہزنی، قزاقی ٹھگی، ڈکیتی میں کوئی بات ایسی ایجاد ہوئی کہ جس میں متقدمین استاد نہ تھے۔ روزگار کا قاعدہ ہے کہ وہ گردش سے خالی نہیں رہتا۔ انقلاب اس کی شان سے ہے۔ ہر زمانے کے دستور کے موافق جرائم شمار ہوتے ہیں۔ اب اگر ارتکاب جرائم کا شمار زمانہ حال اور ماضی کا کیا جائے تو اس سے معلوم ہوگا ان کی تشدد اور سختی میں بہت نرمی ہوگئی ہے۔

پہلے زمانے کا یہ دستور تھا کہ جرائم نہایت وحشیانہ اور خارج از انسانیت ان سے سرزد ہوتے تھے۔ اگر زید اپنے ہمسائے یا کسی دوست عمرو سے باتوں ہی باتوں میں ناراض ہوگیا تو جھٹ پھٹا سا سراس کا اڑا دیا اور جی میں آئی تو دشمن کے گھر میں آگ لگا کر اس کے خان و مان کو بھسم کر دیا۔ مگر اب زمانے کا یہ طور نہیں رہا۔ اگر زید کی عمرو سے دشمنی ہوتی ہے تو دونوں منہ پر ایسے ملتے ہیں کہ گویا دونوں دوست ہیں۔ ہاں پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کا خاکہ اڑاتے ہیں اور ایک دوسرے کی نیک نامی میں بٹہ لگاتا ہے۔ اگر زید عمرو کا ایسا دشمن ہو جائے کہ اس کی جائداد کا مالک ہونا چاہے تو پہلے زمانے کے موافق یہ نہیں کرنے کا کہ خانہ جنگی کر کے عمرو کو مار ڈالے اور اس کی جائداد پر قبضہ کرے بلکہ کسی حکمت اور ترکیب سے عمرو کو قرض کے جال میں پھنسا دے گا اور اس کے سود کے ہیر پھیر میں لا کر نالش کرے اور جب عمرو روٹیوں کو محتاج ہو جاوے گا تو اس کے جیل خانے میں بھجوانے کے لیے کمبل خریدے گا اور جائداد قرق کرائے گا۔ اگر عمرو اس تذلیل کے ساتھ جینے کو مرنے سے بہتر سمجھے اور اپنے تئیں طپنچہ مار لے تو یہ اس کی حماقت ہے۔ دشمن کا اس میں کیا قصور ہے۔ اگر زمیندار کاشت کار کی سرکشی پر ناراض ہو جاتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ اس کا سر جوتیوں کے مارے پلپلا کر دے اور اس کے گھر کو اپنے گاؤں سے اکھڑوا کر پھینک دے، جورو بچوں سے اس کے بھیک منگوائے، اس کے منہ پر مرچوں کا توبڑا چڑھائے، اگاڑی پچھاڑی بندھوا کے گھاس کھلوائے مگر اس کے دق اور حیران کرنے اور مفلس بنانے کے لیے جھوٹی نالشیں کرے گا۔ غرض اس زمانے میں جب کوئی ایسے اشد اسباب دشمنی کے جمع ہو جاتے ہیں کہ ایک دوسرے کے قتل کرنے پر ہاتھ اٹھاتا ہے ورنہ پہلے زمانہ کی طرح بات بات پر قتل انسانی نہیں ہوتا۔ اب جو لوگ یہ شکایت کرتے ہیں کہ چھوٹ، فریب، دغا کا بازار گرم ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ جرائم کبیرہ و مقاتلت سے انسان نے اجتناب کیا ہے اور اس کے عوض میں ان جرائم صغیرہ دغا و فریب کو اختیار کیا ہے۔ اگر پہلے زید اور عمرو میں دشمنی ہوتی، تو دونوں میں سے ایک بھی نہ ہوتا یا ایک رہتا، دشمنی کا قصہ پاک ہوتا۔ انسان نے اخلاق میں ایسی ترقی کی ہے کہ وہ جان ستانی نہیں کرتا مگر دشمنی قائم رکھتا ہے اس لیے آپس میں بجائے تیغ بازی کے دغا بازیوں کی چال بازیاں ہوتی ہیں پس جو لوگ اس زمانے کی بداخلاقی کی دلیل بتلاتے ہیں وہ اس کے

حسن اخلاق کی ترقی کی شہادت دیتے ہیں۔ یہ چھوٹی چیزیں اس نے بڑے جرموں کے عوض اختیار کی ہیں۔ پس جب انسان کے بدگروہ میں یہ اخلاق کی ترقی ہو کہ اس نے جرائم کبیرہ سے توبہ کی تو نیک گروہوں کا ذکر ہے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ انسان نے اپنی طرز معاشرت میں کسی قدر ترقی کی ہے کہ وہ پہلے آدمیوں کو کبھی خواب میں بھی نہیں دکھائی دی۔ اول اس نے وہ تعصب جو اس کو غیر ملکوں کی چیزوں کے استعمال میں تھا چھوڑ دیا۔ خذ ما صفا ودع ما کدر پر عمل شروع کیا۔ آج کل کسی شریف کے در دولت پر جایئے اور اس کے ہر خانے کو دیکھیے تو اس سے یہ بات ظاہر ہو جائے گی۔ باغ کو دیکھیے تو ساری دنیا کے منتخب پھول اس کے باغ میں ہیں۔ لباس و پوشاک کو دیکھیے تو سر پر ٹوپی ترکی ہے تو جسم پر فرانس کا کوٹ ہے جس میں بوتام انگلستان کے لگے ہوئے ہیں۔ کسی چیز میں یہ تخصیص نہیں معلوم ہوتی کہ وہ اپنے ملک کی وضع کا متعصب ہے۔ کتب خانے کی سیر کیجیے تو ایک ہی طرح مختلف علوم وفنون و مذاہب مختلفہ کی کتابیں دھری ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو کسی فن کا زیادہ شوق ہے میز پر دسترخوان چنا دیکھیے تو طرح طرح کی نعمتیں موجود ہیں۔ اگر ایک پیالے میں گائے کا عمدہ مسکہ یا گھی دھرا ہے تو دوسرے پیالے میں فرانس کے رنگترے کا مربا اور تیسرے میں چین کا ادرک کا مربا دھرا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاف باطن، نیک طینت ساری دنیا کے آدمیوں کے ہاتھوں کو ایک سا سمجھتا ہے جن کی بنائی ہوئی چیزوں کے کھانے کو یکساں جانتا ہے۔ کسی انسان کے ہاتھوں پر نجاست کا احتمال کرنا خباثت قلبی کا اظہار کرنا ہے، پھر اگر گفتگو مذہب کی کیجیے تو یہ بھی نہیں معلوم ہوگا کہ کس مذہب کا آدمی ہے۔ جس تعظیم وتکریم ادب سے وہ اپنے مذہب کا ذکر کرے گا اسی طرح اور وں کے مذہب کا جو کلمات تعظیم حضرت عیسیٰ کی نسبت زبان پر آویں گے وہی بدھ اور کنفیوشش کی نسبت غرض اس کے تمام اوضاع واطوار اور طرز معاشرت سے یہ معلوم ہوگا کہ وہ سارے بنی نوع انسان کو اپنا بھائی سمجھتا ہے اور اس کو کسی کے ساتھ نفرت نہیں ہے۔ نہ وہ کسی کو کافر کہتا ہے نہ کسی کو مکش بتاتا ہے۔ غرض کوئی برا لفظ اس کی زبان پر نہیں آتا۔ بھلا یہ شرافت کا برتاؤ پہلے انسانوں کے ذہن میں کب تھا۔ پہلی بسم اللہ تو ان کی یہ ہوتی تھی کہ اپنے سوا سارے انسانوں کا نام اول سے ایسا رکھتے تھے کہ جس سے خباثت باطنی ظاہر ہوتی تھی۔

اب مذہب پر خیال کیجیے کہ پہلے اس کے کیا اصول تھے اب کیا ہیں۔ جن باتوں کو متقدمین یہ جانتے تھے کہ ان سے انسان ملکی صفات بن کر فرشتہ ہوتا ہے وہ حقیقت میں ان کو بہائم سیرت بنا کر وحشی جانور بناتی تھیں۔ انھوں نے خلاف فطرات (نیچر) تزکیہ نفس کے لیے جو چلہ کشی اور خلوت نشینی ومجاہدات وکم خوابی، بے خورا کی اور استغراق ذات اور فنا فی الفنا ہونا مقرر کیا تھا، اس کا نتیجہ سوا اس کے کہ انسان کے دماغ میں خلل پیدا ہوا اور کیا تھا۔ دینا اور مافیہا سے قطع تعلق کرنا سوا اس کے کہ انسان کو جانور بنا دے اور کچھ نہ تھا۔ اب اس کی جگہ یہ اصول قائم ہوئے ہیں کہ انسان اپنے دل ودماغ کو کام میں لا کر دنیا کی ساری چیزوں سے جو نفع اسے اٹھ سکتا ہے اٹھائے، یہی اس کی فرشتہ منشی ہے اس کا قطع تعلق کرنا بہائم

سیرتی ہے۔ایک آدمی جوگی بن کر پہاڑ کی چوٹی پر جا بیٹھے تو اس سے کوئی نفع انسانیت کو نہیں پہنچے گا۔

اب گورنمنٹ کی طرز پر خیال کیجیے کہ پہلے بادشاہ معاذ اللہ دوسرا خدا سمجھا جاتا تھا۔اس کی فضول خرچیوں کے لیے ہزاروں غریبوں کا گلا کاٹا جاتا تھا۔اب بادشاہ حقیقت میں کاٹ کی پتلی ہوتی ہے جو سارے کام فرمانروائی کے لیے چلاتا ہے اور اس کے عوض کچھ رعایا سے اپنی ذاتی فضول خرچی کے لیے نہیں مانگتا اور مزدوروں کی طرح اپنے کام کی مزدوری پاتا ہے گو پہلے ملکوں میں بھی بعض شخص محبت قومی اور ملکی میں نامور گزرے ہیں اور ان کے حالات نہایت مبالغہ کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔وہ کتنے ہیں؟ انگلیوں کے پوروں پر گنے جاتے ہیں اور یہ کون لوگ تھے؟ وہی جن کے ہاتھوں میں عنان سلطنت تھی۔کبھی یہ نہیں ہوا کہ سارے ملک کے ملک کو یا قوم کی قوم کو جوش و ولولہ محبت پیدا ہوا ہو۔اب دیکھتے ہیں کہ ملک کے ملک ایسے ہیں کہ ہر ادنی واعلیٰ، سقہ، دھوبی بھنگی اردل سے ارذل آدمی محبت قومی پر مرتا ہے اور اپنے ملک پر جان خدا کرنے کو فخر جانتا ہے۔

علم وہنر کی ترقی کا کیا ذکر کروں، ریل، تار ایسے ہیں کہ عقل کے اندھوں کو بھی دکھائی دیتے ہیں۔یہ چیزیں کبھی پہلے متقدمین کے خیال میں گزری تھیں؟ یہ بات اور ہے کہ کوئی بھنگ کے نشے میں کہہ دے کہ پہلے آکاش پر ریل چلتی تھی اور تخت جمشید پر ریل کی تصویر بنی ہوئی ہے۔علم طب کو دیکھیے کہ پہلے کسی زمانے میں انسان کو اعضاء انسانی بنانے میں یہ ید طولی پیدا ہوا تھا؟ اب ٹانگ ٹوٹے تو لنگڑوں کی ٹانگیں وہ بنائی جاتی ہیں کہ بازاروں میں دوڑ کی شرط باندھ کر دوڑتے ہیں۔پوپلوں کے دانت وہ بنائے جاتے ہیں کہ جس وقت وہ ان کو کمانی پر چڑھا کر منہ میں لگائیں تو یہ معلوم ہو کہ ابھی دودھ کے دانت ٹوٹ کے دانت نکلے ہیں اور ہزاروں چیزیں علم طب میں ایسی ایجاد ہوئی ہیں کہ ہزاروں بچے ضعیف الخلقت ان کی بدولت زندہ رہتے ہیں۔انھیں قدرتی ضعیف البنیوں کو دیکھ کر ضعیف العقل یہ کہتے ہیں کہ پہلے جیسے آدمی قوی اور توانا نہیں پیدا ہوتے یہ نہیں سمجھتے کہ پہلے اسباب ان ضعیفوں کے زندہ رہنے کے کہاں تھے۔قومی آدمی زندہ رہ سکتے تھے۔جو اسباب تنزل کے زمانے کے وہ بتلاتے ہیں، اس کی ترقی کی بدولت پیدا ہوئے ہیں۔یہ کہتے ہیں۔

خلاصہ

زمانہ حال کی بہتری اور زمانہ قدیم کی ابتری کا مضمون ایسا ہے کہ وہ ایک بڑی کتاب میں بھی ختم نہیں ہوسکتا۔اس بارسے یہ چند سطریں میں نے لکھ دیں۔جو عاقل ہیں وہ سمجھ جائیں گے کہ دنیا کے کمالات کو کمال اور نقصوں کو زوال آجاتا ہے۔دنیا ایام طفلی کی کم عقلی سے نکلی جاتی ہے اور شباب اس کا آتا جاتا ہے اور سب طرح سے ترقی کرتی جاتی ہے۔ترقی کا لفظ ایسا وسیع المعنی ہے کہ اس کا اطلاق ہر چیز کے بڑھنے پر ہوتا ہے خواہ

درخت ہوخواہ بچہ ہومگر ہم ترقی کے ایک معنی اور یہ لیتے ہیں کہ کسی چیز کی ترقی یہ ہے کہ وہ اپنی جنس سے نکل کر غیر جنس ہو جاوے۔ انڈے کی یہ ترقی ہے کہ وہ انڈا نہ رہے، بچہ مرغ بن جاوے۔ پس یہ معنی ترقی کے ٹھہرا کو ملک کی ترقی کا حال اور اس کے اسباب بیان کریں گے۔ اب بالفعل ایک سرسری طور پر اپنے ملک والوں کو دکھایا ہے کہ وہ رات دن جو رویا کرتے ہیں کہ زمانے کا تنزل ہے اور سازی دین و دنیا کی خوبیاں اور برکتیں خاک میں مل جاتی ہیں غلط میں دنیا آج کل بہت ترقی پر ہے، ساری دنیا پر قیاس وہ اپنا سانہ کریں، ان کا گھر ان کا ملک ساری دنیا میں ہے۔

6.2.1 متن کی تدریس:

مولوی ذکاء اللہ نے اپنے عہد کے متعدد رسائل و جرائد میں مضامین تحریر کیے۔ جن میں تہذیب الاخلاق، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مخزن (لاہور)، زمانہ (کانپور)، حسن (حیدرآباد)، شمس (کلکتہ)، صبحِ بہار (میسور) اور ادیب (فیروزآباد) ومعارف (علی گڑھ) قابل ذکر ہیں۔ ان کے مضامین موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے متنوع ہیں۔ بعض مضامین ادبی نوعیت کے حامل ہیں تو بعض تاریخی موضوعات سے متعلق ہیں۔ کچھ مضامین سوال و جواب کے ذیل میں آتے ہیں، جبکہ بعض میں انشائیہ کا رنگ نمایاں ہے میں انشائیے بھی ہیں اور بعض فلسفیانہ مباحث پر مشتمل ہیں۔ اسی طرح ان کی تحریروں میں تبصرے اور تقریظیں بھی شامل ہیں۔

مولوی ذکاء اللہ کے مضامین میں علم اور ادب کا ایسا امتزاج پایا جاتا ہے جس میں خشکی کے بجائے شگفتگی، استدلال کے بجائے دل آویزی اور معلومات کے ساتھ ساتھ تخیل کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ ان کے انشائیے معلومات، تمثیل، تشبیہ، استعارات اور ظرافت سے معمور ہیں۔ وہ ایک خشک اور بوجھل علمی مسئلے کو بھی ایسے پیرایۂ بیان میں پیش کرنے کا ہنر رکھتے ہیں کہ دلچسپی ابتدا سے انتہا تک قائم رہتی ہے۔ ان کا انشائیہ ''کیسا غلط خیال ہے کہ زمانہ برسرِ تنزل ہے'' ان کی اسی فکری گہرائی اور ظریفانہ طرز اظہار کا آئینہ دار ہے۔

انشائیے کا بنیادی موضوع گزشتہ زمانے کی برتری اور موجودہ زمانے کے زوال کا وہ عام تصور ہے جو انسانی ذہن میں مختلف ادوار میں پیدا ہوتا رہا ہے۔ مولوی ذکاء اللہ نے اس انشائیے میں اس خیال کی تردید کی ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ دنیا مسلسل زوال پذیر ہوتی جارہی ہے اور گزشتہ عہد کی ہر چیز موجودہ زمانے کی ہر چیز سے بہتر تھی۔ وہ اس امر کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ ہر عہد میں ایک ایسا طبقہ ضرور موجود رہا ہے جو اپنے زمانے کو بگاڑ اور زوال کا زمانہ سمجھتا اور اگلے عہد کو کمال و خوبی کا نمونہ قرار دیتا ہے۔ معمر افراد کو وہ اسی ذہنی رویے کا مظہر بناتے ہیں جو ہر نئی چیز کو شک و شبہے کی نگاہ سے دیکھتے اور قدیم طور طریقوں کو حسن و کمال کا پیکر سمجھتے ہیں۔ مولوی ذکاء اللہ نہایت ظریفانہ انداز میں اس طبقے کی نفسیات

کی تصویر کھینچتے ہیں جو صبح وشام ''زمانۂ قدیم کی حمد وثنا'' اور ''زمانۂ حال پر تبرا'' کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اپنے زمانہ کی وہ ایسی تصویر بناتا ہے جس کا ہر جزو اور عضو بدنما اور برا معلوم ہو اور زمانۂ قدیم کی باتوں کا ایسا بت بناتا ہے کہ جس کی ہر ادا اور انداز دل رُبا ہو۔ اس کے دل میں یقین ہوتا ہے کہ جو صاحبِ فضل وکمال اور جامعِ صفاتِ جلال و جمال پہلے زمانہ میں گزرے ہیں، اب وہ خواب وخیال میں بھی نظر نہیں آتے۔ جو پیغمبرانِ سخن ہو چکے ہیں، ان کا نظیر و عدیل ہونا محالات سے ہے۔ جو سرورِ سرِ احسن آرا پہلے پیدا ہوئے ہیں، ان کا اب پیدا ہونا سازِ معدوم کی صدا ہے۔''

مولوی ذکاء اللہ اپنے تصورِ ترقی کی تائید میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعدد شواہد پیش کرتے ہیں اور اس امر کو واضح کرتے ہیں کہ اگر زمانۂ قدیم اور عہدِ حاضر کے ترقی وتنزل کو میزانِ عدالت میں رکھ کر عقلِ سلیم کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو موجودہ زمانے کی ترقی کا پلڑا بہ نسبت زمانۂ قدیم کہیں زیادہ بھاری دکھائی دے گا۔ وہ اس سلسلے میں قدامت پرست لوگوں کے اس اعتراض کا بھی جواب دیتے ہیں کہ موجودہ زمانے کے انسانوں کے اخلاق اگلے زمانوں کے انسانوں کی نسبت بہت پست اور خراب ہو گئے ہیں۔ انشائیہ نگار کے نزدیک یہ خیال حقیقت پر مبنی نہیں۔ ان کے نزدیک موجودہ عہد میں برائیوں کی مقدار میں کوئی غیر معمولی اضافہ نہیں ہوا، بلکہ ان کی ہیئت اور نوعیت میں تغیر واقع ہو گیا ہے۔ قدیم زمانے میں انسان اپنی عداوت اور دشمنی کا اظہار قتل وغارت، خانہ سوزی، لوٹ مار اور جسمانی تشدد کے ذریعے کرتا تھا، جب کہ موجودہ معاشرے میں دشمنی نے نسبتاً مہذب اور پوشیدہ صورت اختیار کر لی ہے۔ اب انسان عموماً اپنے مخالف کو قتل کرنے کے بجائے قانونی، معاشی اور معاشرتی تدبیروں کے ذریعے زیر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ انشائیہ نگار زید وعمرو کی مثال کے ذریعے اس فرق کو نہایت دلچسپ پیرایے میں واضح کرتے ہیں کہ زمانہ قدیم میں معمولی سی رنجش بھی قتل وخون ریزی کا پیش خیمہ بن سکتی تھی، جب کہ موجودہ عہد میں اسی نوع کی عداوت عموماً فریب، چال بازی، قرض، مقدمہ بازی اور معاشی دباؤ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ چنانچہ جن امور کو موجودہ زمانے کی اخلاقی پستی کی علامت سمجھا جاتا ہے، انشائیہ نگار کی نظر میں وہ دراصل بڑے اور سنگین جرائم کے بجائے نسبتاً چھوٹے جرائم اختیار کرنے کی علامت ہیں۔ انسان نے قتل وقتال سے گریز کیا تو اس کی جگہ دغا وفریب اور حیلہ وتلبیس کی راہیں اختیار کر لیں۔ بادی النظر میں انشائیہ نگار کا یہ استدلال دلچسپ ضرور ہے لیکن قطعی نہیں کہ قتل کی جگہ فریب اور خون ریزی کی جگہ مقدمہ بازی کو اخلاقی ترقی کی علامت قرار دیا جائے، جرم کی صرف نوعیت بدل جانے کو لازماً اخلاقی ترقی نہیں کہا جا سکتا؛ لیکن اس کے پسِ پردہ ایک گہرا سماجی مشاہدہ کارفرما ہے۔ وہ دراصل اخلاقیات کو محض رسوم وعادات اور ظاہری اطوار کے پیمانے سے پرکھنے کے بجائے انسانی معاشرے میں ظلم، تشدد، جبر اور تعدی کے مجموعی رجحان کو سامنے رکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی عہد کی اخلاقی حالت

کا صحیح اندازہ اس بات سے ہوگا کہ انسان کس حد تک اپنی وحشت، انتقام اور تشدد پر قابو پانے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو انسانوں نے اگرچہ جرائم کا مکمل خاتمہ نہیں کیا، تاہم ان کے اظہار اور ارتکاب کی صورتوں میں ضرور تبدیلی پیدا کی ہے۔

مولوی ذکاء اللہ کے تصورِ ترقی کا ایک پہلو مختلف اقوام کے باہمی اختلاط اور ایک دوسرے کے علوم وفنون اور مفید اشیا سے استفادہ کا رجحان ہے۔ ان کے نزدیک موجودہ زمانے کی ترقی کی علامت میں سے یہ ہے کہ انسان نے کسی حد تک قومی تنگ نظری اور محدود عصبیت کے حصار سے باہر نکل کر دنیا کی مختلف اقوام کے مفید تجربات اور کارآمد اشیا کو قبول کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ لباس، خوراک، باغبانی، کتب خانوں اور دیگر اشیا کی مثالیں پیش کر کے ثابت کرتے ہیں کہ موجودہ انسان محض اس بنا پر کسی شے کو رد نہیں کرتا کہ وہ کسی دوسری قوم یا ملک سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر کوئی چیز مفید اور کارآمد ہے تو اسے اختیار کرنے میں وہ عار محسوس نہیں کرتا۔ "خُذْ ما صَفا وَدَعْ ما کَدِر" کے اصول کے ذریعے انشائیہ نگار کے نزدیک عقل کا تقاضا یہی ہے کہ انسان اقوامِ عالم کے تجربات سے فائدہ اٹھائے، مفید کو قبول کرے اور غیر مفید کو بے دریغ چھوڑ دے۔ اور یہ وسیع النظری اور علمی کشادگی گزشتہ زمانوں میں اس درجے میں موجود نہ تھی، جس قدر عہدِ حاضر میں دکھائی دیتی ہے۔ اسی وسیع النظری کا ایک اور مظہر مذہبی رواداری ہے، جسے انشائیہ نگار عہدِ حاضر کی ترقی کی علامت قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک وہ انسان زیادہ ترقی یافتہ اور صاحبِ بصیرت ہے جو اپنے مذہب سے وابستگی رکھنے کے باوجود دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ احترام و رواداری کا برتاؤ کرے۔

انشائیہ میں مذہب اور روحانیت کے قدیم تصورات پر بحث کی گئی ہے۔ مولوی ذکاء اللہ ان مجاہدات اور ریاضتوں پر نقد کرتے ہیں جن میں انسان دنیا سے کنارہ کش ہو کر خلوت نشینی، کم خوابی، کم خوری اور ترکِ دنیا کو کمالِ انسانیت سمجھتا تھا۔ ان کے نزدیک انسان کی فرشتہ صفتی دنیا سے بے تعلقی اور فرار میں نہیں، بلکہ دنیا کو اپنی عقل و تدبیر، علم و عمل اور صلاحیتوں کے ذریعے بہتر بنانے میں ہے۔ وہ اس شخص کو زیادہ قابلِ قدر اور نوعِ انسانی کے لیے زیادہ مفید گردانتے ہیں جو اپنی علمی و عملی قوتوں کو بروئے کار لا کر معاشرے کی فلاح و بہبود میں حصہ لیتا ہے، بہ نسبت اس شخص کے جو دنیاوی معاملات سے کنارہ کش ہو کر گوشہ عزلت میں بیٹھ جائے۔ گویا ان کے نزدیک حقیقی زہد دنیا سے فرار کا نام نہیں بلکہ دنیا میں رہ کر اسے سنوارنے اور انسانی زندگی کو زیادہ مفید، بامقصد اور آسودہ بنانے کا نام ہے۔

حکومت اور سیاست کے ضمن میں بھی وہ قدیم اور جدید نظام ہائے حکومت کا تقابل کرتے ہیں۔ قدیم طرزِ بادشاہت میں فرمانروا کو اس قدر مقتدر اور مقدس تصور کیا جاتا تھا کہ اس کی ذاتی خواہشات، عیش و عشرت اور تعیّشات کی تکمیل کے لیے رعایا سے بے دریغ مال وصول کیا جاتا اور عوامی مفاد کو حکمران کی شخصی آسائشوں پر قربان کر دیا جاتا تھا۔ اس کے برعکس اب حکمران کے منصب کو مطلق اقتدار کے بجائے ذمہ داری اور

خدمت سے وابستہ کر دیا ہے۔ اب فرمانروا یا حاکم کو ریاست کا مالک نہیں بلکہ اس کے انتظام وانصرام کا ذمہ دار سمجھا جانے لگا ہے۔ اگر چہ ان کا یہ تصور اپنے عہد کے سیاسی ماحول سے متعلق ہے، تاہم اس میں جدید سیاسی شعور کی ہلکی سی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ اسی تناظر میں وہ حبِ وطنی اور قومی شعور کی ترقی کو بھی عصرِ حاضر کا کمال قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک قدیم زمانے میں وطن دوستی کا جذبہ عموماً بادشاہوں، امراء یا چند ممتاز اشخاص تک محدود رہتا تھا، لیکن جدید عہد میں یہ احساس معاشرے کے وسیع تر طبقات میں سرایت کر گیا ہے۔ کسان ہو یا مزدور، سپاہی ہو یا عام شہری، ہر شخص اپنے وطن سے وابستگی اور اس کی محبت کو باعثِ افتخار سمجھنے لگا ہے۔

انشائیہ میں علم وفنون اور بالخصوص سائنسی ترقی کو بھی زمانۂ حال کی برتری کے ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ انشائیہ نگار ان لوگوں کے طرزِ فکر پر نقد کرتے ہیں جو جدید سائنسی ترقی کے باوجود ماضی کو برتر سمجھتے ہیں۔ وہ ریل، تار، علمِ طب اور مصنوعی اعضا جیسی متعدد ایجادات کا حوالہ دے کر واضح کرتے ہیں کہ جدید انسان نے ایسے حیرت انگیز وسائل ایجاد کر لیے ہیں جن کا تصور بھی قدیم انسان کے لیے دشوار تھا۔ خصوصاً طب کے میدان میں مصنوعی ٹانگوں، مصنوعی دانتوں اور دیگر طبی اختراعات اس امر کی شاہد ہیں کہ انسان نے اپنی علمی اور سائنسی کاوشوں کے ذریعے فطرت کے بہت سے مسائل پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں وہ اس خیال کی بھی تردید کرتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں انسان پہلے کی نسبت جسمانی طور پر کمزور اور ضعیف ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر آج بعض کمزور اور نحیف افراد زندہ رہتے ہیں تو اسے انسانی تنزل کی علامت قرار دینا درست نہیں؛ بلکہ یہ جدید طب اور سائنس کی ترقی کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے۔ قدیم زمانے میں ممکن ہے ایسے افراد اپنی کمزوری کے باعث کم عمری ہی میں موت کا شکار ہو جاتے ہوں، اس لیے ان کی کمزوری معاشرے کے سامنے نمایاں نہ ہو پاتی تھی۔ طبی ترقی نے انہیں علاج، نگہداشت اور بقا کے ایسے مواقع فراہم کر دیے ہیں جن سے وہ سابقہ ادوار میں محروم تھے۔

مختصراً، انشائیہ نگار کا مقصد ماضی کی تمام خوبیوں اور کمالات سے انکار کرنا نہیں، بلکہ ماضی پرستی کے غیر منطقی رویے کی تردید ہے۔ وہ اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ بعض قدیم خوبیاں اور کمالات زمانے کے ساتھ کم ہو گئے ہیں، اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس میں شک نہیں کہ پہلے زمانہ کی بعض خوبیوں اور کمالوں میں زوال آ گیا ہے، مگر اس کی جگہ زمانہ؟ حال میں بہت سی خوبیاں اور فضل و ہنر اور کمال پیدا ہو گئے ہیں اور بہت سے عیوبِ قدیم زمانہ کے اب مٹ گئے ہیں۔''

ان کے نزدیک زمانہ مسلسل تغیر پذیر ہے۔ بعض قدیم خوبیاں زائل ہوتی ہیں تو ان کی جگہ نئی خوبیاں جنم لیتی ہیں؛ بعض قدیم نقائص باقی رہتے ہیں تو نئے نقائص بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ کسی ایک عہد کو کلیتاً ''زوال پذیر'' یا ''ترقی یافتہ'' قرار دینا عقلی اعتبار سے درست نہیں۔ علم و

فن، سائنس وطب، ذرائعِ نقل وحمل ومواصلات اور معاشرتی زندگی میں ہونے والی تبدیلیاں اس امر کی شاہد ہیں کہ زمانہ محض تنزل کی طرف گامزن نہیں بلکہ ترقی کے نئے مدارج بھی طے کررہا ہے۔ زمانے کا سفر مسلسل جاری ہے؛ اس میں زوال بھی ہے اور ارتقا بھی، فقدان بھی ہے اور حصول بھی۔ اس لیے زمانے کو محض تنزل کی طرف گامزن سمجھنا عقل کے خلاف ہے، زمانے کی قدر و قیمت کا تعین اس کے نتائج، فوائد اور انسانی زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔

6.3 سرگرمی: آواپنی معلومات جانچیں

1۔ مولوی ذکااللہ کے مضامین شب خون میں شائع ہوتے تھے۔ (صحیح/غلط)

2۔ مولوی ذکااللہ کے نزدیک موجودہ زمانے کے انسانوں کے اخلاق اگلے زمانوں کے انسانوں کی نسبت بہت پست اور خراب ہوگئے ہیں۔ (صحیح/غلط)

3۔ مولوی ذکااللہ کے نزدیک وہ انسان زیادہ ترقی یافتہ اور صاحبِ بصیرت ہے جو اپنے مذہب سے وابستگی رکھنے کے باوجود دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ احترام ورواداری کا برتاؤ کرے۔ (صحیح/غلط)

4۔ مولوی ذکااللہ کے نزدیک عقل کا تقاضا یہی ہے کہ انسان اقوامِ عالم کے تجربات سے فائدہ اٹھائے، مفید کو قبول کرے اور غیر مفید کو بے دریغ چھوڑ دے۔ (صحیح/غلط)

5۔ مولوی ذکااللہ کے نزدیک انسان کی فرشتہ صفتی دنیا سے بے تعلقی اور فرار میں نہیں، بلکہ دنیا کو اپنی عقل وتدبیر، علم وعمل اور صلاحیتوں کے ذریعے بہتر بنانے میں ہے۔ (صحیح/غلط)

6.4 عمومی جائزہ:

مولوی ذکااللہ نے ''کیسا غلط خیال ہے کہ زمانہ برسرِ تنزل ہے'' میں اس عام خیال کی تردید کی ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ دنیا مسلسل زوال پذیر ہوتی جارہی ہے اور گزشتہ عہد کی ہر چیز موجودہ زمانے کی ہر چیز سے بہتر تھی۔ وہ اس امر کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ ہر عہد میں ایک ایسا طبقہ ضرور موجود رہا ہے جو اپنے عہد کو زوال کا زمانہ سمجھتا اور گزشتہ عہد کو کمال وخوبی کا نمونہ قرار دیتا ہے۔ مصنف نے اس طبقے کے رویے پر طنز

یہ انداز میں تنقید کی ہے۔ وہ دلائل اور روزمرہ زندگی کی مثالوں سے واضح کرتے ہیں کہ اگر چہ بعض قدیم خوبیاں کم ہوئی ہیں لیکن موجودہ دور میں علم و ہنر، طب، سائنس، معاشرت، انسانی اخلاق، مذہبی رواداری اور قومی شعور کے میدان میں بے شمار ترقی ہوئی ہے۔

مصنف نے انشائیہ میں مذہب اور روحانیت کے قدیم تصورات پر بحث کی ہے۔ ان مجاہدات اور ریاضتوں پر تنقید کرتے ہیں جن میں انسان دنیا سے کنارہ کش ہو کر خلوت نشینی، کم خوابی اور ترک دنیا کو کمال انسانیت سمجھتا تھا۔ ان کے نزدیک انسان کی فرشتہ صفتی دنیا سے بے تعلقی اور فرار میں نہیں، بلکہ دنیا کو اپنی عقل و تدبیر، علم و عمل اور صلاحیتوں کے ذریعے بہتر بنانے میں ہے۔ اس کے علاوہ حکومت اور سیاست کے ضمن میں بھی وہ قدیم اور جدید نظام حکومت کا تقابل کرتے ہیں۔ ان کے مطابق اب فرمانروا یا حاکم کو ریاست کا مالک نہیں بلکہ اس کے انتظام و انصرام کا ذمہ دار سمجھا جانے لگا ہے۔ ان کا یہ تصور اپنے عہد کے سیاسی ماحول سے متعلق ہے تاہم اس میں جدید سیاسی شعور کی ہلکی سی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ اسی تناظر میں وہ حب وطنی اور قومی شعور کی ترقی کو عصر حاضر کا ایک اہم کمال قرار دیتے ہیں۔

اس انشائیے میں مصنف نے ماضی پرستی کے بجائے عقل، تجربے اور حقیقت پسندانہ سوچ کو اہمیت دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ زمانہ مسلسل تغیر پذیر ہے۔ بعض قدیم خوبیاں زائل ہوتی ہیں تو ان کی جگہ نئی خوبیاں جنم لیتی ہیں۔ چنانچہ کسی ایک عہد کو زوال پذیر یا ترقی یافتہ قرار دینا عقلی اعتبار سے درست نہیں۔ علم و فن، سائنس و طب، نئی ٹکنالوجی اور معاشرتی زندگی میں ہونے والی تبدیلیاں اس امر کی شاہد ہیں کہ زمانہ محض تنزل کی طرف گامزن نہیں بلکہ ترقی کے نئے مدراج بھی طے کر رہا ہے۔ مجموعی طور پر یہ انشائیہ ترقی پسند فکر، عقلی استدلال، حقیقت پسندانہ اور طنز و مزاح کا عمدہ نمونہ ہے۔

6.5 فرہنگ:

(الفاظ)	:	(معنی)
تنزل	:	زوال
نظیر و عدیل	:	مانند، ہم معنی
معدوم	:	غیر موجود، غائب
صناعی	:	دستکاری، کاریگری

خوش خلقی	:	حسن اخلاق، نیک سیرت
فتوت	:	ایثار، سخاوت
جودت	:	لیاقت، خوبی
حلم	:	تحمل، نرم دل
استقلال	:	ثابت قدم
برودت	:	ٹھنڈک، خنکی
تحت الثری	:	زمین کا سب سے نیچے کا طبقہ
میزان	:	انصاف، اعتدال
جست	:	چھلانگ
ذقند	:	اچھل کود، چھلانگ
اوضاع	:	عادات، اخلاق طور طریقے
خبث	:	لغزش، خباثت، بدخواہی
قزاقی	:	لوٹ مار، غارت گری
ارتکاب	:	کسی کام کو شروع کرنا، عمل میں لانا
اجتناب	:	پرہیز، کنارہ کشی
احتمال	:	امکان، گنجائش
خباثت	:	خیال بد، ناپاکی
استغراق	:	گہری دلچسپی، کسی خیال یا کام میں ڈوب جانا
ضعیف الجثہ	:	کمزور، لاغر
ضعیف العقل	:	کم عقل، بے وقوف، ناسمجھ

6.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات:

1۔ مولوی ذکا اللہ کی نثر نگاری پر روشنی ڈالیے

2۔ مولوی ذکا اللہ کی انشائیہ نگاری پر اظہار خیال کیجیے۔

3۔ انشائیہ 'کیسا غلط خیال ہے کہ زمانہ برسر تنزل ہے' کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔

4۔ انشائیہ 'کیسا غلط خیال ہے کہ زمانہ برسر تنزل ہے' کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

6.7 مشقی سوالات:

1۔ مولوی ذکا اللہ کے نزدیک زمانے کے تنزل سے کیا مراد ہے؟

2۔ مولوی ذکا اللہ کے نزدیک عصر حاضر میں ترقی کا کیا حال ہے؟

3۔ مولوی ذکا اللہ کے نزدیک زمانۂ حال میں علم و ہنر کی کتنی ترقی ہوئی ہے؟

4۔ مولوی ذکا اللہ کے نزدیک بوڑھے لوگ کس طرح کی باتیں کرتے ہیں؟

5۔ مولوی ذکا اللہ نے پرانے زمانے اور زمانۂ حال کو کس انداز سے دیکھا ہے؟

6.8 مشقی سوالات کے جوابات:

1۔ زمانہ کے تنزل سے مراد ساری دنیا کے تنزل سے ہے بحیثیت مجموعی ہے، کسی خاص شخص یا خاندان و ملک و ملت سے نہیں ہے۔

2۔ مولوی ذکا اللہ کے نزدیک آج کل دنیا بہت ترقی پر ہے۔ یہ ترقی مختلف میدانوں میں ہو رہی ہے۔

3۔ علم و ہنر کے میدانوں میں غیر معمولی ترقی ہوئی ہے۔ علم طب کو دیکھیے کہ پہلے کسی زمانے میں انسان کو اعضاء انسانی بنانے میں یہ ید طولی پیدا ہوا تھا؟ اب ٹانگ ٹوٹے تو لنگڑوں کی ٹانگیں وہ بنائی جاتی ہیں کہ بازاروں میں دوڑ کی شرط باندھ کر دوڑتے ہیں۔ پوپلوں کے دانت وہ بنائے جاتے ہیں کہ جس وقت وہ ان کو کمانی پر چڑھا کر منہ میں لگائیں تو یہ معلوم ہو کہ ابھی دودھ کے دانت ٹوٹ کے دانت نکلے ہیں اور ہزاروں چیزیں علم طب میں ایسی ایجاد ہوئی ہیں کہ ہزاروں بچے ضعیف الخلقت ان کی بدولت زندہ رہتے ہیں۔

4۔ پیرانِ سال خوردہ کا ایک گروہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ صبح وشام زمانہ قدیم کی حمد وثنا کا وظیفہ پڑھتا ہے اور زمانہ حال پر تبرا بھیجتا ہے۔ اپنے زمانہ کی وہ ایسی تصویر بناتا ہے جس کا ہر جزو اور عضو بدنما اور برا معلوم ہو اور زمانہ قدیم کی باتوں کا ایسا بت بناتا ہے کہ جس کی ہر ادا اور انداز دل رُبا ہو۔ اس کے دل میں یقین ہوتا ہے کہ جو صاحب فضل وکمال اور جامع صفات جلال و جمال پہلے زمانہ میں گزرے ہیں، اب وہ خواب خیال میں بھی نظر نہیں آتے۔ جو پیغمبران سخن ہو چکے ہیں ان کا نظیر وعدیل ہونا محالات سے ہے۔ جو سرور سرا حسن آرا پہلے پیدا ہوئے ہیں ان کا اب پیدا ہونا ساز معدوم کی صدا ہے۔ غرض وہ انسان کے ایسے دشمن ہو جاتے ہیں کہ وہ اس کی انسانیت ہی کو اپنی باتوں سے اُڑانا چاہتے ہیں۔ رات دن یہی بڑ بڑایا کرتے ہیں کہ اب دین ودنیا کی ساری خوبیاں ختم ہو گئیں جتنے کمال تھے ان کا زوال آ گیا، جتنے عیب تھے اُن کا کمال ہو گیا۔ نقص کی بیشی اور کمال کی کمی ہے۔ ہنروری، دست کاری، صناعی، خوش خلقی، نیک سیرتی مروت، فتوت جودت، سینا، حلم وحیا، استقامت اور استقلال غرض جتنی اعلا درجہ کی روحانی وعقلی خوبیاں تھیں سب کی سبب رخصت ہو گئیں۔ یہاں تک کہ پہلی خوبیاں بھی پہلی سی نہ رہیں۔ نہ پہلے سے اب رستم تہمتن قوی بازو، توانا، تنومند آدمی پیدا ہوتے ہیں۔ نہ آدمیوں کی عمریں پہلی سی ہوتی ہیں، نہ وہ قدیمی صحیح المزاجی ہے۔ یہاں تک کہ ان کے دماغ میں مالیخولیا ہو جاتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ موسموں میں بھی پہلا سا اعتدال نہیں رہا۔ نہ برسات میں وہ بارشیں ہیں، نہ موسم گرما میں وہ گرمی، نہ موسم سرما میں وہ سردی۔ سرے سے آفتاب کی حرارت اور زمین کی برودت ہی کم ہو گئی۔ پیداوار ارضی زمین کے اندر تحت الثری کو چلا جاتا ہے۔ آسمان اب اور ہی چکر کھا رہا ہے۔

5۔ مولوی ذکا اللہ دن کے نزدیک پہلے زمانہ کی بعض خوبیوں اور کمالوں میں زوال آ گیا ہے، مگر اس کی جگہ زمانۂ حال میں بہت سی خوبیاں اور فضل وہنر اور کمال پیدا ہو گئے ہیں اور بہت سے عیوبِ قدیم زمانہ کے اب مٹ گئے ہیں۔

جوابات سرگرمی

1۔ غلط

2۔ صحیح

3۔ صحیح

4۔ صحیح

5۔ صحیح

6.9 امدادی کتب:

امدادی کُتب Books Prescribed.

۱۔ انتخاب اُردو نثر) ۱۸۵۷ء ۱۹۲۰ء ایجوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ۔

۲۔ انتخاب اُردو نثر ۱۹۲۰ء کے بعد ای جوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ

Books Recommended.

۱۔ مختصر تاریخ ادب اُردو۔ڈاکٹر سید اعجاز حسین ترجمہ واضافے	ڈاکٹر سید محمد عقیل
۲۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح۔	ڈاکٹر وزیر آغا
۳۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح۔	غلام احمد فرقت کاکوروی
۴۔ رشید احمد صدیقی۔شخصیت اور فن۔	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
۵۔ اُردو انشائیہ۔	وزیر آغا
۶۔ انشائیہ کے فنی سروکار۔	ڈاکٹر احمد امتیاز
۷۔ انشائیہ کی بنیاد۔	ڈاکٹر سلیم اختر
۸۔ فنِ انشائیہ اور انشائیے۔	ڈاکٹر فرحت شمیم
۹۔ انشائیہ کے خدوخال	وزیر آغا
۱۰۔ انشائیہ کی بنیاد	ڈاکٹر سلیم اختر
۱۱۔ انشائیہ اردو ادب میں	ڈاکٹر انور سدید
۱۲۔ انشائیہ	ڈاکٹر آدم شیخ

سبق نمبر 7: وقت ۔ مولوی نذیر احمد

ساخت

7.0 اغراض ومقاصد
7.1 تعارف
7.2 وقت
7.3 متن کی تدریس
7.3 سرگرمی
7.4 عمومی جائزہ
7.5 فرہنگ
7.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات
7.7 مشقی سوالات
7.8 مشقی سوالات کے جوابات، جوابات سرگرمی
7.9 امدادی کتب

7.0 اغراض ومقاصد:۔

اس سبق کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے۔

انشائیہ وقت سے متعارف ہوں گے۔

انشائیہ وقت کے اغراض ومقاصد سے واقف ہوں گے۔

انشائیہ وقت متن کے مشکل الفاظ کے معانی سے واقف ہوں گے۔

انشائیہ وقت کے متن کی زبان واسلوب سے واقف ہوں گے۔

اس انشائیہ کی امتیازی خصوصیات سے واقف ہوں گے۔

7.1 تعارف:۔

ڈپٹی نذیر احمد کی نثر میں انشائیہ نگاری کے عناصر مختلف صورتوں میں ملتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ناول نگار اور مصلح کی حیثیت سے معروف ہیں، لیکن ان کی نثری تحریروں میں انسانی زندگی کے مشاہدے، اصلاحی فکر، فطری گفتگو، محاورے اور روزمرہ کا ایسا استعمال ملتا ہے جو ان کے انشائیے کے اسلوب کو نمایاں کرتا ہے۔ ان کی زبان پر دہلی کی بول چال کا گہرا اثر تھا۔ وہ عام زندگی سے جڑے ہوئے الفاظ اور محاورے استعمال کرتے ہیں، اس لیے ان کی نثر میں بناوٹ محسوس نہیں ہوتی۔ شاہد احمد دہلوی نے ان کی محاورہ بندی کے بارے میں لکھا ہے: ''آپ اپنی تحریر میں محاورات کے روڑے نہیں بلکہ پہاڑ کھڑے کر دیتے ہیں۔'' یہ رائے نذیر احمد کی زبان دانی اور محاورے پر ان کی گرفت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ان کی اصلاحی فکر بھی اسی فطری اندازِ بیان کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ وہ بات کو مشکل بنانے کے بجائے اسے عام زندگی کے تجربات سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انشائیہ ''وقت'' اسی طرزِ فکر اور اسلوب کی ایک نمایاں مثال ہے۔ اس سبق میں ہم ان کا انشائیہ 'وقت' کا مطالعہ کریں گے۔

7.2 وقت۔

دنیا میں ہر چیز کی کچھ نہ کچھ تلافی ہے۔ مگر نہیں ہے تو وقت کی۔ جو گھڑی گزر گئی وہ کسی طرح تمھارے قابو میں نہیں آسکتی اور وقت کے گزر جانے پر غور کریں تو اسے کسی چیز کے ساتھ تشبیہ نہیں دی جاسکتی۔ وقت ریل سے زیادہ تیز ہے، ہوا سے بڑھ کر اڑنے والا، بجلی سے سوا بھاگنے والا اور دبے پاؤں نکلا جاتا ہے کہ خبر نہیں ہوتی۔ صبح ہوئی، سو کر اُٹھے جب تک معمولی ضرورتوں سے فراغت حاصل کرو، ذرا ناشتہ وغیرہ کھاؤ پیو، پھر دن چڑھ آیا۔ پھر گھڑی دو گھڑی ادھر اُدھر اٹھے بیٹھے، گپ شپ اڑائی تو دس بجنے کو آئے۔ مدرسہ جانے کو دیر ہوتی ہے۔ جلد کھایا پیا، مدرسے گئے۔ وہاں دوستوں سے ہنسی مذاق کرتے رہے۔ استاد کی تاکید سے دو ایک مرتبہ بری بھلی طرح سبق پڑھا، چلو شام ہوئی۔ دن رخصت ہوا، گھر آئے تو پھر کھانے کو سوجھی، کھانا کھانے سے کسل پیدا ہوا، ذرا لیٹے تو پھر صبح موجود۔ کام تو کچھ بھی نہ ہوا، لیکن چوبیس گھنٹے گزرتے ہوئے معلوم نہ ہوئے

اورایک چوبیس گھنٹے کیا، ایسے ایسے صدہا ہزاروں چوبیس گھنٹے اسی طرح گزر جاتے ہیں۔ بیت:

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

جب وقت کی بے ثباتی کا یہ حال ہے اور جو وقت گزرا وہ ہمارے اختیار سے باہر ہوا تو نہایت ضروری ہے کہ وقت پر ہمارا اختیار ہو۔ اس کو ضائع نہ ہونے دیں۔ یہی وقت ہے کہ سونے اور کھیلنے میں گذر جاتا ہے اور آدمی کو سست اور غبی، رسوا اور خوار اور محتاج اور طرح طرح کے امراض میں مبتلا اور بداخلاقیوں میں گرفتار کر دیتا ہے۔ یہی وقت ہے کہ اگر اس کو اچھے شغل، اچھے کام، اچھی بات میں لگایا جائے تو انسان کو عالم، فاضل، لائق، ہنرمند، نامور، محترم، نیک ہر دل عزیز بنا کر طرح طرح کی خوبیوں اور بھلائیوں سے آراستہ کر سکتا ہے۔

اے لڑکو! یہ فراغت کا وقت جو تم کو اب میسر ہے بس غنیمت سمجھو۔ اب نہ تم کو کھانے کی فکر ہے نہ کپڑے کا سوچ۔ جو کچھ تم سے سیکھتے اور حاصل کرتے بن پڑے لگ لپیٹ کر جلد سیکھ ساتھ لو کہ آئندہ تمھارے کام آئے۔ ورنہ پھر کہاں تم اور کہاں یہ فراغت۔ اس وقت تم سر پر ہاتھ رکھ کر روؤ گے اور رونا کچھ سودمند نہ ہوگا۔ بہت پچھتاؤ گے اور پچھتانا کچھ فائدہ نہ بخشے گا۔ بہت افسوس کرو گے اور افسوس سے کچھ نہ ہوگا۔ یہ وقت جو تم کو اب حاصل ہے اُن وقتوں کی مانند نہیں، جو جوانی اور پیری میں تم کو آئندہ پیش آئیں گے۔ لڑکپن کا وقت جوتنے اور بونے کا وقت ہے اور جوانی اور پیری کا وقت کاٹنے اور گاہنے کا۔ اگر اس وقت میں تم کچھ جوئے بور کھو گے تو جوانی اور پیری دونوں میں کاٹ سکو گے۔ اس وقت کو اس طرح صرف کرو کہ جوانی اور پیری دونوں میں آرام آسائش سے رہو اور چاہو تو اس وقت کو ایسا اکارت کرو کہ جوانی بھی خراب ہو اور پیری بھی برباد ہو۔ ایک وقت وہ آرہا ہے کہ تم فرصت کو ڈھونڈو گے اور فرصت کا پتہ نہ پاؤ گے اور فراغت کی تلاش کرو گے اور فراغت کا سراغ نہ ملے گا۔ یہ وہ وقت ہوگا کہ دنیا کا بار تمھاری پیٹھ پر لدا ہوگا۔ خانہ داری کے بکھیڑوں میں تم اس طرح پھنسے ہو گے جس طرح دلدل میں گدھا۔ ایک طرف تو فکر معاش تم کو سر کھجانے کی مہلت نہ دے گی اور دوسری طرف انتظام تعلقات تم کو دم نہ لینے دے گا۔ اس وقت کسب کمال کا کیا مذکور، اگر حواس بجا رکھ کر ان ہی کاموں سے عہدہ برآ ہو جاؤ تو صد آفریں۔

بس یہ خیال ہرگز اپنے دل میں مت آنے دو کہ ابھی سیکھنے کا بہت وقت آرہا ہے۔ ایسی کیا بھگدڑ مچی ہے کہ رات دن لکھنے پڑھنے کے پیچھے مر مٹے۔ اگلا حال کچھ کسی کو معلوم نہیں۔ کون جانے کہ تندرستی رہے نہ رہے۔ زمانہ فرصت دے یا نہ دے۔ یہ سب سامان جواب میسر ہیں، میسر ہوں یا نہ ہوں۔ بیشک وقت کی قدر و قیمت اور اس کی بھاگا بھاگ تو یہ چاہتی ہے کہ تم خواب وخوراپنے اوپر حرام کر کے رات دن کتاب پر

سے سر نہ اٹھاؤ۔لیکن انسان کی طبیعت کو خدا نے تازگی پسند بنایا ہے۔کیسا ہی کوئی دل چسپ شغل ہو ایک عرصے کے بعد ضرور اس سے جی گھبرا اُٹھتا ہے اور طبیعت اُکتانے لگتی ہے اور اگر طبیعت کو مجبور کر کے اس کام پر لگائے رہو تو وہ کام بھی اچھی طرح نہیں ہوتا اور حواس بھی کند ہو جاتے ہیں۔ اس واسطے مناسب ہے کہ کتاب کا مطالعہ ایسے اعتدال کے ساتھ جاری رکھو کہ تندرستی کو خلل نہ پہنچے اور ہمیشہ چند قسم کا شغل رکھو۔مثلاً نظم ونثر، تاریخ وجغرافیہ اور حساب ایک ساتھ پڑھو۔جب نثر سے طبیعت ملول ہوئی نظم دیکھنے لگے۔تھوڑی دیر تاریخ پڑھی۔کچھ دیر جغرافیہ کی سیر کی، پھر حساب میں طبع آزمائی کی۔ان سب سے گھبرائے تو کچھ لکھنے بیٹھ گئے۔جب رات کو سونے لگو تو ضرور سوچو کہ آج ہم نے کون سی نئی بات حاصل کی۔اگر معلوم ہو کہ آج کچھ نہیں سیکھا تو جانو کہ دن رائیگاں گیا اور اس نقصان کی تلافی اپنے ذمے لازم سمجھو۔کسی نے کیا خوب فرمایا ہے کہ جس کے دو دن برابر ہوں یعنی ایک ویسا ہی رہے اور اپنی حالتِ دیروزہ میں ترقی نہ کرے تو وہ خسارے میں ہے۔

7.2.1 متن کی تفہیم:۔

نذیر احمد نے اس انشائیہ میں ایسا موضوع اختیار کیا ہے جو ہر انسان کی زندگی سے براہِ راست تعلق رکھتا ہے۔وقت گزرتا ہے مگر اس کی حقیقت پر ہر شخص یکساں طور پر غور نہیں کرتا۔صبح آتی ہے، دن گزرتا ہے اور شام ہو جاتی ہے۔بظاہر یہ روز کا معمول ہے، لیکن اسی معمول کے ساتھ انسان کی عمر بھی کم ہوتی جاتی ہے۔نذیر احمد نے اسی عام حقیقت کو اپنے انشائیے کا مرکزی موضوع بنایا ہے اور اسے انسانی زندگی، اس کے اعمال اور اس کے مستقبل سے جوڑ دیا ہے۔انشائیے کے آغاز میں وقت کے گزرنے کا احساس ایک شعر کے ذریعے نمایاں ہوتا ہے:

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

یہ شعر پوری بحث کے بنیادی مفہوم کو سادہ انداز میں سامنے لے آتا ہے۔صبح اور شام کا ذکر یہاں صرف دن کے گزرنے کے لیے نہیں ہے، بلکہ انسانی عمر کی طرف اشارہ ہے۔ہر گزرتا ہوا دن زندگی کے ایک حصے کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔انسان معمول کے کاموں میں مصروف رہتا ہے اور اسے احساس نہیں ہوتا کہ وقت کے ساتھ اس کی زندگی بھی مسلسل آگے بڑھ رہی ہے۔نذیر احمد نے اسی حقیقت کو کسی پیچیدہ فلسفیانہ بحث کے بجائے ایک عام اور مانوس تجربے سے واضح کیا ہے۔یہی انداز ان کے انشائیے کو عام قاری کے قریب لے آتا ہے۔نذیر احمد کے نزدیک وقت کی اہمیت کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ گزرا ہوا وقت انسان کے اختیار میں نہیں رہتا۔انسان اپنی بہت سی غلطیوں کی تلافی کر سکتا ہے،

لیکن جو وقت گزر گیا، اسے دوبارہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اسی خیال کو وہ لکھتے ہیں:

''جب وقت کی بے ثباتی کا یہ حال ہے اور جو وقت گزر گیا وہ ہمارے اختیار سے باہر ہوا تو نہایت ضروری ہے کہ وقت پر ہمارا اختیار ہو۔''

اس اقتباس میں انشائیے کا فکری رخ واضح ہوتا ہے۔ نذیر احمد صرف وقت کے گزرنے کا ذکر نہیں کرتے، بلکہ اس سے ایک عملی نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ اگر گزرے ہوئے وقت پر اختیار نہیں رہا تو انسان کو اس وقت کی طرف متوجہ ہونا چاہیے جو ابھی اس کے پاس موجود ہے۔ اس طرح ان کے ہاں وقت محض ایک مسلسل گزرنے والی چیز نہیں رہتا، بلکہ انسان کے عمل کا میدان بن جاتا ہے۔ جو وقت موجود ہے، اسی میں انسان اپنے لیے بہتر راستہ اختیار کر سکتا ہے۔ یہاں سے انشائیے کا تعلق انسانی زندگی کی تعمیر سے قائم ہوتا ہے۔ نذیر احمد کے نزدیک وقت کو اچھے کاموں میں لگانے سے انسان کی صلاحیتیں نکھرتی ہیں اور اس کی زندگی میں بہتری آتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ وقت ہے کہ اگر اس کو اچھے فعل، اچھے کام، اچھی بات میں لگایا جائے تو انسان کو عالم، فاضل، لائق، ہنرمند، نامور، محترم، نیک، ہر دل عزیز بنا کر طرح طرح کی خوبیوں اور بھلائیوں سے آراستہ کر سکتا ہے۔''

اس اقتباس میں وقت کو انسانی شخصیت کی تعمیر سے جوڑا گیا ہے۔ انسان کے اندر صلاحیت موجود ہو تو اسے بروئے کار لانے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ علم حاصل کرنا ہو، کوئی ہنر سیکھنا ہو یا اپنی عادتوں اور کردار کو بہتر بنانا ہو، یہ سب اسی وقت ممکن ہے جو انسان کو زندگی میں میسر آتا ہے۔ اس لیے نذیر احمد کے ہاں وقت کی قدر کا مطلب صرف گھڑی دیکھنا یا وقت کی پابندی کرنا نہیں، بلکہ زندگی کے دستیاب مواقع کو صحیح مقصد کے لیے استعمال کرنا ہے۔ اسی بات کا تعلق طالب علمی اور جوانی سے بھی قائم ہوتا ہے۔ طالب علمی کا زمانہ انسان کی زندگی میں سیکھنے اور اپنی صلاحیتیں بڑھانے کا اہم مرحلہ ہے۔ اگر یہ وقت بے توجہی میں گزر جائے تو بعد میں اس کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ انسان اپنی کوتاہی کو سمجھ تو سکتا ہے، لیکن بیتا ہوا زمانہ واپس نہیں لا سکتا۔ جوانی میں بھی انسان کو اکثر یہ احساس رہتا ہے کہ اس کے پاس بہت وقت ہے۔ اسی وجہ سے وہ بعض کام مؤخر کرتا رہتا ہے۔ نذیر احمد اس انسانی رویے کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ ان کے ہاں اصل زور اس بات پر ہے کہ انسان اپنے موجودہ وقت کو پہچانے اور اسے مستقبل کے نام پر مسلسل مؤخر نہ کرتا رہے۔ وقت کے اسی پہلو سے غفلت اور پچھتاوے کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ انسان جب وقت کو اپنے ہاتھ میں دیکھتا ہے تو اس کی قدر کم محسوس کرتا ہے، لیکن جب وہ گزر جاتا ہے تو اس کی اہمیت سامنے آتی ہے۔ نذیر احمد اس حقیقت کو نہایت مختصر انداز میں بیان کرتے ہیں:

''بہت پچھتاؤ گے اور پچھتانا کچھ فائدہ نہ دے گا۔''

یہ مختصر جملہ ان کے اصلاحی انداز کی اچھی مثال ہے۔اس میں کوئی پیچیدہ استدلال نہیں، مگر بات پوری طرح واضح ہے۔ پچھتاوا گزرے ہوئے وقت کو واپس نہیں لاسکتا۔اس لیے دانش مندی یہ ہے کہ انسان کو اپنے موجودہ وقت کے بارے میں اسی وقت فیصلہ کرنا چاہیے جب اس کے پاس عمل کا موقع موجود ہو۔نذیر احمد کا مقصد محض خوف پیدا کرنا نہیں، بلکہ غفلت سے نکال کر عمل کی طرف متوجہ کرنا ہے۔''وقت'' کی اہمیت اس بات میں بھی ہے کہ نذیر احمد نے اسے انسانی زندگی کے مختلف مرحلوں سے جوڑ کر دیکھا ہے۔ان کے لیے وقت کا مسئلہ صرف ایک فرد کی ذاتی عادت کا مسئلہ نہیں۔اس کا تعلق تعلیم، ہنر، کردار اور زندگی کے مجموعی نظم سے ہے۔ جو شخص اپنے وقت کو بہتر مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے، وہ اپنی زندگی کو بھی بہتر سمت دے سکتا ہے۔اس کے برعکس وقت کی مسلسل غفلت انسان کو اس مقام پر پہنچا دیتی ہے جہاں اسے اپنی کوتاہی کا احساس تو ہوتا ہے، مگر اس کی تلافی آسان نہیں رہتی۔

یہاں نذیر احمد کی اصلاحی فکر اور ان کے انشائیے کا انداز ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ان کی تحریر میں اصلاح کا مقصد نمایاں ہے، لیکن وہ خشک نصیحت کے انداز میں بات نہیں کرتے۔ وہ ایک عام انسانی تجربے کو سامنے رکھتے ہیں اور اسی سے اپنا نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ''وقت'' میں نصیحت اور مشاہدہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔مصنف قاری کو حکم دینے کے بجائے اسے زندگی کے ایک ایسے پہلو کی طرف متوجہ کرتا ہے جس سے وہ خود بھی روزانہ گزرتا ہے۔ان کے اسلوب کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ عام زندگی سے اپنے موضوع کے لیے مثالیں اور تجربات لیتے ہیں۔صبح اور شام کا بدلنا، عمر کا بڑھنا، طالب علمی کا زمانہ اور جوانی کا گزرنا، یہ سب ایسے تجربات ہیں جن سے ہر شخص کسی نہ کسی صورت میں واقف ہے۔اسی لیے ان کی بات اجنبی نہیں لگتی۔انشائیہ نگار نے کسی دور کی یا غیر معمولی مثال تلاش کرنے کے بجائے زندگی کے سامنے موجود واقعات کو اپنے فکری مقصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس طرزِ بیان سے ان کی بات میں سادگی بھی رہتی ہے اور معنویت بھی پیدا ہوتی ہے۔''وقت'' کی زبان بھی اس کے موضوع کے مطابق ہے۔نذیر احمد نے مشکل اور ثقیل زبان کے بجائے ایسی نثر اختیار کی ہے جس میں گفتگو کی سی روانی محسوس ہوتی ہے۔محاورہ اور روزمرہ ان کے بیان کو فطری بناتے ہیں۔ان کی زبان میں دہلی کی بول چال کا اثر نمایاں ہے، مگر اس کے باوجود تحریر کا ادبی وقار برقرار رہتا ہے۔یہی توازن ان کے اسلوب کو اہم بناتا ہے۔ وہ عام فہم زبان میں ایسی بات بیان کرتے ہیں جس کے اندر اخلاقی اور فکری دونوں پہلو موجود ہیں۔ان کے انشائیے کے اسلوب میں شگفتگی بھی ہے، لیکن ''وقت'' میں یہ شگفتگی موضوع پر غالب نہیں آتی۔ یہاں اصل اہمیت خیال کو حاصل ہے۔نذیر احمد نے زبان کی نمائش کے بجائے بات کو واضح رکھنے پر توجہ دی ہے۔اسی وجہ سے انشائیہ پڑھتے

ہوئے قاری کی توجہ لفظوں کی بناوٹ سے زیادہ اس خیال پر رہتی ہے جسے مصنف سامنے لانا چاہتا ہے۔ یہ انداز ان کی نثر کو سادہ ہونے کے باوجود کمزور نہیں ہونے دیتا۔ ڈپٹی نذیر احمد کی نثر کے وسیع تر مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں اصلاح اور ادب ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ ان کی بعض دوسری تصانیف، مثلاً ''ابن الوقت''، میں بھی معاشرتی اور فکری مسائل نمایاں ہیں، لیکن ''وقت'' میں ان کی توجہ براہِ راست انسانی زندگی اور وقت کے باہمی تعلق پر مرکوز ہے۔ اس لیے اس انشائیے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے اسی موضوع کے دائرے میں دیکھا جائے۔ یہاں اصل سوال یہ ہے کہ انسان کو اپنے حصے میں آنے والے وقت کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے اور اس کے استعمال سے اپنی زندگی کو کس طرح بہتر بنا سکتا ہے۔

اس اعتبار سے ''وقت'' میں وقت ایک اخلاقی اور عملی مسئلہ بن جاتا ہے۔ انسان کی زندگی محدود ہے، اس لیے اس کے پاس موجود وقت بھی محدود ہے۔ نذیر احمد اسی محدود وقت کو بامقصد بنانے کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ وہ تعلیم اور ہنر کی بات کرتے ہیں، اچھے کاموں کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور غفلت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے پچھتاوے سے آگاہ کرتے ہیں۔ ان کی بات کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسان گزرے ہوئے وقت کے افسوس میں اپنی موجودہ فرصت بھی ضائع نہ کرے۔ زندگی میں جو وقت ابھی باقی ہے، وہی عمل کا اصل موقع ہے۔ اس انشائیے کا ایک اہم ادبی پہلو یہ بھی ہے کہ نذیر احمد نے اس موضوع کو محض وعظ کا موضوع نہیں بننے دیا۔ انہوں نے وقت کے مسئلے کو انسانی نفسیات اور روزمرہ زندگی کے ساتھ جوڑا ہے۔ انسان جانتا ہے کہ وقت گزر رہا ہے، مگر پھر بھی اس کے ضائع ہونے سے نہیں بچتا۔ وہ اپنے مستقبل کے لیے منصوبے بناتا ہے، مگر موجودہ وقت کو پوری طرح استعمال نہیں کرتا۔ نذیر احمد اسی تضاد کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہی انسانی مشاہدہ ان کے انشائیے کو محض اخلاقی مضمون سے آگے لے جاتا ہے۔ ان کے اندازِ تحریر میں ایک اور خوبی فطری ربط ہے۔ وہ وقت کے گزرنے سے اس کی قدر تک، وقت کی قدر سے اس کے استعمال تک، اور اس کے غلط استعمال سے پچھتاوے تک بات کو بتدریج آگے بڑھاتے ہیں۔ اس لیے انشائیے کے مختلف حصے الگ الگ نصیحتیں معلوم نہیں ہوتے بلکہ ایک ہی خیال کے مختلف پہلو محسوس ہوتے ہیں۔ یہی ترتیب اس تحریر کو فکری وحدت عطا کرتی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی انشائیہ نگاری کے حوالے سے ''وقت'' اس لیے بھی اہم ہے کہ اس میں ان کے اسلوب کی کئی نمایاں خصوصیات ایک ساتھ سامنے آتی ہیں۔ موضوع عام ہے، مگر اس پر غور کا انداز سنجیدہ ہے۔ زبان سادہ ہے، مگر خیال میں وزن ہے۔ اصلاحی مقصد موجود ہے، مگر گفتگو خشک نہیں۔ محاورہ اور روزمرہ موجود ہیں، مگر محض زبان کی آرائش کے لیے نہیں۔ انسانی زندگی کا مشاہدہ بھی ہے اور اس مشاہدے سے پیدا ہونے والی فکری بات بھی۔ یہی امتزاج ان کے انشائیے کے اسلوب کو اپنی الگ شناخت دیتا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ڈپٹی نذیر احمد کا انشائیہ ''وقت'' ان کی

نثر میں سادگی، انسانی مشاہدے اور اصلاحی فکر کے امتزاج کی عمدہ مثال ہے۔ انہوں نے وقت کو صرف گزرنے والی شے کے طور پر نہیں دیکھا، بلکہ اسے انسانی زندگی کی تعمیر کا ذریعہ بنایا ہے۔ تعلیم، ہنر، کردار اور اچھے اعمال کے لیے موجودہ وقت کو درست طور پر استعمال کرنا ان کے نزدیک ضروری ہے۔ انشائیے میں گزرے ہوئے وقت کی بے واپسی اور غفلت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے پچھتاوے کو انسانی تجربے کے ذریعے واضح کیا گیا ہے۔ ان کا اندازِ بیان سادہ، رواں اور فطری ہے۔ محاورہ اور روزمرہ نے اسے زندگی سے قریب کر دیا ہے۔ یوں ''وقت'' نہ صرف ایک اصلاحی تحریر کے طور پر سامنے آتا ہے بلکہ ڈپٹی نذیر احمد کی انشائیہ نگاری کے اس پہلو کو بھی واضح کرتا ہے جس میں عام زندگی کے مشاہدے سے ایک بامعنی اور قابلِ غور خیال پیدا ہوتا ہے۔

7.3 سرگرمی:

1۔ جو وقت گزرا وہ ہمارے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہوا۔

2۔ وقت کی قدر و قیمت اور اس کی ۔۔۔۔ کہ تم خواب و خور اپنے اوپر حرام کر کے رات دن کتاب پر سے سر نہ اٹھاؤ۔

3۔ جب رات کو سونے لگو تو ضرور سوچو کہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ حاصل کی۔

4۔ ہر گزرتا ہوا دن ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔

5۔ یہ فراغت کا وقت جو تم کو اب میسر ہے بس ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سمجھو۔

7.4 عمومی جائزہ:۔

ڈپٹی نذیر احمد کے انشائیے 'وقت' کا مرکزی موضوع وقت کی قدر اور اس کا صحیح استعمال ہے۔ مصنف کے نزدیک دنیا کی ہر چیز کی تلافی ممکن ہے، مگر گزرے ہوئے وقت کی دوبارہ بازیابی ناممکن ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ موجودہ وقت پر انسان کا مکمل اختیار ہو۔ وقت اگر اچھے کاموں میں لگایا جائے تو انسان کو عالم، فاضل، ہنرمند اور معزز بنا دیتا ہے، اور اگر ضائع ہو تو وہی اسے سستی، محرومی، بیماریوں اور بداخلاقیوں میں گرفتار کر دیتا ہے۔

انشائیے میں خاص طور پر طالب علمی اور جوانی کے زمانے کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ لڑکپن بونے کا زمانہ ہے اور جوانی اور پیری کاٹنے

کا یعنی اس دور میں حاصل کی گئی تعلیم اور ہنر بعد کی زندگی کا سرمایہ بنتے ہیں۔ڈپٹی نذیر احمد کی اصلاحی فکر کی خاص بات یہ ہے کہ وہ نصیحت خشک وعظ کے بجائے عام انسانی تجربات کے ذریعے کرتے ہیں اور قاری کو غفلت سے نکال کر عمل کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔زبان اور اسلوب کے اعتبار سے یہ انشائیہ سادہ، رواں اور گفتگو کی سی روانی رکھنے والا ہے جس میں محاورے اور روزمرے نے عبارت کو زندگی سے قریب کر دیا ہے۔مجموعی طور پر یہ تحریر سادگی، انسانی مشاہدے اور اصلاحی فکر کے امتزاج کے باعث اردو انشائیہ نگاری میں ادبی اور فکری لحاظ سے ایک اہم مثال کی حیثیت رکھتی ہے۔

7.5 فرہنگ:۔

الفاظ	:	معنی
تلافی	:	نقصان یا کمی کو پورا کرنا
تشبیہ	:	مشابہت، ایک چیز کو دوسری سے ملتا ہوا بتانا
بے ثباتی	:	ناپائیداری، عارضی پن
غبی	:	ناسمجھ، احمق
فراغت	:	آرام، فارغ البالی
میسر	:	موجود، حاضر
غنیمت	:	مبارک اور نایاب موقع
لگ لپیٹ کر	:	محنت اور کوشش کر کے
سودمند	:	نفع دینے والا
جوئے بور کھنا	:	(مجازی طور پر) محنت کا بیج بونا
اکارت	:	بے فائدہ، ضائع، برباد
فرصت	:	آرام کا وقت، مہلت

بکھیڑے	:	الجھنیں، جنجال، پیچیدگیاں
دلدل	:	نرم کیچڑ والی زمین جس میں پاؤں دھنس جائے
فکرمعاش	:	روزگار کمانے کی فکر
کسب کمال	:	ہنر اور خوبیوں کا حصول
عہدہ برآ ہونا	:	فرض ادا کرنا، کام سے نبٹ جانا
صدآفریں	:	سوطرح کی داد کے قابل، بہت خوب
خواب وخور	:	نیند اور کھانا
ملول	:	اداس، بیزار
طبع آزمائی	:	اپنی صلاحیت آزمانا
اعتدال	:	درمیانی رویہ، حد سے تجاوز نہ کرنا
رائیگاں	:	بے کار، فضول
حالتِ دیروزہ	:	گزرے کل کی کیفیت
کسل	:	تھکان، سستی
تاکید	:	زور دے کر سمجھانا

7.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات:۔

1۔ انشائیہ وقت کا تنقیدی جائزہ پیش کیجیے۔

2۔ انشائیہ وقت کی نثر پر اظہار خیال کیجیے۔

3۔ انشائیہ وقت کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

4۔ وقت کی اہمیت پر ایک مضمون لکھیے

7.7 مشقی سوالات:

1۔ نذیر احمد کے نزدیک وقت کی کیا اہمیت ہے؟

2۔ نذیر احمد کے نزدیک وقت کی ناقدری کے کیا نقصانات ہیں؟

3۔ نذیر احمد نے وقت کی بے ثباتی کو کس طرح بیان ہے؟

4۔ نذیر احمد نے وقت کی قدر و قیمت کو کس طرح بیان کیا ہے؟

5۔ نذیر احمد نے 'وقت' کے ذریعہ کیا پیغام دیا ہے؟

7.8 مشقی سوالات کے جوابات:۔

۔ 1 نذیر احمد کی نظر میں وقت کی بڑی اہمیت ہے ان کا خیال ہے کہ کو ضائع نہ ہونے دیں۔ یہی وقت ہے کہ سونے اور کھیلنے میں گذر جاتا ہے اور آدمی کو سست اور غبی، رسوا اور خوار اور محتاج اور طرح طرح کے امراض میں مبتلا اور بداخلاقیوں میں گرفتار کر دیتا ہے۔ یہی وقت ہے کہ اگر اس کو اچھے شغل، اچھے کام، اچھی بات میں لگایا جائے تو انسان کو عالم، فاضل، لائق، ہنرمند، نامور، محترم، نیک ہر دل عزیز بنا کر طرح طرح کی خوبیوں اور بھلائیوں سے آراستہ کر سکتا ہے۔

2۔ وقت کی ناقدری سے آدمی کبھی ترقی نہیں کر سکتا ہے۔ وہ ذہنی اور جسمانی طور سے مختلف امراض میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ وہ سست، غبی، خوار محتاج اور طرح طرح کے امراض میں مبتلا اور بداخلاقیوں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

3۔ وقت کی بے ثباتی کا یہ حال ہے اور جو وقت گزر گیا وہ ہمارے اختیار سے باہر ہو۔

4۔ نذیر احمد کہتے ہیں دنیا کی ہر چیز کی تلافی ممکن ہے، مگر گزرے ہوئے وقت کی دوبارہ بازیابی ناممکن ہے۔

5۔ نذیر احمد نے اس انشائیہ میں وقت کی اہمیت کو نہایت موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے یہ بتایا ہے کی وقت کی ناقدری سے کون کون سے اور کس کس طرح کے نقصانات ہوتے ہیں اور اس کی قدر کرنے والے ترقی کرتے ہیں۔ ہماری ترقی کا راز وقت کے بہتر استعمال میں ہی مضمر ہے۔

جوابات سرگرمی

1۔ اختیار سے باہر

2۔ بھاگا بھاگ تو یہ چاہتی ہے

3۔ آج ہم نے کون سی نئی بات

4۔ زندگی کے ایک حصے کو

5۔ غنیمت

7.9 امدادی کُتب Books Prescribe

امدادی کُتب Books Prescribed.

۱۔ انتخاب اُردو نثر) ۱۸۵۷ء ۱۹۲۰ء ایجوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ۔

۲۔ انتخاب اُردو نثر ۱۹۲۰ء کے بعد ای جوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ

Books Recommended.

۱۔ مختصر تاریخ ادب اُردو۔ڈاکٹر سید اعجاز حسین ترجمہ واضافے	ڈاکٹر سید محمد عقیل
۲۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح۔	ڈاکٹر وزیر آغا
۳۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح۔	غلام احمد فرقت کاکوروی
۴۔ رشید احمد صدیقی۔شخصیت اور فن۔	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
۵۔ اُردو انشائیہ۔	وزیر آغا
۶۔ انشائیہ کے فنی سروکار۔	ڈاکٹر احمد امتیاز
۷۔ انشائیہ کی بنیاد۔	ڈاکٹر سلیم اختر
۸۔ فن انشائیہ اور انشائیے۔	ڈاکٹر فرحت شمیم

۹۔ انشائیہ کے خدوخال	وزیر آغا
۱۰۔ انشائیہ کی بنیاد	ڈاکٹر سلیم اختر
۱۱۔ انشائیہ اردو ادب میں	ڈاکٹر انور سدید
۱۲۔ انشائیہ	ڈاکٹر آدم شیخ
۱۳۔ ڈپٹی نذیر احمد احوال و آثار	محمد اکرام چغتائی
۱۴۔ مولوی نذیر احمد احوال و آثار	ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی
۱۵۔ لکچروں کا مجموعہ (مرتبہ)	محمد نذیر حسین
۱۶۔ نذیر احمد	نور الحسن نقوی
۱۷۔ فکر و نظر (ڈپٹی نذیر احمد نمبر) علی گڑھ	

سبق نمبر 8 نسیم سحر۔عبدالحلیم شرر

ساخت

8.0 اغراض ومقاصد
8.1 تعارف
8.2 نسیم سحر
8.2.1 متن کی تدریس
8.3 سرگرمی
8.4 عمومی جائزہ
8.5 فرہنگ
8.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات
8.7 مشقی سوالات
8.8 مشقی سوالات کے جوابات/جوابات سرگرمی
8.9 امدادی کتب

8.0اغراض ومقاصد:

اس سبق کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے۔

انشائیہ نسیم سحر سے متعارف ہوں گے۔

انشائیہ نسیم سحر کی بنیادی باتوں سے واقف ہوں گے۔

انشائیہ نسیم سحر کے متن کے مشکل الفاظ کے معانی سے واقف ہوں گے۔

انشائیہ نسیم سحر کے متن کی زبان واسلوب سے واقف ہوں گے۔

انشائیہ نسیم سحر کی امتیازی خصوصیات سے واقف ہوں گے۔

8.1 تعارف:۔

عبدالحلیم شرر اردو کے مایہ ناز تاریخی ناول نگار، صحافی، ترجمہ نگار اور نقاد تھے۔ شرر ان کا تخلص تھا۔ لیکن وہ بلا کے انشائیہ نگار بھی تھے۔ ان کی تحریروں کو لکھنوی تہذیب وثقافت کی دستاویز بھی کہا جا سکتا ہے۔ ان کا رسالہ دلگداز اپنے زمانے میں نہایت مقبول تھا۔ بحیثیت نثر نگار شرر بنیادی طور پر دبستانِ لکھنؤ کے نمائندہ ہیں۔ ان کے یہاں وہی رنگینی، دلکشی، انشاپردازی، شگفتگی، صناعی اور داستانوی رنگ ہے۔ جو کہ لکھنؤ کی شناخت ہے۔ ان کی منظر نگاری، جذبات انگیزی، رنگیں بیانی، داستانوی اسلوب ان کی نثر کو ممتاز کرتی ہے۔ ان کی نثر میں تاریخ، تہذیب، تخیل اور انشائیہ اسلوب ہم آمیز ہو کر ایک منفرد نثری آہنگ جنم دیتا ہے۔ ان کی ادبی شناخت کا ایک اہم حوالہ ان کے منظوم ڈرامے بھی ہیں۔

عبدالحلیم شرر ایک ممتاز انشائیہ نگار بھی ہیں۔ ان کے انشائیوں میں ذاتی مشاہدے، جذبات، تخیل، طنز وظرافت اور تہذیبی شعور کا خصوصی دخل ہے۔ ان کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے۔ وہ تاریخ، تہذیب، معاشرت، اخلاق، مذہب، رسوم وآداب، شخصیات اور روزمرہ زندگی کے علاوہ فطری مناظر کو اپنے انشائیوں کا موضوع بناتے ہیں۔ ان کا تاریخی اور تہذیبی شعور بالیدہ ہے۔ ان کا اندازِ بیان منفرد اور شخصی نوعیت کا ہے۔ شگفتگی اور ظرافت ان کی خصوصیت ہے۔ تخیل اور منظر نگاری پر انہیں ید طولیٰ حاصل ہے۔ ان کی زبان شستہ رواں اور ادبی ہے۔ ثقیل الفاظ کی کوئی جگہ ان کی نثر میں نہیں ہے۔ ان کے اسلوب میں خطابت، داستانویت اور بے تکلف گفتگو کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ اس سبق میں مولوی عبدالحلیم شرر کا انشائیہ نسیم سحر کا مطالعہ کیا جائے گا۔

8.2 نسیم سحر

یاد آئے اگر مجھ کو چمن کنجِ قفس میں
دامن میں لیے پھول نسیم سحر آئے

صبح خیزانِ مسجد بہت تڑکے اکٹھے اور مذہبی فرائض کے ادا کرنے کی جانب نہایت سرگرمی سے متوجہ ہو گئے، انھوں نے جس چراغ کو غلبۂ تاریکی کے وقت طاق مسجد میں روشن کیا تھا اسے کچھ خوشگوار سی ہوا کے جھونکوں سے تھپیڑے کھا کھا کے اور اپنی دلفریب نورانیت کو کھو کھو کے یا مختصر یوں کہ جھلملا کے کے گل ہو جاتے دیکھا اور یا یہ دیکھا کہ صبح کی بیباک ہوا کسی جھونکے لینے والے رندمیکش کی طرح لڑکھڑاتی ہوئی مسجد میں گھس آئی اور حضرت شیخ کے ایسے خشک مزاج بزرگ کے ساتھ بھی بے ادبی کی یہ شوخیاں کرنے لگی کہ ان کی سفید، نورانی اور لمبی لمبی داڑھی ادھر اُدھر اُڑتی جاتی ہے وہ ادب و وقار کی اداؤں سے رک رک کر، بلکہ لوگوں کی آنکھ بچا بچا کے اسے روکتے ہیں۔ مگر وہ ہمارے دل از خود رفتہ کی طرح ان کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے، اس کے سوا اور کیا تھا جو انھوں نے دیکھا صبح کے نقیب یعنی طیور نغمہ خواں نے انھیں بہت پکارا، نسیم مستانہ رَو نے بڑی شوخ اداؤں سے اس وقت بھی جب وہ وضو کر رہے تھے اور اس گھڑی بھی جب وہ نماز میں مصروف تھے ان کے پہلوؤں میں بہت ٹھوکے بتائے۔ مگر ان کے دل میں اتنی حس کہاں کہ قدرت کی اصلی بہار کو دیکھیں اور سُبحانہ اللہ کہیں۔ یہ کلمہ ان سے بیشک سنا گیا اور بارہا سنا گیا۔ مگر موجودہ وقت کی دلچسپیوں اور عروس قدرت کی ناز آفرینیوں پر نہیں بلکہ حوروں کی تمنا اور جنت کی آرزو میں۔ اس اعتراض کو لوگ فضول نہ سمجھیں، خشک طبعان بوالہوس پر یہ سچا اعتراض ہے کہ انھوں نے قدرت کی موجودہ دلچسپیوں کی قدر نہ کی صرف آئندہ لفظوں کو یاد کرتے رہے۔ صبح جو باغ قدرت کے نکھار کا وقت تھا اس وقت یہ اُٹھے مگر اس وظیفہ میں مشغول ہو گئے جسے اور وقت بھی پڑھ سکتے تھے۔ یہ غیر ممکن نہ تھا جو اس وقت صفحاتِ قدرت کا مطالعہ کرنے کے لیے وقت نکالتے۔ خدا کی بہت بڑی عبادت یہی ہے کہ اس کی قدرت کو دیکھ کے انسان اپنی مخلوقیت کا سبق حاصل کرے۔

یہ نسیم سحر جو صبح کو متوالی بن بن کے چلتی ہے اور جس کی کیفیتیں اس درجہ مؤثر ہیں کہ نوجوانانِ چمن جو قدرتی طور پر یا خود پسندی کے غرور میں بالکل بے حس بنے ہوئے ہیں ان پر بھی ایک ایسا بے خودی کا عالم طاری ہوتا ہے کہ وجد میں آ کے مشغول رقص ہو جاتے ہیں۔ نوجوانان چمن درکنار، عروسان گلشن یعنی نازک اور دلفریب پھول جن کی متانت کی ہنسی مشہور ہے۔ انھیں بھی جوش مسرت میں ضبط نہیں ہو سکتا اور کسی طرح اپنے نازک اور خوش رنگ لب بند نہیں رکھ سکتے۔ ان بے حسوں کا تو یہ حال ہے اور انسانی دماغ کے عقلا نے اپنی عقلوں کو اس قدر غیر متاثر بنا دیا ہے کہ وہ باخبر بھی نہیں ہوتے اور نسیم سحر دنیا میں ایک زندگی بخش سماں پیدا کر کے رخصت ہو جاتی ہے۔

کوہستانی سبزۂ زار جن کی چوٹیاں صبح کے سناٹے میں نسیم سحر کے دھوئے ہوئے آسمان کی صورت دیکھنے میں ایسی محو ہو جاتی ہیں کہ گویا اور کسی کی طرف دیکھنا چاہتی ہی نہیں۔ ان کے ہر درخت بلکہ ان کو لباس زریں پہنانے والی گھاس کی ہر پتی کے حیرت مندانہ سکوت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بالکل سناٹے اور محویت کے عالم میں ہیں، از خود رفتگی نے ان پر ایک سکتے کا عالم طاری کر دیا ہے، یہ نسیم اس وقت کی خفی روشنی میں جب

پچھلی رات کے آسمان پر تاروں کے چراغ گل کرنے اور ان میں کی مزید ار جھلملاہٹ پیدا کرنے کے لیے ان پر چڑھتی ہے تب دیکھیے کہ ان از خو رفتہ شعلہ ہائے کوہ اس خواب حیرت سے جگانے کے لیے یہ کن مستانہ لغزشوں اور شوخ اداؤں سے ان کے دامن میں ادھر ادھر گدگداتی ہوئی جاتی ہے اور کس کس طرح بے تاب کر کے انھیں اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی ہے۔ نسیم ان کوششوں میں ناکام نہیں رہتی۔ اسے کامیابی بلکہ بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے۔ اس کی ان شوخ اداؤں کے نتیجہ میں صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اس نے قدرت کے ارگن کو کوک دیا اور ہر چہار طرف سے نیچر کے ایجاد کیے ہوئے نغمے سنے جانے لگے۔ خوش نوا اور آزاد طبع طیور جو اس حصہ دنیا کے نشیب و فراز میں شب باش ہوا کرتے ہیں درختوں کی حرکت اُنھیں جگاتی ہے اور وہ چونک چونک کے خدا کی مناجات اور قدرت کی خوبیوں کے شادیانے شروع کر دیتے ہیں۔ زاہدوں کا ہم مشرب اور شب بیدار اتو اپنی آنکھیں بند کر کے الگ ہو جاتا ہے اور خویش مذاق شگفتہ طبع طیوران خدا کے بنائے ہوئے بُرجوں پر بیٹھ بیٹھ کے قدرت الٰہی کی نوبت بجانے لگتے ہیں۔ وہ آبشار جورات کے سناٹے میں ایک سکوت کے ساتھ بلندی سے نیچے اترتا چلا آتا تھا۔ اس نے اب اپنے آئینے میں جابجا صبح کی روشنی کا نورانی عکس دکھایا ہے۔

ایک تھکا ماندہ مسافر جس طرح اپنی پرشوق رفتار میں دیکھتا ہے کہ رفتہ رفتہ دور کے دھندلکے کا دامن چاک ہوتا جاتا ہے اور وطن کی عمارتیں ساعت بساعت زیادہ اس پر ابھر کے نمایاں ہوتی ہیں۔ اسی طرح صبح کا گریباں جوں جوں چاک ہوتا ہے، قدرت کے نظر فریب سامان اور زیادہ نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ متلاطم سمندر کا کنارہ پر آرزو نظروں کو دور کی سیر کرانے والا ساحل جہاں اکثر دوست، آشنا بچھڑے ہوئے، ہجراں زدہ خدا جانے کن کن آرزوؤں سے نظر دوڑایا کرتے ہیں۔ وہاں اس وقت جس وقت نسیم سحر کو آپ نے پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھتے دیکھا تھا ملاحظہ فرماتے تو یہاں بھی باغ قدرت کے عجیب دلچسپ کرشمے نظر آئیں گے، وہ جہاز جس کے انتظار میں لوگ مدتوں سے چشم براہ تھے اور جس نے رات کی تاریخی میں اسٹیم کی قوت یا بادبانوں کی کشش سے اپنے سفر کی بہت مسافت طے کر لی ہے۔ اب اس وقت ان معمولی قوتوں کو نسیم سحر اور بڑھا رہی ہے اور گویا مشتاقوں کے جذبات کی سفیر بن کے گئی ہے اور انھیں بڑی قوی کشش کے ساتھ کنارے کی طرف لاتی ہے۔ اس جہاز کی جستجو کرنے والی نگاہوں نے صبح کا دامن چاک ہوتے ہی اسے بہت دور پر پایا تھا اس کی پہلی مٹی مٹی شکل اب زیادہ نمودار ہوگئی ہے۔ نسیم سحر اس کے استقبال میں اس درجہ سرگرم ہے کہ سمندر کو اپنے نازک جھونکوں سے بار بار تھپیڑے دیتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ سمندر اس جہاز کے لیے جو گویا مختلف آرزوؤں اور اُمیدوں کی مجسم تصویر ہے۔ خود ہی جگہ خالی کر دے۔ اگرچہ یہ تھپیڑے ڈھیلے ہاتھوں کی مار ہیں لیکن نافہم سمندر اس پر بھی بگڑ بگڑ کے بار بار چیں بجبیں ہو جاتا ہے۔ ان سب باتوں کی مجموعی کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، وہ سطح آب کا جھنجھلا کے چیں بہ جبیں ہونا وہ

جہاز کا برابر آگے بڑھنا اور وہ نسیم سحر کا بار بار اور رہ رہ کے سمندر کو چھیڑ کے الگ ہونا ایسی لطف کی باتیں ہیں کہ ایک صاحب حسن کے نزدیک ان کی زیارت ہی اول درجہ کی عبادت ہے۔

اے پیاری خوش خرام نسیم سحر! تو قدرت کی سچی کارفرما ہی نہیں نامہ بر بھی ہے، خدا کے ہاں سے صبح کا پیام دینے والوں کے پاس تو ہی لاتی ہے، تیری ہی خوش گوارہ خنکی جب محسوس ہوتی ہے تب معلوم ہوتا ہے کہ صبح ہوئی۔ غالبا تیری ہی نازک انگلیوں سے دامن سحر چاک ہوتا ہوگا۔ اس لیے کہ جب کبھی تڑکے آنکھ کھلی ہے ہم نے بچشم خود دیکھا ہے کہ آسمان پر جا کے ناروں کے چراغ تو ہی گل کرتی ہے۔ پچھلے پہر کے چاند کے چہرے پر تو ہی وہ سفید پاؤڈر ملتی ہے جو اس کی روشنی کو ماند کر دیتا ہے اور جس کے اثر سے آخر وہ ایسا غائب ہو جاتا ہے کہ دنیا بھر میں کوئی اسے نہیں دیکھ سکتا۔ چاہے وہ سب کو دیکھتا ہو۔ تو ہی باغوں میں جا کے غنچوں کو ہنساتی اور نونہالان چمن کو از خود رفتہ کر کے وجد میں لے آتی ہے، تو ہی سمندر کے پانی میں ایک خفیف حرکت پیدا کر کے عدم کے ایسے سناٹے کو مٹاتی ہے۔ تو ہی صحراؤں میں چل پھر کے ریگ رواں کو میٹھی چال چلاتی ہے۔ دنیا کے جھلملاتے ہوئے چراغ اور محبت ہائے عیش کی شمعیں تیرے ہی پھونکنے سے گل ہو جاتی ہیں اور عالم کی رات بھر کی خاموشی تیری ہی شوخ اداؤں سے دور ہوتی ہے تو ہی آشیانوں میں جائے طیور کو چونکاتی اور سجدوں میں آ کے زہاد کو اٹھا بیٹھاتی ہے۔ آہ کیسی اچھی اچھی جگہ تیرا گزر ہوتا ہے اور تو کیسی کیسی لطف کی صحبتوں میں پہنچ جاتی ہے۔ تو آزادی کا نمونہ، مجنوں کا بے باک ہاتھ یا ہماری تمنا ہے۔

8.2.1 متن کی تدریس۔

زیر نظر انشائیہ ''نسیم سحر'' صبح کی ٹھنڈی اور فرحت بخش ہوا کے انشا پردازانہ اور تخیل آمیز بیان پر مشتمل ہے۔ اس انشائیے کا رشتہ رومانویت سے وابستہ ہے۔ یعنی حقیقت سے فرار، ناسٹلجیا، رنگین خیالی، خوابوں کی جنت، فنٹیسی، جذبات انگیزی اور مناظر فطرت میں فنا ہو جانے کی کیفیت اس انشائیے کو رومانوی بناتی ہے۔ انشائیے کا یہ اسلوب پیش خدمت ہے:

> ''صبح خیزانِ مسجد بہت تڑکے اکٹھے اور مذہبی فرائض کے ادا کرنے کی جانب نہایت سرگرمی سے متوجہ ہو گئے، انہوں نے جس چراغ کو غلبۂ تاریکی کے وقت طاق مسجد میں روشن کیا تھا اسے کچھ خوشگوار سی ہوا کے جھونکوں سے تھپیڑے کھا کھا کے اور اپنی دلفریب نورانیت کو کھو کھو کے یا مختصر یوں کہ جھلملا کے گل ہو جاتے دیکھا اور یا یہ دیکھا کہ صبح کی بیباک ہوا کسی جھونکے لینے والے رندمیکش کی طرح لڑکھڑاتی ہوئی مسجد میں گھس آئی اور حضرت شیخ کے ایسے خشک مزاج بزرگ کے ساتھ بھی بے ادبی کی یہ شوخیاں کرنے لگی کہ ان کی سفید، نورانی اور لمبی لمبی داڑھی ادھر ادھر اڑتی جاتی ہے وہ ادب و

وقار کی اداؤں سے رک رک کر، بلکہ لوگوں کی آنکھ بچا بچا کے اسے روکتے ہیں۔''

کیسا شگفتہ منظر ہے کہ صبح کی ٹھنڈی ہوا شیخ و زاہد کی داڑھیوں سے اٹکھیلیاں کر رہی ہے۔اور حضرت ہیں کہ شرماتے جاتے ہیں یوں تو غزل میں شیخ و زاہد سے چھیڑ چھاڑ اس کی روایت کا حصہ رہی ہے۔لیکن نثر میں یہ شوخی تقریباً نایاب ہے چنانچہ یہ عنصر اس انشائیے کو شاعرانہ کیفیت سے مملو کر دیتا ہے۔آگے چل کر عبدالحلیم شرر ان خشک طبع شیوخ اور زہاد پر طنز کرتے ہیں کہ وہ فطرت کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے کی اہلیت سے محروم ہیں۔شرر کے نزدیک یہ بھی بدذوقی ہے کہ کوئی شخص صبح کے خوشگوار موسم سے لطف اندوز ہونے کے بجائے گوشے میں بیٹھ کر اوراد وظائف میں مشغول ہو جائے۔شرر کی نثر شاعرانہ رنگ و آہنگ میں ڈوبی ہے۔مثلاً وہ پھول کو''عروسان گلشن'' سے استعارہ کرتے ہیں۔شرر کی رنگین انشا پردازی دلوں کو چھو جاتی ہے،مثلاً یہ جملہ دیکھیے:

''کوہستانی سبزہ زار جن کی چوٹیاں صبح کے سناٹے میں نسیم سحر کے دھوئے ہوئے آسمان کی صورت دیکھنے میں ایسی محو ہو جاتی ہیں کہ گویا اور کسی کی طرف دیکھنا چاہتی ہی نہیں۔''

یہ کوئی عام منظر نگاری نہیں ہے بلکہ اس کو شاعرانہ پیکر تراشی کہنا چاہیے جہاں قدرت کے تمام مناظر لفظی تصویر میں ڈھل جاتے ہیں۔اس میں کوہستانی سبزہ زار،صبح،نسیم سحر اور آسمان غیر ذی روح مظاہر کے بجائے مجسم ہو اٹھے ہیں۔امیجری خلق کرنے کے لیے انشائیہ نگار پانچوں حواس کو بروئے کار لاتا ہے۔انشائیہ نگار کی شاعرانہ حس اسے رومانی فضا میں بھی روحانیت کی آمیزش کا ہنر بخشتی ہے۔اس حوالے سے یہ خوبصورت اقتباس ملاحظہ ہو:

''خوش نوا اور آزاد طبع طیور جو اس دنیا کے نشیب و فراز میں شب باش ہوا کرتے ہیں درختوں کی حرکت انہیں جگاتی ہے اور وہ چونک چونک کے خدا کی مناجات اور قدرت کی خوبیوں کے شادیانے شروع کر دیتے ہیں۔زاہدوں کا ہم مشرب اور شب بیدار تو اپنی آنکھیں بند کر کے الگ ہو جاتا ہے اور خویش مذاق شگفتہ طبع طیوران خدا کے بنائے ہوئے برجوں پر بیٹھ بیٹھ کے قدرت الٰہی کی نوبت بجانے لگتے ہیں۔''

انشائیہ نگار کے نزدیک وہ خوش نوا طیوران زاہدوں سے بڑھ کر عبادت گزار ہیں جو صبح دم نسیم سحر میں آنکھیں بند کر کے پڑے رہنے کے بجائے درختوں پر چہچہاتے ہیں اور قدرت کی حمد بیان کرتے ہیں۔آگے چل کر انشائیہ نگار نے ساحل سمندر کی دلکش صبح کا پر کیف سماں باندھا ہے۔ایک ایسا کنارہ جہاں کتنے ہی محبوب اپنوں سے بچھڑتے بھی ہیں اور ملتے بھی ہیں۔نسیم سحر کے جھونکے اس کے درد کو بھی بڑھاتے ہیں اور وصل کے سرور میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔انشائیہ نگار 'سطح آب'، جہاز، سمندر اور نسیم سحر کے ایک دوسرے سے ہم آغوش ہونے کا منظر جس طرح کھینچتا ہے وہ

فطرت میں فنائیت اور محویت کی اعلیٰ ترین مثال ہے:

''وہ سطح آب کا جھنجھلا کے چیں بہ جبیں ہونا وہ جہاز کا برابر آگے بڑھنا اور وہ نسیم سحر کا بار بار اور رہ رہ کے سمندر کو چھیڑ کے الگ ہونا ایسی لطف کی باتیں ہیں کہ ایک صاحب حسن کے نزدیک ان کی زیارت ہی اول درجہ کی عبادت ہے۔''

یہاں بھی تجسیم کاری، مرقع کشی، حسن آفرینی اور رومانیت وروحانیت کا حسین امتزاج اپنے شباب پر ہے۔ آگے چل کر انشائیہ نگار کی چشم تخیل نسیم سحر کو محبوب بنا دیتی ہے۔ اور ان کا اسلوب خطابیہ ہو جاتا ہے:

''اے پیاری خوش خرام نسیم سحر! تو قدرت کی سچی کارفرما ہی نہیں نامہ بر بھی ہے، خدا کے ہاں سے صبح کا پیام دنیا والوں کے پاس تو ہی لاتی ہے، تیری ہی خوش گوارہ خنکی جب محسوس ہوتی ہے تب معلوم ہوتا ہے کہ صبح ہوئی۔ غالباً تیری ہی نازک انگلیوں سے دامن سحر چاک ہوتا ہوگا۔ اس لیے کہ جب کبھی تڑکے آنکھ کھلی ہے ہم نے بچشم خود دیکھا ہے کہ آسمان پر جا کے تاروں کے چراغ تو ہی گل کرتی ہے۔''

یہاں نسیم سحر خوش خرام ہے، نامہ بر ہے، وہ خدا کے یہاں سے صبح کا پیغام لاتی ہے۔ اس کی نازک انگلیاں دامنِ سحر کو چاک کرتی ہیں۔ ایسی نثر جہاں خطابت، رومان خیزی، اسلوب کی مینا کاری، حسن تعلیل اور ڈرامائیت کے عناصر مجتمع ہو جاتے ہیں۔ اس کی تاثیر کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس انشائیے میں نسیم سحر ایک ایسے نازک اندام محبوب کی صورت میں مشکّل ہوتی ہے کہ اس کی حیثیت ایک زندہ اور متحرک کردار کی سی ہو جاتی ہے اور اس کے وجود سے کائنات کی تمام جمال آفرینیاں منسلک ہیں۔

8.3 سرگرمی:۔

1۔ انھیں بھی جوش مسرت میں ضبط نہیں ہو سکتا اور کسی طرح اپنے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بند نہیں رکھ سکتے۔

2۔ خدا کی بہت بڑی عبادت یہی ہے کہ اس کی قدرت کو دیکھ کے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کا سبق حاصل کرے۔

3۔ نسیم سحر اس کے استقبال میں اس درجہ سرگرم ہے کہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بار بار تھپیڑے دیتی ہے

4۔ اے پیاری خوش خرام نسیم سحر! تو قدرت کی سچی کارفرما ہی نہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بھی ہے

5۔ تیری ہی خوش گوارہ خنکی جب محسوس ہوتی ہے تب معلوم ہوتا ہے کہ ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہوئی۔

8.4 عمومی جائزہ:۔

نسیم سحر ایک دلکش انشائیہ ہے اس میں انشائیے کی تمام صفات مجتمع ہوگئی ہیں مثلاً ذہنی ترنگ، انشا پردازی، شگفتگی، ڈھیلا ڈھالا اور سبک طرز بیان وغیرہ۔ نسیم سحر کی شگفتگی کا یہ عالم ہے کہ وہ خشک مزاج زاہد و ملاّ کو بھی چھیڑنے سے باز نہیں آتی۔ وہ صرف باغ تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ مستانہ وار مسجد کے اندر بھی گھس آتی ہے۔ ایک طرف شیخ کے اوراد و وظائف دوسری طرف صبح کی ٹھنڈی ہواؤں کی نغمگی کہ ساری حیات و کائنات قدرت کی حمد و ثنا میں محو ہو جاتی ہے۔ نسیم سحر کا تذکرہ عبدالحلیم شرر نے یوں کیا ہے کہ جیسے وہ کوئی بے جسم چیز نہ ہو کر اچھی خاصی دلکش و دلربا اور شوخ دوشیزہ ہو۔ اور یہ دوشیزہ درختوں، باغات اور چاند ستاروں کو اپنے لمس سے تھپکی دے کر سلا دیتی ہے۔ اور خوش نوا پرند کو گدگدا کر جگا دیتی ہے۔ نسیم سحر کی خوش خرامیاں دشت و صحرا، کوہ و دریا اور شہر و قریہ کو بیدار کر دیتی ہے۔ اور انہیں مست و سرشار کر دیتی ہیں۔

8.5 فرہنگ۔

الفاظ	:	معنی
نسیم سحر	:	صبح کی ٹھنڈی ہوا
کنج قفس	:	پنجرے کا گوشہ
تاریکی	:	اندھیرا
رندمیکش	:	شراب پینے والا
ازخودرفتہ	:	بےخود ہونا، مدہوش
طیورنغمہ خواں	:	چہچہانے والے پرندے، نغمہ گانے والے
عروس قدرت	:	قدرت کی دلہن
متلاطم	:	طوفانی، موجزن، ٹھاٹھیں مارتا ہوا
سفیر	:	ترجمان، نمائندہ
خوش خرام	:	اچھی چال والا

نامہ بر : قاصد، پیغام لانے والا

نونہالانِ چمن : چمن کے نئے پودے

8.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات:

1۔ انشائیہ نسیم سحر کا تنقیدی جائزہ پیش کیجیے۔

2۔ انشائیہ نسیم سحر کی نثر پر اظہار خیال کیجیے۔

3۔ انشائیہ نسیم سحر کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

4۔ عبدالحلیم شرر کی انشائیہ نگاری پر ایک مضمون لکھیے

8.7 مشقی سوالات:۔

1۔ نسیم سحر کس وقت چلتی ہے؟

2۔ نسیم سحر چلتی ہے تو کس طرح کی کیفیت طارہ ہوتی ہے؟

3۔ نسیم سحر کس چیز کا پیغام دیتی ہے؟

4۔ عبدالحلیم شرر نے نسیم سحر کی خوش خرامی کو کس طرح بیان کیا ہے؟

5۔ عبدالحلیم شرر کے انشائیوں کے کیا امتیازات ہیں؟

8.8 مشقی سوالات کے جوابات۔

1۔ نسیم سحر صبح کے وقت چلتی ہے۔

2۔ نسیم سحر جو صبح کو متوالی بن بن کے چلتی ہے اور جس کی کیفیتیں اس درجہ مؤثر ہیں کہ نوجوانانِ چمن جو قدرتی طور پر یا خود پسندی کے غرور میں بالکل بے حس بنے ہوئے ہیں ان پر بھی ایک ایسا بے خودی کا عالم طاری ہوتا ہے کہ وجد میں آ کے مشغول رقص ہو جاتے ہیں۔

3۔ نسیم سحر صبح خیزی کا پیغام دیتی ہے۔

4۔ خوش خرام نسیم سحر! تو قدرت کی سچی کارفرما ہی نہیں نامہ بر بھی ہے، خدا کے ہاں سے صبح کا پیام دنیا والوں کے پاس تو ہی لاتی ہے، تیری ہی خوش گوارہ خنکی جب محسوس ہوتی ہے تب معلوم ہوتا ہے کہ صبح ہوئی۔ غالباً تیری ہی نازک انگلیوں سے دامن سحر چاک ہوتا ہوگا۔ اس لیے کہ جب کبھی تڑکے آنکھ کھلی ہے ہم نے بچشم خود دیکھا ہے کہ آسمان پر جا کے تاروں کے چراغ تو ہی گل کرتی ہے

5۔ عبدالحلیم شرر کے انشائیوں میں تخیل کی پرواز، منظر نگاری، جذبات انگیزی، رنگیں بیانی اور داستانوی اسلوب کارفرما ہے۔

جوابات سرگرمی۔

1۔ نازک اور خوش رنگ لب

2۔ انسان اپنی مخلوقیت

3۔ سمندر کو اپنے نازک جھونکوں سے

4۔ نامہ بر

5۔ صبح

7.9 امدادی کُتب Books Prescribe

۱۔ انتخاب اُردو نثر) ۱۸۵۷ء ۱۹۲۰ء ایجوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ۔

۲۔ انتخاب اُردو نثر ۱۹۲۰ء کے بعد ای جوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ

Books Recommended.

۱۔ مختصر تاریخ ادب اُردو۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین ترجمہ و اضافے	ڈاکٹر سید محمد عقیل
۲۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح۔	ڈاکٹر وزیر آغا
۳۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح۔	غلام احمد فرقت کاکوروی
۴۔ رشید احمد صدیقی۔ شخصیت اور فن۔	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
۵۔ اُردو انشائیہ۔	وزیر آغا

۶۔ انشائیہ کے فنی سروکار۔	ڈاکٹر احمد امتیاز
۷۔ انشائیہ کی بنیاد۔	ڈاکٹر سلیم اختر
۸۔ فنِ انشائیہ اور انشائیے۔	ڈاکٹر فرحت شمیم
۹۔ انشائیہ کے خدوخال	وزیر آغا
۱۰۔ انشائیہ کی بنیاد	ڈاکٹر سلیم اختر
۱۱۔ انشائیہ اردو ادب میں	ڈاکٹر انور سدید
۱۲۔ انشائیہ	ڈاکٹر آدم شیخ
۱۳۔ ڈپٹی نذیر احمد احوال و آثار	محمد اکرام چغتائی
۱۴۔ مولوی نذیر احمد احوال و آثار	ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی
۱۵۔ لکچروں کا مجموعہ (مرتبہ)	محمد نذیر حسین
۱۶۔ نذیر احمد	نور الحسن نقوی
۱۷۔ فکر و نظر (ڈپٹی نذیر احمد نمبر) علی گڑھ	

سبق نمبر 9۔ تنکے کا سلوک۔ خواجہ حسن نظامی

ساخت

9.0 اغراض ومقاصد
9.1 تعارف
9.2 تنکے کا سلوک
9.2.1 متن کی تدریس
9.3 سرگرمی
9.4 عمومی جائزہ
9.5 فرہنگ
9.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات
9.7 مشقی سوالات
9.8 مشقی سوالات کے جوابات/جوابات سرگرمی
9.9 امدادی کتب

9.0 اغراض ومقاصد:۔

عزیز طلبہ وطلبات

اس سبق کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے۔

انشائیہ تنکے کا سلوک سے متعارف ہوں گے۔

انشائیہ تنکے کا سلوک کی بنیادی باتوں سے واقف ہوں گے۔

انشائیہ تنکے کا سلوک متن کے مشکل الفاظ کے معانی سے واقف ہوں گے۔

انشائیہ تنکے کا سلوک کے متن کی زبان واسلوب سے واقف ہوں گے۔

خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ کی امتیازی خصوصیات سے واقف ہوں گے۔

9.1 تعارف:

خواجہ حسن نظامی اردو ادب کے ممتاز ادیب ،انشائیہ نگار،صحافی اور بلند پایہ نثر نگار تھے۔ان کا شمار اردو کے ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے نہ صرف ادب کو وسعت بخشی بلکہ معاشرے کی اصلاح اور اخلاقی تربیت کو بھی اپنا مقصد بنایا۔ان کی تحریروں میں سادگی ،روانی، شگفتگی ،لطافت ،ظرافت ،انسان دوستی اور اخلاقی اقدار نمایاں نظر آتی ہیں۔خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔انہوں نے سماجی ،سیاسی ،مذہبی ،اخلاقی فلسفیانہ موضوعات کے علاوہ اپنے آس پاس کی معمولی سے معمولی چیز کو موضوع بنایا اور اسے زندہ جاوید کر دیا۔ان کے متنوع موضوعات میں مقصدیت نمایاں ہے۔ان کے انشائیوں میں انسانی کردار ،اخلاق ،محبت ،ہمدردی ،خدمت خلق ،ایثار،قناعت ،سادگی جیسے اوصاف کو بڑی خوب صورتی سے پیش کیا گیا ہے۔

خواجہ حسن نظامی کو زبان اور الفاظ کے انتخاب پر مکمل عبور حاصل ہے۔ان کی قوت مشاہدہ بھی بہت تیز ہے وہ خالص ہندوستانی زبان بالخصوص دہلوی زبان استعمال کرتے ہیں۔ان کے اسلوب کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ پیچیدہ فلسفیانہ اور اخلاقی مسائل کو بھی نہایت آسان عام فہم اور دل نشیں انداز میں بیان کرتے ہیں۔وہ عنوانات کے انتخاب پر بڑا زور دیتے ہیں۔ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ عنوان دلچسپ ہوں تا کہ پہلی نظر ہی میں قاری انشائیہ کو پڑھنے کے لئے آمادہ ہو جائے۔

خواجہ حسن نظامی نے ایک سو سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں۔انہوں نے اپنے مضامین اور انشائیوں میں ہر طرح کے موضوع کو جگہ دی ہے۔ان کے انشائیوں کے چند عنوانات یہ ہیں: سوئی کی لن ترانی ،عرفان کی لکیر ،خدائی گرامفون ،،گلاب تمہارا کیکر ہمارا ،لوہے کی طریقت ،کھوپری کی صدا ،حضرت کن ،پاؤں کا جیل خانہ ،تنکے کا سلوک ،جھینگر کا جنازہ ،لالٹین ،دیا سلائی ،الو،مکھی ،آنسو کی سرگزشت ،گلاب تمہارا کیکر ہمارا

وغیرہ۔ان کے انشائیوں کی سب سے بڑی خصوصیت موضوعات کا انوکھا پن ہے۔''تنکے کا سلوک'' خواجہ حسن نظامی کا انشائیہ ہے۔اس میں صوفیانہ افکار،فطرت کی ترجمانی اور انسانی غرور و عجز کا موازنہ انتہائی لطیف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔اس انشائیے میں مصنف کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں کوئی چیز بے مقصد نہیں۔ہر شئے اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے۔

9.2 تنکے کا سلوک

شیراز کے فلسفی صوفی نے کہا۔درخت کے ہر پتے پر کردگار نرنکار کی معرفت کے دفتر منقوش ہیں یہ سن کر جنگل کے نیم کی ایک ٹہنی کو میں نے جھکایا اور اس کے پتوں سے پوچھا۔خدا کی پہچان کا رجسٹر کس ورق میں ہے۔شاخ جھوم کر بولی۔تم تو ہم کو جھکاتے ہو خود کو جھکو تب وہ مخفی نوشتے نظر آئیں گے۔سنا آپ نے۔میں اور نا ہنجار اشجار کے آگے سر کو خم کروں۔اغیار کے سامنے اس سر کو جھکنے کی عادت نہیں۔میرے سکوت اور پس وپیش نے نیم کی ٹہنی کو موقع دیا کہ اس نے جھنجھلا کر اپنا ہاتھ مجھ سے چھڑا لیا اور دوسری شاخوں نے متحرک ہو کر اپنی گرفتار بہن کو اپنے اندر بلا لیا۔قدم بڑھایا۔چلوں اور کسی دوسرے عارف سے اس نکتے کو حل کروں۔پاؤں کے نیچے دبے ہوئے گیا۔سبز کے تنکے نے آواز دی۔میں بتاؤں۔سنو تو میں سناؤں۔میں جھکا اور اس مہین آواز کو سمجھنے کے لیے گردن خم کی۔نیم کی ٹہنیوں نے جھکتے دیکھ کر نعرۂ شادمانی بلند کیا اور کہا وہ جھکا جس کو انکار تھا۔گھاس کے تنکوں نے مل کر جواب دیا۔دیوانیو! یہ آدمی اس جنس کی جانب جھکا ہے جس سے بنا ہے۔اس کو ایک دن اسی خاک میں آنا ہے اور ہمارے ہی ٹیا محل میں تن گنوانا ہے۔تم ہنسی نہ اڑاؤ۔یہ اشرف المخلوق ہے۔اب میں نے کہا پیارے تنکے۔مجھ کو سلوک کا راستہ بتا اور خدا تک پہنچا۔تنکا بولا۔لکھنؤ جا۔کاغذ بننے کی مشین دیکھ۔وہاں میرے اور تیرے دونوں کے سلوک کی منزلیں طے ہو جائیں گی کہ

کرنا اور سمجھنا دیکھیے اور کہنے سے اچھا ہے

دیکھنا لکھنؤ کی پیپر مل کو۔غریب گھانس کے گٹھے بندھے رکھے ہیں۔پھٹے پرانے گودڑ کے چھکڑے بھرے کھڑے ہیں۔انجن سرگرمِ رفتار ہے۔پھیتے گردش میں مصروف ہیں۔بھاپ بیقراریاں دکھا رہی ہے۔کالا دھواں اونچے مینار سے اوپر کی طرف اڑا چلا جاتا ہے۔تنکے کے سلوک کی پہلی منزل۔پہلا مقام۔پہلا لطیفہ۔صفائی ہے۔مشین اور حجاب غبار کی لڑائی ہے۔لوہے کے پنجے تنکوں کو لکڑی کے تختے پر سمیٹتے ہوئے اوپر کھینچ رہے ہیں اور غریب گھانس عالم بے کسی میں کھنچی چلی جاتی ہے۔

اس منزل کے امتحان سے پہلے تنکے کو دیکھا تو سراپا گرد تھا،معراج امتحان میں جا کر دیکھا تو صاف شفاف پایا۔خاک کا ایک ذرہ بھی

اس کے تن نازک پر موجود نہ تھا۔

میں نے کہا۔ لو اب تو بتاؤ۔ سینہ کدورت سے صاف ہوا۔ تنکا بولا۔ واہ ابھی ایک ہی مقام طے ہوا ہے۔ تزکیۂ ظاہر کے بعد تزکیۂ باطن اور قلب ماہیت درکار ہے۔ دیکھتے دیکھتے ایک کھولتے ہوئے گرم چشمے میں تنکے ڈال دیے گئے اور آسمان سے گر کر زمین پر پہنچے۔ مجھے ان کا گرنا اور گلنا ناگوار ہوا۔ جس طرح کہ میں ایک طالب خدا کو عروج دنیا سے گرتا دیکھ کر ٹھنڈا سانس بھرا کرتا ہوں مگر تنکا ذرا نہ گھبرایا۔ پھر دیکھا تو کرخت تنکوں میں ایک گداخت تھی۔ ابلے ہوئے۔ گلے ہوئے پڑے تھے۔ اب تیسرا دور شروع ہوا۔ مشین نے ان کو پینا اور دلنا شروع کیا اور آن کی آن میں بھرتہ بنا دیا۔ اللہ تیری شان۔ وہ تنکے کی نکیلی آن اور یہ بربادی و مسماری کے سامان۔ چوتھے مقام پر مرشد تیزاب نے ہاتھ پکڑا۔ جسم افسردہ کو سینے سے لگایا۔ کثیف رنگ کٹ گیا۔ سفیدی کا رنگ چڑھا۔ باطن ہر چیز کا سفید ہے، سیاہی عارضی اور حجاب ناپید ہے۔

مقام پنجم میں یہ سفید بھرتہ اشک محبت سے پانی پانی ہوا اور آہن کے رخسار شفاف پر پھیل گیا۔

چھٹے مقام میں حرارت عشق نے اس پانی کو جمایا۔ ساتویں میں کاغذ بنایا اور سکھایا۔ اب ساتوں منزلیں طے کر کے تنکے نے زبان کھولی۔ گھانس سے کاغذ بنا اور وید، قرآن، توریت، انجیل، زبور، پران کے حرفوں کو لے کر نوشت معرفت دکھانے لگا۔ اس وقت کچھ کچھ میری سمجھ میں بھی آنے لگا۔

کیوں میاں تنکے! خود مٹے۔ جب عرفانِ حق کو سمجھانے اور دکھانے کے قابل ہوئے۔ ہمارا کیا بگڑا۔ کباب کو سوخت ہوئی۔ لذت ہم نے اٹھائی۔ تنکے نے کہا۔ تم اپنی قلب ماہیت کر لیتے تو اسی دن میرے اندر کے اسرار پڑھ لیتے۔ گر تم خوددار اور آرام طلب رہے۔ اس لیے میں نے یہ بار سر پر اٹھایا اور خودی کا مٹانا تم کو سکھایا۔ ظاہر میں یہ مٹنا ہے لیکن حقیقت میں زندگی کی یہی بہار ہے۔ جنگل میں بکری کھا لیتی ہے۔ گائے بھینس چر لیتی ہے۔ گھسیارہ گھوڑے کو کھلا دیتا تو یہ سربلندی کہاں میسر آتی کہ میں استاد اور تم شاگرد ہو۔ میں عارف اور تم جاہل ہو۔ تنکے کی گفتگو ختم نہ ہوئی تھی کہ پرانے گدڑوں میں سے ایک پھٹی ہوئی بوسیدہ گدڑی نے پکارا۔ درد آشنا بنانے کو آواز دی۔ میں ناک پر رومال رکھ کر اس غلیظ ڈھیر کو دیکھنے لگا۔ گدڑی نے کہا۔ میں ناک ہی سے بات کرنی چاہتی ہوں۔ اور تم نے اسی کو ڈھک لیا۔

صاحب میں ایک ناک والی حسینہ کا لباس ہوں۔ گو آج انقلابِ دہر کے ہاتھوں اداس ہوں۔

پوچھا: کیوں تم پر کیا بیتی۔ اس کوڑے میں آنے کی کیا افتاد پڑی۔ گدڑی بولی میرے جسم میں چار رنگ کے کپڑے ہیں جن کو ایک بھکاری فقیر نے جوڑا تھا۔ ایک دلاری طوائف کا پارچۂ پشواز ہے۔ دوسرا مولانا نجم الحق کی عبا کا حصہ ہے۔ تیسرا پنڈت ہرنام داس کی پوتھی کا

جزودان ہے۔ چوتھا مسٹر ڈگلس کی قمیص کا ٹکڑا ہے۔

یہ چاروں اپنے اپنے وقت میں ذی رتبہ تھے۔ دلاری طوائف کی پشوازعیش پرستوں کو عزیز تھی۔ مولانا نجم الحق کا چوغہ خدا پرستوں کی آنکھ کا تارا تھا۔ پنڈت ہرنام داس کی پوتھی کا جزودان تمام پنڈتوں کا دین وایمان تھا۔ مسٹر ڈگلس کی قمیص سینۂ حکمرانی کی ہم جلیس تھی۔ مگر افتادِ ایام نے ان چاروں کو اپنے مالکوں کی نظر سے اتارا۔ کوری پر مدتوں ڈلوایا۔ پھر بھکاری کے ہاتھوں میں پہنچایا، اس نے سب کو جوڑ کر ایک گدڑی بنائی اور لباسِ غربت کی عزت دلوائی۔ اب بے چارہ فقیر بھی خدا کے ہاں گیا۔ بارہ برس کے بعد دن پھرے ہیں۔ یہاں آئی ہوں۔ سلوک کے مقامات طے کر کے میں بھی کاغذ بنوں گی اور انسان کو بتاؤں گی کہ تیری مصیبت قلب ماہیت سے دور ہو سکتی ہے۔

یہ باتیں سن کر میں نے نظام المشائخ کے ایڈیٹر کو دیکھا جو خرید کاغذ کی دھن میں تھے۔ چاندی دے کر گدڑیاں اور گھانس کے تنکے لینے چاہتے تھے۔ اس کاغذ پر وہ عقلمندی کی باتیں چھاپیں گے اور خلقت ان حروف کو دیکھ کر ایڈیٹر صاحب کی فضیلت پر واہ واہ کرے گی۔ مگر کون جانے گا کہ اگر نظام المشائخ کے سفید اوراق پر تحریر نہ ہوتی۔ سادے صفحے شائع کر دیے جاتے تو وہ اس باتونی عبارت سیاہ سے زیادہ بلیغ ہوتے۔ بشرطیکہ کسی کو تنکے اور گودڑ کے سلوک سے آگاہی بھی ہوتی۔

9.2.1 متن کی تدریس:

''تنکے کا سلوک'' انشائیے میں شیراز کے ایک فلسفی صوفی کے قول سے گفتگو کا آغاز کیا گیا ہے۔ صوفی کے مطابق درخت کے ہر پتے پر خدا کی معرفت اور قدرت کے آثار موجود ہیں۔ مصنف اس خیال کی حقیقت جاننے کے لیے نیم کے درخت کی ایک شاخ کو جھکا کر اس کے پتوں سے دریافت کرتا ہے کہ خدا کی پہچان کا راز کس ورق میں موجود ہے۔ شاخ جواب دیتی ہے کہ اگر تم ہمیں صرف اپنی طرف سے جھکاؤ گے تو حقیقت تم پر ظاہر نہیں ہوگی، بلکہ جب تم خود جھکو گے اور اپنے اندر کی پردہ پوشی اور غرور کو دور کرو گے تب تمہیں وہ پوشیدہ تحریر نظر آئے گی۔ اس حصے میں فطرت اور معرفت کا گہرا تعلق پیش کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی معرفت کے لیے صرف ظاہری چیزوں کو دیکھنا کافی نہیں بلکہ انسان کے اندر عاجزی اور انکساری کا پیدا ہونا بھی ضروری ہے۔

اس کے بعد مصنف شاخ کے جواب پر اپنے ردِعمل کا اظہار کرتا ہے کہ اقتباس:

''سنا آپ نے۔ میں اور نا ہنجار اشجار کے آگے سر کو خم کروں۔ اغیار کے سامنے اس سر کو جھکنے کی عادت نہیں۔''

اس واقعے کے ذریعے مصنف نے انسانی تکبر کی کمزوری کو ظاہر کیا ہے۔ انسان جب اپنی ذات اور اپنی برتری کے احساس میں مبتلا ہو جاتا ہے تو وہ حقیقت کو سمجھنے سے محروم رہتا ہے۔ اسی دوران اس کے قدموں کے نیچے دبے ہوئے گھاس کے ایک تنکے کی آواز ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتی ہے۔ تنکا مصنف سے کہتا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو وہ اس مسئلے کا جواب دے سکتا ہے۔ مصنف اس معمولی سی آواز کو سننے کے لیے جھک جاتا ہے۔ یہی جھکنا آگے چل کر اس کے فکری سفر میں تبدیلی کا سبب بنتا ہے۔ اس پیراگراف میں تنکا ایک اہم علامت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ یہاں ''تنکا'' دراصل انسان یا طالب حق کی علامت ہے جس طرح تنکا سخت مراحل (پانی، آگ اور تیزاب) سے گزر کر کاغذ بنتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی دنیا کی مصائب، زہد اور ریاضت کے مراحل سے گزر کر روحانی طور پر پاک ہوتا ہے۔ اس کے بعد تنکا سے براہ راست سوال کرتا ہے کہ اے پیارے تنکے! مجھے سلوک کا راستہ بتاؤ اور خدا تک پہنچنے کا طریقہ سمجھاؤ۔ تنکا جواب دیتا ہے کہ لکھنؤ جاؤ اور وہاں کاغذ بنانے کی مشین دیکھ۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''اب میں نے کہا پیارے تنکے۔ مجھے کو سلوک کا راستہ بتا اور خدا تک پہنچا۔ تنکا بولا۔ لکھنو جا۔ کاغذ بننے کی مشین دیکھ۔ وہاں میرے اور تیرے دونوں کے سلوک کی منزلیں طے ہو جائیں گی کہ کرنا اور سمجھنا دیکھیے اور کہنے سے اچھا ہے۔''

اس جواب میں مصنف نے تنکے کے سلوک کو ایک نئے معنی میں پیش کیا ہے۔ تنکا محض ایک گھاس کا ٹکڑا نہیں بلکہ انسان کے لیے ایک رہنما بن جاتا ہے۔ وہ اپنے سفر اور مختلف مراحل کے ذریعے زندگی اور معرفت کا سبق دینے والا ہے۔ تنکے کا یہ جواب اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ حقیقت کو صرف فلسفیانہ گفتگو سے نہیں بلکہ عملی مشاہدے اور تجربے سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ انشائیہ کی شروعات ہی تواضع کے پیغام سے ہوتی ہے۔ تنکا بتاتا ہے کہ خود پسندی اور تکبر کو ختم کیے بغیر انسان معرفت یا سچائی کی بلند منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔

انشائیہ میں ''سلوک'' (تصوف کی راہ) کا سفر ایک منفرد انداز میں دکھایا گیا ہے۔ گھاس کا تنکا مصنف کو لکھنو جانے اور کاغذی کارخانے میں تنکے کا انجام دیکھنے کا مشورہ دیتا ہے۔ وہاں جا کر معلوم ہوتا ہے کہ تنکے کا پہلا مقام ''صفائی'' ہے اسے بھاپ، دھوئیں اور مشین کی تپش و کشمکش سے گزرنا پڑتا ہے تمام لکڑی اور تنکوں کو پیسنے کے بعد جب معراج کا امتحان ہوتا ہے تو وہ بالکل صاف شفاف اور پاک ہو جاتا ہے جس میں خاک کا ایک ذرہ بھی باقی نہیں رہتا۔ یہاں تنکے کی ظاہری صفائی دراصل انسان کی باطنی پاکیزگی کی علامت بن جاتی ہے۔ انسان بھی اپنی شخصیت کی پاکیزگی اور بلندی حاصل کرنے کے لیے مختلف آزمائشوں سے گزرتا ہے۔ صفائی یہاں صرف جسمانی صفائی نہیں بلکہ باطن کی پاکیزگی کی طرف

بھی اشارہ کرتی ہے۔مصنف نے مشین اور غبار کی کشمکش کو ایک علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔سلوک کے راستے میں سب سے پہلی ضرورت صفائی اور پاکیزگی ہے۔جب تک انسان اپنے وجود سے گرد و غبار دور نہیں کرتا، وہ اعلیٰ منزل کی طرف نہیں بڑھ سکتا۔اس پیراگراف میں علامت، تمثیل اور صوفیانہ فکر نمایاں ہے۔

اس انشائیہ میں تنکے کے سلوک کی پہلی منزل کے بعد دوسری منزل یعنی تزکیہ باطن کا ذکر کیا گیا ہے۔کاغذ بننے کا یہ عمل دراصل انسانی روح کے تزکیہ باطن کی علامت ہے۔جس طرح ایک معمولی اور حقیر تنکا سخت آزمائشوں اور بھٹی کی تپش سے گزر کر ایک صاف اور قیمتی کاغذ کی صورت اختیار کر لیتا ہے اسی طرح انسان بھی جب تک اپنے نفس کو غرور اور کثافت سے پاک نہیں کرتا وہ حقیقی معرفت حاصل نہیں کر سکتا۔اس کے بعد سلوک کی تیسری منزل کا ذکر ہے۔مشین تنکوں کو پیسنا اور دلنا شروع کرتی ہے اور تھوڑی ہی دیر میں ان کی سابقہ شکل ختم ہو جاتی ہے۔مصنف اس تبدیلی کو حیرت کے ساتھ دیکھتا ہے کہ جو تنکا پہلے اپنی الگ شناخت رکھتا تھا، اب مشینی عمل کے ذریعے بالکل نئی شکل اختیار کر چکا ہے۔یہاں تنکے کی جسمانی تبدیلی دراصل قلبِ ماہیت کی علامت ہے۔

چوتھی منزل میں مرشد کا کردار سامنے آتا ہے۔مرشد تنکے کے افسردہ جسم کو اپنے قریب کرتا ہے اور اس کی کثافت اور سیاہی کو دور کر کے اس پر سفیدی چڑھا دیتا ہے۔اس پورے عمل میں مرشد کی رہنمائی اور تربیت کا تصور سامنے آتا ہے۔مصنف کا یہ کہنا کہ اقتباس:

''باطن ہر چیز کا سفید ہے، سیاہی عارضی اور حجاب ناپید ہے۔''

یہ جملہ ایک اہم فکری نکتے کی وضاحت کرتا ہے۔اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کی اصل فطرت پاکیزگی ہے، لیکن برائی، خواہشات اور دنیاوی آلودگیوں کے پردے اس پاکیزگی کو چھپا دیتے ہیں۔اس حصہ میں تزکیہ باطن، مرشد کی رہنمائی اور فطری پاکیزگی کا تصور نمایاں ہے۔سلوک کی پانچویں منزل میں سفید ہونے کے بعد تنکا اشکِ محبت سے پانی پانی ہو جاتا ہے اور یہ کیفیت اس کے وجود پر پھیل جاتی ہے۔یہاں پانی محبت اور عشق کی علامت ہے۔مصنف کا کہنا ہے کہ روحانی سفر میں صرف ظاہری اور باطنی صفائی کافی نہیں بلکہ دل میں محبت اور عشق حقیقی کا پیدا ہونا بھی ضروری ہے۔

اس کے بعد سلوک کی چھٹی اور ساتویں منزل کا ذکر کرتے ہوئے تنکے کے سفر کو تکمیل تک پہنچایا گیا ہے۔حرارتِ عشق سے پانی کو جما کر کاغذ بنایا اور پھر اسے خشک کیا جاتا ہے۔آخر کار تنکا اپنی تمام ساتوں منزلیں طے کر کے ایک ایسے کاغذ کی صورت اختیار کرتا ہے جس پر وید، قرآن، توریت، انجیل، زبور اور پران جیسے مذہبی و روحانی متون کے الفاظ درج ہو سکتے ہیں۔یہاں تنکے کی آخری منزل انتہائی معنی خیز ہے۔جو تنکا ابتدا

میں ایک معمولی اور بے وقعت چیز تھا، وہ مختلف مراحل اور آزمائشوں سے گزر کر علم، معرفت اور ہدایت کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ مختلف مذاہب کی مقدس کتابوں کا ذکر مصنف کی وسیع نظر اور مذہبی رواداری کو ظاہر کرتا ہے۔ اس مرحلے پر مصنف نے تنکے سے سوال کرتا ہے کہ تم نے اپنے آپ کو کیوں مٹایا اور اتنی تکلیفیں کیوں برداشت کیں۔ تنکا جواب دیتا ہے کہ :

''تنکے نے کہا۔ تم اپنی قلب ماہیت کر لیتے اسی دن میرے اندر کے اسرار پڑھ لیتے۔ گر تم خوددار اور آرام طلب رہے۔ اس لیے میں نے یہ بار سر پر اٹھایا اور خودی کا مٹانا تم کو سکھایا۔ ظاہر میں یہ مٹنا ہے لیکن حقیقت میں زندگی کی یہی بہار ہے۔ جنگل مین بکری کھا لیتی ہے۔ گائے بھینس چر لیتی ہے۔ گھسیارہ گھوڑے کو کھلا دیتا ہے تو یہ سر بلندی کہاں میسر آتی کہ میں استاد اور تم شاگرد ہو۔ میں عارف اور تم جاہل ہو۔''

تنکے کا یہ کہنا ہے کہ معرفت حاصل کرنے کے لیے انسان کو اپنی خودی، انا، غرور اور آرام طلبی کو چھوڑنا ضروری ہے۔ تنکے نے اپنے وجود کو مٹا کر ایک نئی اور بلند حیثیت حاصل کی، جبکہ انسان اپنی خود پسندی کی وجہ سے حقیقت سے دور رہا۔ یہاں تنکا اپنی حالت اور انسان کی حالت کا تقابل کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر وہ جنگل میں ہی پڑا رہتا تو بکری، گائے، بھینس یا گھوڑا اسے کھا لیتا اور اسے یہ سر بلندی حاصل نہ ہوتی۔ لیکن اس نے اپنی پہلی حالت کو چھوڑا، تکلیفیں برداشت کیں اور مختلف مراحل سے گزرا، اس لیے اب وہ استاد اور انسان شاگرد کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اس حصے میں مصنف نے نہایت خوب صورتی سے ظاہری کم مائیگی اور حقیقی عظمت کا فرق واضح کیا ہے کہ تنکا بظاہر معمولی ہے، لیکن اپنی قربانی اور تبدیلی کی وجہ سے معرفت کا استاد بن جاتا ہے، جبکہ انسان اپنی خودداری اور آرام طلبی کے باعث جاہل رہ جاتا ہے۔ اس طرح مصنف نے انسان کو اپنی حقیقت اور پہچان کی طرف متوجہ کیا ہے۔

تنکے کی گفتگو ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ پرانی گدڑوں کے ڈھیر میں سے ایک پھٹی ہوئی گدڑی مصنف کو آواز دیتی ہے۔ مصنف اس کے غلیظ اور بوسیدہ ہونے کی وجہ سے ناک پر رومال رکھ لیتا ہے۔ اس حصے میں انسان کی ظاہری نفاست پسندی پر چوٹ کی گئی ہے کہ کسی چیز کی اصل حقیقت جانے بغیر اس کی موجودہ ظاہری حالت دیکھ کر اسے حقیر سمجھ لینا درست نہیں۔ گدڑی کا کردار قاری کو چیزوں کی حقیقت کو گہرائی سے سمجھنے کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ گدڑی اپنے ماضی کے بارے میں بتاتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اس کے جسم میں چار مختلف رنگوں کے کپڑے شامل ہیں۔ ایک حصہ دلاری طوائف کے لباس کا، دوسرا مولانا نجم الحق کی عبا کا، تیسرا پنڈت ہرنام داس کی پوتھی کا اور چوتھا مسٹر ڈگلس کی قمیص کا حصہ تھا۔ اس طرح گدڑی کے اندر مختلف طبقات، مذاہب اور معاشرتی حیثیتوں کے نمائندہ ٹکڑے جمع ہو گئے ہیں۔ مصنف نے گدڑی کے ذریعے معاشرے کے

مختلف طبقوں کو ایک ہی وجود میں جمع کر کے انسانی برابری اور سماجی تضاد کو نمایاں کیا ہے۔مختلف قسم کے پرانے کپڑوں کے ایک ہی کاغذ کے روپ میں ڈھل جانے کے واقعہ سے مصنف نے مساوات اور انسانوں کے اتحاد کا درس دیا ہے۔انسان کی ظاہری حیثیت یا لباس سے اس کی حقیقی قدر و منزلت متعین نہیں ہوتی۔

مجموعی طور پر ''تنکے کا سلوک'' میں یہ پیغام دیا گیا ہے کہ انسان کو سختیوں اور آزمائشوں سے گھبرانا نہیں چاہیے کیونکہ انسان کا تزکیہ اور اس کی حقیقی قدر و قیمت آزمائشوں اور عاجزی کے بعد ظاہر ہوتی ہے۔تنکا اور گدڑی دونوں انسان کے روحانی و اخلاقی سفر کی علامت ہیں۔خواجہ حسن نظامی نے سادہ زبان میں تصوف کے ایک باریک اور گہرے نقطے کو انشائیہ کے قالب میں ڈھال کر لازوال بنا دیا ہے۔

9.3 سرگرمی:

1۔ اغیار کے سامنے اس۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نہیں۔

2۔ اس منزل کے امتحان سے پہلے تنکے کو دیکھا تو۔۔۔۔۔۔۔۔تھا۔

3۔ تم اپنی قلب ماہیت کر لیتے تو اسی دن میرے اندر کے۔۔۔۔۔۔۔۔پڑھ لیتے۔

4۔ باطن ہر چیز کا سفید ہے، سیاہی عارضی اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہے۔

5۔ انسان کی ظاہری حیثیت یا لباس سے اس کی۔۔۔۔۔۔۔۔۔متعین نہیں ہوتی۔

9.4 عمومی جائزہ:

''تنکے کا سلوک'' ایک منفرد صوفیانہ، فلسفیانہ اور اصلاحی تحریر ہے جس میں مصنف نے تنکے اور گدڑی کے استعاروں کے ذریعے انسان کے روحانی، اخلاقی سفر، تزکیہ نفس اور معرفت حق کے مفہوم کو واضح کیا ہے۔بظاہر ایک معمولی تنکا اس انشائیے میں ایک ایسے رہنما کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو انسان کو ظاہری غرور اور خود پسندی سے نکل کر حقیقت کی طرف متوجہ ہونے کا درس دیتا ہے۔یہاں تنکا دراصل انسان یا طالب حق کی علامت ہے جس طرح تنکا سخت مراحل (پانی، آگ اور تیزاب) سے گزر کر کاغذ بنتا ہے۔اس طرح انسان بھی دنیا کی مصائب، زہد اور ریاضت کے بعد ہی روحانی طور پر پاک ہوتا ہے۔

انشائیہ کی شروعات ہی تواضع کے پیغام سے ہوتی ہے تنکا بتاتا ہے کہ خود پسندی اور تکبر کو ختم کئے بغیر کوئی انسان معرفت یا سچائی کی بلند منزل نہیں پہنچ سکتا۔ اور مختلف قسم کے پرانے کپڑوں کے ایک ہی کاغذ کے روپ میں ڈھل جانے کے واقعہ سے مصنف نے مساوات اور انسانوں کے اتحاد کا درس دیا ہے انسان کی ظاہری حیثیت یا لباس سے اس کی حقیقت نہیں بدلتی۔

انشائیہ میں سلوک کا سفر ایک منفرد انداز میں دکھایا گیا ہے۔ کاغذ بننے کا یہ عمل دراصل انسانی روح کے تزکیہ باطن کی علامت ہے۔ جس طرح ایک معمولی اور حقیر تنکا سخت آزمائشوں اور بھٹی کی تپش سے گزر کر ایک صاف اور قیمتی کاغذ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی جب تک اپنے نفس کو غرور اور کثافت سے پاک نہیں کرتا وہ حقیقی معرفت حاصل نہیں کر سکتا۔ خواجہ حسن نظامی نے سادہ اور سستہ زبان میں تصوف کے ایک باریک نقطے کو انشائیہ کے قالب میں ڈھال کر لازوال بنا دیا ہے۔

خواجہ حسن نظامی نے اس انشائیہ میں طنز و مزاح، تمثیل، علامت اور صوفیانہ فکر کو نہایت خوب صورتی سے یکجا کیا ہے۔ تنکا، گھاس، نیم کی شاخ، گدڑی، مشین اور کاغذ سب علامتی کردار ادا کرتے ہیں اور ان کے ذریعے انسانی زندگی، غرور، عاجزی، فنا اور معرفت جیسے گہرے موضوعات کو عام فہم انداز میں پیش کیا ہے اور آخر میں تحریر اور علم کی حقیقت کی طرف بھی توجہ دلاتا ہے اور یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ محض الفاظ اور عبارت کی ظاہری چمک سے زیادہ اہم ان کے اندر پوشیدہ معرفت اور حقیقت ہے۔

مجموعی طور پر ''تنکے کا سلوک'' ایک فکری اور اصلاحی انشائیہ ہے جس میں ایک معمولی تنکے کو مرکز بنا کر انسان کے روحانی و اخلاقی سفر کی داستان بیان کی گئی ہے۔ انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ سختیوں اور آزمائشوں سے گھبرانا نہیں چاہیئے، کیونکہ انسان کا تزکیہ اور اس کی حقیقی قدر و قیمت انہیں آزمائشوں اور عاجزی کے بعد ظاہر ہوتی ہے۔

9.5 فرہنگ:

(الفاظ) (معنی)

سلوک : برتاؤ، رویہ

شگفتگی : خوش مزاجی، تازگی

دل آویز	:	دل کو بھانے والا، دلکش
محو	:	گم، مشغول، کھویا ہوا
خم	:	جھکا ہوا، خمیدہ
حرارت	:	گرمی، تپش، کیفیت
مخفی	:	چھپا ہوا، پوشیدہ
کدورت	:	کینہ، رنجش، ملال
گداخت	:	نرمی، لچک
عارضی	:	غیر مستقل، وقتی
کراخت	:	سخت
ناہید	:	غائب، نظروں سے اوجھل
پارچہ	:	ٹکڑا، حصہ
بے نیازی	:	بے پروائی، لاتعلقی
قناعت	:	تھوڑی چیز پر رضامندی
نمود و نمائش	:	دکھاوا، ریاکاری، شان و شوکت
اغیار	:	اجنبی، پرائے، نا آشنا
عارف	:	جاننے والا، واقف
تن	:	جسم ، پیکر
غبار	:	دھول، گرد
درکار	:	ضروری، مطلوب
مسماری	:	تباہی و بربادی، انہدام

آہن : لوہا،فولاد

نوشت : تحریر،کتابت،دستاویز

افتاد : سانحہ،ناگہانی آفت

9.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات:

1۔ انشائیہ تنکے کا سلوک کا تنقیدی جائزہ پیش کیجیے۔

2۔ انشائیہ تنکے کا سلوکی نثر پر اظہار خیال کیجیے۔

3۔ انشائیہ تنکے کا سلوک کا خلاصہ تحریر کیجیے

4۔ تنکے کا سلوک کے حوالے سے خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری پر ایک مضمون لکھیے ۔

9.7 مشقی سوالات:

1۔ لکھنؤ کی پیپر مل میں مصنف نے تنکے کا کیا حال دیکھا؟

2۔ تنکے کے سلوک کی پہلی منزل کے بعد مصنف اور تنکے کے درمیان کس طرح کا مکالمہ ہوا؟

3۔ چوتھے مقام پر تنکے کا کیا حال تھا؟

4۔ آخری مقام کے بعد تنکے نے مصنف سے کیا کہا؟

5۔ مصنف نے تنکے کے ذریعہ کیا پیغام دیا ہے؟

9.8 مشقی سوالات کے جوابات جوابات سرگرمی:

-1 غریب گھانس کے گٹھے بندھے رکھے ہیں۔ پھٹے پرانے گودڑ کے چھکڑے بھرے کھڑے ہیں۔انجن سرگرمِ رفتار ہے۔پھیتے گردش میں مصروف ہیں۔ بھاپ بیقراریاں دکھارہی ہے۔کالا دھواں اونچے مینار سے اوپر کی طرف اڑا چلا جاتا ہے۔

-2 میں نے کہا۔لواب تو بتاؤ۔سینہ کدورت سے صاف ہوا۔تنکا بولا۔واہ ابھی ایک ہی مقام طے ہوا ہے۔تزکیۂ ظاہر کے بعد تزکیۂ باطن اور قلب ماہیت درکار ہے۔دیکھتے دیکھتے ایک کھولتے ہوئے گرم چشمے میں تنکے ڈال دیے گئے اور آسمان سے گر کر زمین پر پہنچے۔مجھے ان کا

گرنا اور گلنا ناگوار ہوا۔ جس طرح کہ میں ایک طالب خدا کو عروج دنیا سے گرتا دیکھ کر ٹھنڈا سانس بھرا کرتا ہوں مگر تنکا ذرا نہ گھبرایا۔

3- چوتھے مقام پر مرشد تیزاب نے ہاتھ پکڑا۔ جسم افسردہ کو سینے سے لگایا۔ کثیف رنگ کٹ گیا۔ سفیدی کا رنگ چڑھا۔ باطن ہر چیز کا سفید ہے، سیاہی عارضی اور حجاب ناپید ہے۔

4- تنکے نے کہا۔ تم اپنی قلب ماہیت کر لیتے تو اسی دن میرے اندر کے اسرار پڑھ لیتے۔ گر تم خوددار اور آرام طلب رہے۔ اس لیے میں نے یہ بار سر پر اٹھایا اور خودی کا مٹانا تم کو سکھایا۔ ظاہر میں یہ مٹنا ہے لیکن حقیقت میں زندگی کی یہی بہار ہے۔ جنگل میں بکری کھا لیتی ہے۔ گائے بھینس چر لیتی ہے۔ گھسیارہ گھوڑے کو کھلا دیتا تو یہ سربلندی کہاں میسر آتی کہ میں استاد اور تم شاگرد ہو۔ میں عارف اور تم جاہل ہو۔

5- مصنف نے تنکے اور گدڑی کے استعاروں کے ذریعے انسان کے روحانی، اخلاقی سفر، تزکیہ نفس اور معرفت حق کے مفہوم کو واضح کیا ہے۔ بظاہر ایک معمولی تنکا اس انشائیے میں ایک ایسے رہنما کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو انسان کو ظاہری غرور اور خود پسندی سے نکل کر حقیقت کی طرف متوجہ ہونے کا درس دیتا ہے۔ یہاں تنکا دراصل انسان یا طالب حق کی علامت ہے جس طرح تنکا سخت مراحل (پانی، آگ اور تیزاب) سے گزر کر کاغذ بنتا ہے۔ اس طرح انسان بھی دنیا کی مصائب، زہد اور ریاضت کے بعد ہی روحانی طور پر پاک ہوتا ہے۔

جوابات سرگرمی:

1۔ سر کو جھکنے کی عادت

2۔ سراپا گرد

3۔ اسرار

4۔ حجاب ناپید

5۔ حقیقی قدر و منزلت

9.9 امدادی کُتب Books Prescribe

ا۔ انتخاب اُردو نثر) ۱۸۵۷ء ۱۹۲۰ء ایجوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ۔

۲۔ انتخاب اُردو نثر ۱۹۲۰ء کے بعد ای جوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ

Books Recommended.

۱۔	مختصر تاریخ ادب اُردو۔ڈاکٹر سید اعجاز حسین ترجمہ واضافے	ڈاکٹر سید محمد عقیل
۲۔	اُردو ادب میں طنز ومزاح۔	ڈاکٹر وزیر آغا
۳۔	اُردو ادب میں طنز ومزاح۔	غلام احمد فرقت کاکوروی
۴۔	رشید احمد صدیقی۔شخصیت اور فن۔	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
۵۔	اُردو انشائیہ۔	وزیر آغا
۶۔	انشائیہ کے فنی سروکار۔	ڈاکٹر احمد امتیاز
۷۔	انشائیہ کی بنیاد۔	ڈاکٹر سلیم اختر
۸۔	فنِ انشائیہ اور انشائیے۔	ڈاکٹر فرحت شمیم
۹۔	انشائیہ کے خدوخال	وزیر آغا
۱۰۔	انشائیہ کی بنیاد	ڈاکٹر سلیم اختر
۱۱۔	انشائیہ اردو ادب میں	ڈاکٹر انور سدید
۱۲۔	انشائیہ	ڈاکٹر آدم شیخ
۱۳۔	ڈپٹی نذیر احمد احوال وآثار	محمد اکرام چغتائی
۱۴۔	مولوی نذیر احمد احوال وآثار	ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی
۱۵۔	لکچروں کا مجموعہ (مرتبہ)	محمد نذیر حسین
۱۶۔	نذیر احمد	نور الحسن نقوی
۱۷۔	فکر ونظر (ڈپٹی نذیر احمد نمبر) علی گڑھ	
۱۸۔	خواجہ حسن نظامی: شخصیت اور ادبی خدمات	نثار احمد فاروقی
۱۹۔	خواجہ حسن نظامی کی نثر	ڈاکٹر مولا بخش
۲۰۔	خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری	سید محمد نیر رضوی
۲۱۔	خواجہ حسن نظامی کتاب نما	خصوصی شمارہ

سبق نمبر۔10 تدریس متن ''وکیل صاحب'' - رشید احمد صدیقی

ساخت

10.0 اغراض ومقاصد

10.1 تعارف

10.2 رشید احمد صدیقی کی مختصر حالات زندگی

10.2.1 انشائیہ ''وکیل صاحب'' کا متن

10.3 ''وکیل صاحب'' کا تجزیاتی مطالعہ

10.3.1 سرگرمی۔آؤ اپنی پیش رفت جانچیے

10.4 عمومی جائزہ

10.5 فرہنگ

10.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

10.7 مشقی سوالات وجوابات

10.8 جوابات سرگرمی

10.9 امدادی کتب

10.0 اغراض ومقاصد

عزیز متعلم اس سبق کے مطالعے کے بعد اس قابل ہو جائیں گے کہ

رشید احمد صدیقی کی حیات وادبی خدمات سے واقف ہوسکیں گے۔

رشید احمد صدیقی کی انشائیہ نگاری سے واقف ہوسکیں گے۔

رشید احمد صدیقی کے انشائیہ ''وکیل صاحب'' کی تفہیم وتجزیہ کرسکیں گے۔

اردو انشائیہ نگاروں میں رشید احمد صدیقی کے مقام ومرتبے کو سمجھ سکیں گے۔

رشید احمد صدیقی کی انشائیہ نگاری کی فکری وفنی خصوصیات سے واقف ہوسکیں گے۔

10.1 تعارف

رشید احمد صدیقی نے اردو ادب میں طنز ومزاح کی روایت مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ رشید احمد صدیقی کی تحریروں کا مطالعہ کرتے وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ صرف مزاح نگار ہی نہیں بلکہ اچھے انشائیہ نگار بھی ہیں۔ ان کا انشائیہ ''وکیل صاحب'' اردو انشائیوں میں اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے انشائیوں میں سماج وماحول اور واقعات کے اثرات موجود ہیں۔ ان کی تحریروں میں میانہ روی ہے اور وہ نہ کسی سے بے حد متاثر ہوتے ہیں اور نہ کسی سے نفرت کرتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کی صدا بہار تحریریں اردو کے طنزیہ ومزاحیہ ادب میں بیش بہا اضافہ ہیں۔ انہوں نے مزاحیہ ادب کو ایک نئے اسلوب سے ہمکنار کیا اور ان کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ ان کا اسلوب نثر قاری کو اپنا گرویدہ بنالیتا ہے۔

10.2 رشید احمد صدیقی کی مختصر حالات زندگی

رشید احمد صدیقی 25 دسمبر 1894 کو بلیا میں پیدا ہوئے اور اکثر محققین کا ماننا ہے کہ ان کی تاریخ پیدائش 25 دسمبر 1894 ہی ہے۔ رشید احمد صدیقی کا گھرانہ بھی مشرقی ذہنیت کا حامل تھا۔ رشید احمد صدیقی کی ابتدائی تعلیم جونپور اور اعظم گڑھ میں ہوئی۔ انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔اے، ایل۔ایل۔بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اور اسی یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ ہوگئے اور اردو ادب میں انہوں نے ایک منفرد شناخت قائم کی۔ مزید براں بہت سی کتابیں تحریر کیں اور متعدد تنقیدی وتحقیقی مضامین سے اردو دنیا میں طنز ومزاح کے میدان میں اپنا لوہا منوایا۔ رشید احمد صدیقی کی تخلیقی وتنقیدی نگارشات بہت ہیں۔ ان کے بہت سے طنز ومزاح کے مضامین کے مجموعے ہیں جس سے ان کو شہرت دوام حاصل ہوا۔ ان کی اہم کتابوں میں طنزیات ومضحکات، خنداں، مضامین رشید، گنج ہائے گراں مایہ، آپ بیتی، اردو ادب میں اہم

مقام رکھتی ہیں۔

اردو انشائیہ نگاری میں رشید احمد صدیقی نے اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے۔ان کے انشائیوں کی سب سے نمایاں خصوصیات طنز و مزاح ہے۔اسی ظرافت کی وجہ سے وہ دوسرے معاصرین انشائیہ نگاروں سے سبقت لے جاتے ہیں۔اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ انہوں نے اپنے انشائیوں میں حقیقت پسندی اور غیر جانبداری سے کام لیا ہے اور جن کرداروں کا انتخاب کیا ہے ان کی خوبیوں اور خامیوں کو چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ان کو زبان و بیان پر عالمانہ قدرت حاصل تھی۔

10.2.1 انشائیہ ''وکیل صاحب'' کا متن

متعدد ناکام حملوں کے بعد ایک روز جون کے مہینے میں معلوم ہوا کہ ہمارا ہیرو یونیورسٹی میں حق بخشوانے میں کامیاب ہوا اور ایک نیا سوٹ، پرانی ٹائی اور اس سے پرانی ٹوپی جو ایام دماغ سوزی کی تفسیر روغنی ہو کر رہ گئی تھی زیبِ سر کر کے کلکٹر صاحب کے بنگلے سے لے کر نینی تال کی بلندیوں تک ڈپٹی کلکٹر کا گز بن گیا تھا۔گرمی کا موسم جنون و مراق کے لیے مضر ہوتا ہے۔اسی لیے نینی تال، مسوری، شملہ، کسولی وغیرہ میں جب دو ایک گرمیاں سر سے گزر جاتی ہیں تو بقول شخصے ''مغز کی گرمی'' چھٹ جاتی ہے۔مکان واپس آتے ہی والدین جو بی۔اے پاس ہو جانے کے بعد قانون پڑھانا اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں جتنا حکما منضج کے بعد مسہل دینا اور لیڈرانِ قوم اسپیچ کے بعد چندہ لینا۔ان کو قانون کا امتحان پاس کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔یہ بھی ایک مدت کی سرگرانی کے بعد ''نے محقق بود نہ دانش مند'' ہو کر واپس آئے۔اب جو دیکھیے تو ایک ٹوٹے ہوئے سائبان میں ایک خانہ ساز کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔سامنے ان کے خیالات کی طرح ڈانواں ڈول ایک میز ہے جس کا ایک پاؤں کسی حادثے کی نذر ہو گیا تھا، اس کے نیچے تین اینٹیں تلے اوپر رکھی ہوئی ہیں۔اوپر تین چار کتابیں ہیں جن کو دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتے تھے، اتنے میں ایک گاؤں سے کوئی دہقاں اونچی دھوتی، کندھے پر لاٹھی اور لاٹھی کے سرے پر اس کا ایک جوڑا جوتا، جس پر تیل اور گرد کی تہیں جم چکی تھیں۔پشت پر پیتل کا ایک لوٹا اور ایک میلی مختصر پوٹلی باہم دست و گریباں، کچھ بوکھلایا ہوا کچھ چوکنا رک کر آتے ہوئے دیکھا۔فوراً سب سے موٹی کتاب کو اس بد حواسی کے ساتھ کھینچ کر بیچ میں سے پڑھنا شروع کر دیا کہ دوسری کتابیں میز پر منتشر ہو گئیں۔اس خلفشار میں میز کا پایہ اینٹ پر سے کھسک گیا لیکن ڈگمگاتی ہوئی میز کو ایک طرف سے اپنے پاؤں سے سنبھال کر فوراً دریائے فکر میں غوطے لگانے لگے، ساتھ ہی ساتھ کنکھیوں سے دہقاں کو بھی دیکھتے جاتے تھے۔بدقسمتی سے اس کا رخ دوسری طرف مائل ہو گیا۔انہوں نے مایوسی سے کتاب کو میز پر پٹک دیا۔میز پہلے ہی سے ڈگمگا رہی تھی، ہل چل

سے قلابازی کھا گئی قہرِ درویش بر جانِ درویش۔ سر جھکائے ہوئے کانٹے درست کر رہے تھے کہ ایک دوسرا موکل نظر آیا معاً اپنی حالتِ زار کا اندازہ کیا اور سر اٹھا کر کرسی پر واپس آنا چاہتے تھے لیکن یہ بھول گئے کہ سر میز کے نیچے ہے۔ اٹھے تو سر میز سے ٹکرا گیا کسان قریب آیا، چوٹ کی وجہ سے ایک ہاتھ مقامِ ماؤف پر، آنکھیں ڈبڈبائی ہوئیں، کچھ خفت، کچھ غصہ لیکن یہ سب حالتیں اس امید پر قابلِ برداشت تھیں جو نو وارد کی ذات سے وابستہ تھی۔ آنکھوں کے اشارے سے مطلب دریافت کیا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے کہ اس نگاہ میں یاس و امید کے کیسے مدو جزر اٹھ رہے تھے کتنے ایسے ہیں جو اس بدنصیب کی ان مبارک اور خوش آئند امیدوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو اس نے طالب علمی کے زمانے میں محنت کاور کلفت کی گھڑیوں میں، شب کی تاریکی، صبح کی سپیدی اور شام کے دھندلکے میں مستقبل کے لیے قائم کر رکھی تھیں۔ نو وارد نے ایک دوسرے وکیل کا پتہ دریافت کیا۔ غریب نے ایک طرف کو اشارہ کر دیا۔ کسان روانہ ہو گیا۔ وکیل صاحب کی مایوس نگاہیں کچھ دور تک جانے والے کے ساتھ گئیں پھر تھک ہار کر کہیں رہ گئیں۔

دن کے نو بجے ہیں وکیل صاحب نے کچھ کھا پی کر بستہ سنبھالا۔ شہر کے چوراہے پر یکے کے انتظار میں جا کر کھڑے ہوئے ایک ہاتھ میں بدرنگ چھتری، دوسرے میں بستہ، بغل میں چوغہ کی پوٹلی دو آنے سواری پر مُصر یہ ڈیڑھ آنے سے زیادہ دینے پر تیار نہیں۔ جتنے یکے والے سامنے سے گزرے سبھی سے ردوقدح ہوئی کسی نے ان کا خیال نہیں کیا، کسی نے سخت وسست بھی کہہ دیا۔ غلط راستے پر کھڑے تھے ایک گھوڑے سے ٹکراتے بچے۔ کانسٹبل نے ڈانٹا اور یہ بے چارے سمٹا کر ایک طرف ہو لیے۔ ایک نہایت حقیر اور شکستہ دو سواریاں پہلے سے موجود تھیں، اس میں ایک زنانی سواری بھی تھی۔ یکہ بان پیرِ فرتوت بقول سودا گھوڑا جسے آگے سے تو بڑا کھلایا جائے اور پیچھے سے لاٹھی ماری جائے تو چلنے پر آمادہ ہو ورنہ پاؤں کے نیچے پہیے لگانے کی ضرورت ہو۔ بہ ہزار دقت ڈیڑھ آنے پر معاملہ طے وا۔ یکہ بان کے ساتھ تیسری سواری ہو کر بیٹھے، بستہ بغل میں سر پر چھتری۔ یکہ روانہ ہوا۔ گھوڑے کی چال ان سواریوں کی حالتِ زار کے مطابق تھی۔ ہر ایک پر وجد طاری تھا اور ہچکولوں کی تال وسم پر سر دھنتا تھا یا وکیل صاحب ضابطۂ فوجداری یا ضابطۂ دیوانی کی معلوم نہیں کس دفعہ میں غلطاں و پیچاں تھے کہ گھوڑے نے ٹھوکر لی بستہ معہ پوٹلی کے زمین پر آ رہا۔ اور خود کہنیوں کے بل گھوڑے کی پیٹھ پر آ رہے۔

کرایہ کے یکے اور گاڑیوں کو کچہری کے دروازے تک جانے کی اجازت نہ تھی۔ احاطہ کے باہر وکیل صاحب اتر گئے اور نظر بچاتے ہوئے کچہری کی عمارت میں آئے۔ بستہ عرائض نویسوں اور محرر کے بوریے پر رکھا، پوٹلی سے نکال کر گاؤن زیبِ تن کیا ایک مدت گزری کبھی اس چوغہ کا رنگ سیاہ تھا امتدادِ زمانہ اور وکیل صاحب کے پیش رووں کی سرپرستی سے اس کی رنگت ان بالوں کی سی ہو گئی تھی جن پر عرصہ سے خضاب نہ

لگایا گیا ہو۔ پچھلے دامن کی گوٹ علیٰحدہ ہو کر نیم بیضاوی شکل میں ان کی بے گناہی پر خندہ دنداں نما تھی۔ اس دامن کی شہادت کے بارے میں بعض اشخاص شبہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ سعادت ایک موکل کی دراز دستی سے حاصل ہوئی تھی۔

وکیلوں کے کمرے میں پہنچے، یہاں کس کا کون پرسانِ حال ہوتا۔ ہمارا ہیرو مایوسی و درماندگی کی تصویر بنا ہوا ایک گوشہ میں بیٹھ کر سب سے سستے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر آخری سگریٹ پینے لگا۔ خیالات کا ہجوم کمرے میں ہوا کا گزر نہیں۔ دھوئیں کے حلقے فضا میں تحلیل ہو رہے تھے، شور پکار سے کمرہ گونج رہا تھا۔ سامنے ایک بوڑھے بنگالی وکیل کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک میلا بھدے قسم کا کورٹ اسی کپڑے کا پائجامہ، پاؤ میں کریب سول پر لگی ہوئی تھی۔ چاروں طرف موکل جھکے ہوئے تھے۔ کچھ نوجوان وکیل ارد گرد بیٹھے ہوئے تھے جن کو وہ کبھی کبھی بنگلہ زبان میں کچھ نہ کچھ سمجھاتے جاتے تھے۔ تھوڑی دیر میں ایک شخص ہانپتا کانپتا کمرے میں آیا اور کہنے لگا، حضور پکار ہو رہی ہے۔ بوڑھا بنگالی اجلاس پر پہنچا۔ چپراسی نے جھک کر سلام کیا اور اس نے پہنچ کر دو ہی ایک جملے کہے، مقدمے کی سماعت ملتوی کر دی گئی، تاریخ بھی بدل دی گئی۔ روپیوں کے بوجھ سے بنگالی وکیل کی مضبوط جیب کسی قدر اور لٹک گئی۔ اسی دوران میں حلوائی کا چھوٹا لڑکا پیپل کے ایک ہی پتے کے ہرے دونے میں دو گلاب جامن لایا۔ پیتل کے منجھے ہوئے لوٹے میں پانی بھرا ہوا تھا۔ بنگالی وکیل نے کریپ سول کا جوتا علیٰحدہ کیا۔ دونوں گلاب جامنوں کو داہنے ہاتھ کی انگشتِ شہادت اور انگوٹھے سے اٹھا کر ٹھیک حلق کے اندیکے بعد دیگرے ٹپکا دیا۔ پورے لوٹے کا پانی ایک سانس میں پی گیا۔ انگوٹھے کو منہ سے، منہ کو انگوٹھے سے پوچھا اور مسئلوں کی ورق گردانی میں مصروف ہو گیا۔ کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ یہ شخص کتنی دولت کا مالک تھا۔ رائے بہادر، سی۔ آئی۔ ای، پانچ ہزار روپیہ ماہوار آمدنی اور بینک آف انگلینڈ میں دس لاکھ کا حصہ دار۔

''.....حاضر ہے''، عدالت میں پکار ہوئی۔ چپراسی نے کرخت آواز میں مستغیثہ کو آواز دی۔ ایک غریب نوجوان شریف عورت میلے کچیلے لباس میں عدالت کے دروازے پر متوحش کھڑی تھی۔ اس بدنصیب سے چپراسی کو کوئی رقم وصول نہی ہوئی تھی۔ بڑے سخت لہجے میں پوچھا تیرا وکیل کون ہے۔ غریب عدالت سے ناواقف طرح طرح کے لوگوں کا ہجوم، عدالت کا ایوان، ہر طرف دوڑ، دھوپ اور ڈانٹ ڈپٹ، یہ غریب ایک دور افتادہ گاؤں کی رہنے والی جس نے سادہ دل کسان اور مویشیوں کے علاوہ کچھ اور نہیں دیکھا تھا۔ اس ہنگامے سے اور زیادہ مبہوت ہو گئی۔ چپراسی نے جواب نہ پا کر دھتکار دیا۔ سامنے سے ایک وکیل کا گزر ہوا، سر چھوٹا پیٹ بڑا، نیت کھوٹی، آواز بھاری۔ عورت نے آنکھوں سے پانی کس مپرسی کی خاموش داستان سنا دی۔ وکیل اس عورت کی طرف سے اسی مقدمے کی پیروی کر چکا تھا۔ عورت کی بے بسی کو نظر انداز کر کے فیس کا طالب وہا۔ غریب نے ہزاروں منتیں کیں، بیوگی اور بے مائگی کا سانحۂ غم رو رو کر سنایا لیکن وکیل نے توجہ نہ کی اور آگے بڑگ گیا۔ غریب نے ایک بار پھر

عدالت تک پہنچنا چاہا لیکن چپراسی سختی سے مانع ہوا اور مقدمہ عدم پیروی میں خارج ہو گیا۔

ایک اور وکیل صاحب کلکتہ ہائی کورٹ میں مدت تک کام کر چکے تھے، زمانے کی گردش سے مفلوک الحال ہو گئے تھے، زندگی کا آفتاب لبِ بام تھا۔ کہولت اور کمزوری کے باعث نشست و برخاست میں دقت ہوتی ہے، لیکن قانون کے روگ میں اب تک مبتلا ہیں۔ عدالت میں ان کا وجود سب پر وبال ہے۔ وکلاء یا حکام کی لائبریری میں ان کا گزر ہوتا ہے تو لوگ بے رخی سے پیش آتے ہیں تازہ نظائر کے مطالعے کے شائق ہیں اور ان کا خلاصہ اپنی اس نوٹ بک میں درج کرتے جاتے ہیں جس کے اطراف کی جلد مدت ہوئی حقِ رفاقت ادا کر کے واصل بحق ہو چکی ہے اور اِدھر اُدھر کے دس بیس اوراق بھی غائب ہو چکے ہیں۔ ہاتھ میں میلے اور مل گجے کاغذات کا ایک پلندہ رہتا تھا جس کی نسبت یقین کے ساتھ کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی تھی۔ ملکی مسائل اور سیاسی اصول پر اس سرگرمی اور جوش کے ساتھ گفتگو کرتے کہ لوگ متحیر رہ جاتے۔ قانونی نکات خوب سمجھتے تھے لیکن ان کا حلیہ ان کی حالت ان کی کہولت کچھ ایسے اسباب تھے کہ ان کی طرف کوئی رخ نہیں کرتا تھا۔

ان کی وضعداری کو دیکھیے، دس بجے دن سے پانچ بجے شام تک نیچے نہ بیٹھتے اور کبھی ایک پیسہ نہ کمایا شام کو گھر کی مراجعت کرتے تو آدھ گھنٹے سے کم وقت کرایہ چکانے میں صرف نہیں کرتے تھے۔ یکہ والے ان کی صورت دیکھ کر پناہ مانگتے تھے۔ کہ الف لیلیٰ کے اس تسمہ پا بوڑھے کی مانند تھے جس کے پاؤں جس کسی کی گردن میں حمائل ہو جاتے تھے اس کی جان لے چھوڑتے تھے۔

وکلاء کے کمرے سے علیٰحدہ محرروں اور عرائض نویسوں کی نشست گاہ سے متصل ایک صاحب قابلِ توجہ ہیں جو منصفی کے وکیل ہیں۔ سر پر پٹھے جو بیچ سے علیٰحدہ کر دیے گئے تھے، بال خضاب سے سیاہ، چہرے پر جھریاں آنکھوں میں سرمے کی تحریر ململ کی بندار اچکن زیبِ تن، عمامہ بر فرق جیسے ابھی کہیں سکے عقد پڑھا کر چھوہارے لیے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ بڑی مہری کا پائجامہ جس میں چار انگل چوڑی لگی ہوئی حاشیہ کے اندر سرخ ڈورے دے دیے گئے تھے۔ اردو کی قانونی کتابوں کا بستہ سامنے تھا جس میں عرضی دعوے وغیرہ لکھنے کے مجرب نسخے تہہ کیے ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے ان کے شاگرد ہمارے وہ وکیل صاحب بھی رہ چکے تھے جن کا ذکر ابتداء میں آیا ہے۔ ایک شاگرد مسودہ لے کر اصلاح کے لیے حاضر ہوئے انہوں نے دبیز شیشوں کی عینک ناک کے کنارے پر رکھ کر میلے کچیلے ڈورے سر کے پیچھے کھسکا کر باندھ دیے۔ کاغذ کو ہاتھ میں لے کر انتہائی فاصلے سے پڑھنا شروع کیا۔ پہلے ہی لفظ پر رکے، مسودہ زمین پر پٹک دیا، عینک لکڑی کے ایک خول میں جس کا ڈھکنا اسی وقت سے غائب تھا جب سے وکیل صاحب نے اس وادی میں قدم رکھا تھا، بند کر دی گئی۔ غریب شاگرد گھبرایا کچھ دیر تک وکیل صاحب پیچ و تاب کھاتے رہے، آخر کار شاگرد نے ڈرتے ڈرتے عتاب کی وجہ دریافت کی تو فرمایا ''میاں تمھیں عرضی دعویٰ لکھنا کیا آئے گا خاک مدتوں سے ساتھ ہو، اتنا مغز مارتا

ہوں لیکن تمھارے دماغ میں کوئی بات نہیں گھستی، بس اب ہو چکا بدنامی مول لینا نہیں چاہتا''۔

شاگرد: آخر کیا غلطی ہوئی میں نے حتی الوسع نہایت کوشش سے مسودہ تیار کیا ہے۔''

وکیل صاحب: ''اچھا تو ایک موقع اور دیتا ہوں، غور سے پڑھ جاؤ سامنے ہی غلطی ہے ہاں۔ شاباش!'' شاگرد ایک ایک لفظ غور سے پڑھ گیا، مسودے کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا لیکن کوئی غلطی نہ پا کر کاغذ واپس کر دیا۔ اور عرض کیا ''وکیل صاحب مجھے تو اب بھی کوئی غلطی نظر نہ آئی''۔

وکیل صاحب برافروختہ ہو کر بولے ''کیوں خلاصہ فریاد ہے، لکھا ہے بسم اللہ ہی غلط''۔ شاگرد خاموش ہو گیا اور مایوس و ملول گھر واپس آیا۔ ایک بیوی اور دو بچے موجود تھے۔ بچے دوڑ کر لپٹ گئے جیوبوں میں ہاتھ ڈال دیے ''ابا میرے لیے کیا لائے ہیں؟ میں تو آج ناشپاتی ضرور لوں گی، اماں پیسے نہیں دیتی، کہتی ہیں ابا کچہری سے ناشپاتی لائیں گے'' چھوٹی لڑکی ماں کے پاس سے دوڑ کر بدقسمت باپ کے گھٹنوں میں لپٹ گئی۔ ابا کچہری نہ جایا کرو تم نہیں تھے، فاطمہ کی ماں (ہمسائی) آن کر اماں سے روپے مانگتی تھی اور جب اماں نے کہا کہ تم کچہری سے آن کر دے دو گے تو وہ بہت بگڑی اور شور مچانے لگی۔ اماں اب تک رو رہی تھیں، کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔ کچہری سے آتے ہو تو بیمار معلوم ہوتے ہو۔ میرے ساتھ دن بھر رہا کرو ہم تم ساتھ جھولا جھولیں گے۔ کیوں اماں اب بابا بھی ساتھ رہیں گے تو گھر میں آ کر کوئی شور نہیں مچائے گا''۔

بیوی جوان کے لیے چشمِ براہ تھی نا ہموار قدموں کی چاپ سن کر سمجھ گئی کہ آج بھی حالات میں کوئی امید افزا تبدیلی نہیں ہوئی تھی، لیکن متبسم ہو کر خیر مقدم کیا۔ بیوی کے اس اندازِ پذیرائی سے شوہر کے جذبات متلاطم ہو گئے اس نے بچوں کو گود میں لیا اور پرنم آنکھوں سے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "خدا کا شکر ہے میری قسمت قابلِ رشک نہیں''۔

10.3 ''وکیل صاحب'' کا تجزیاتی مطالعہ

اردو مزاح نگاری میں رشید احمد صدیقی ایک اہم نام ہے۔ انہوں نے مزاح کے وقار و معیار کو بلند کیا اور ان کی خدمات کے پیش نظر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ مزاح نگاری کے موجد اور خاتم دونوں ہیں۔ رشید احمد صدیقی کے متعدد انشائیے ہیں جو ان کی انشا پردازی کے بین ثبوت ہیں۔ ان کی تصانیف میں مضامین رشید، گنج ہائے گراں مایہ، ہم نفسان رفتہ، آشفتہ بیانی میری، شیخ نیازی اور ذاکر صاحب کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ رشید احمد صدیقی اردو انشائیہ نگاری میں غیر معمولی شہرت حاصل کی ہے۔ ان کے انشائیوں کا ایک مجموعہ ''مضامین رشید'' کے نام سے شائع ہوا جس میں تقریباً 20 انشائیے شامل ہیں۔ ہر انشائیہ موضوع و مواد کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ مضامین رشید میں شامل انشائیے سرگزشت

،عہدگل، حاجی صاحب، مولانا سہیل، دھوبی، وکیل صاحب، اپنی یاد میں، چارپائی، پاسبان، ارہر کا کھیت، گواہ، شیطان کی آنت، ماتابدل، کارواں پیداست، گھاگ، آمد میں آورد، مغالطہ، مرشد، مثلث، کچھ کا کچھ، سلام ہونجد پر۔ یہ انشائیے اردو ادب کے بیش قیمتی سرمائے ہیں۔ ان انشائیوں کی فہرست میں ایک انشائیہ ''وکیل صاحب'' ہے۔ وکیل صاحب انشائیہ میں وکیلوں کی زندگی اور ان کی زندگی میں آنے والے مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس انشائیہ میں وکیل کی زندگی کی زبوں حالی اور اس کی خستہ حالی، جہاں ایک وکیل کو بیٹھنے کے لیے معقول کرسی اور میز کا انتظام نہ ہو۔ کچہری کے باہر جہاں وکلا اپنے موکل کا انتظار اس دکاندار کی طرح کرتے ہیں جس کا سامان فروخت نہ ہوا ہو۔ رشید احمد صدیقی نے انشائیہ کے آغاز میں اس امر کا اشارہ واضح انداز میں کیا ہے اور رشید احمد صدیقی کے بیان کے مطابق والدین ہی بچوں کو قانون کی پڑھائی پر زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں اور ان کو وکیل بنا کر اپنے فرض منصبی سے چھٹکارا حاصل کرتے ہیں اور وکالت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا ہے۔ اس انشائیہ میں رشید احمد صدیقی نے والدین کو ہی اس کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''والدین جو بی۔ اے پاس ہو جانے کے بعد قانون پڑھانا اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں جتنا حکما منضج کے بعد مسہل دینا اور لیڈرانِ قوم اسپیچ کے بعد چندہ لینا۔ ان کو قانون کا امتحان پاس کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک مدت کی سرگرانی کے بعد ''نے محقق بود نہ دانش مند'' ہو کر واپس آئے۔ اب جو دیکھیے تو ایک ٹوٹے ہوئے سائبان میں ایک خانہ ساز کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ سامنے ان کے خیالات کی طرح ڈانواں ڈول ایک میز ہے جس کا ایک پاؤں کسی حادثے کی نذر ہو گیا تھا، اس کے نیچے تین اینٹیں تلے اوپر رکھی ہوئی ہیں۔ اوپر تین چار کتابیں ہیں جن کو دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتے تھے۔''

انشائیہ وکیل صاحب میں رشید احمد صدیقی نے ایک وکیل کی کہانی کو انشائیے کے پیرائے میں ڈھالنے کی ناکام سعی کی ہے۔ اس میں انشائیے کی بوکم کہانی پن کچھ زیادہ ہی پایا جاتا ہے اور مصنف کا مطمح نظر آغاز انشائیہ سے واضح ہو جاتا ہے۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک اصلاحی مضمون ہے جس میں انشائیہ کے روپ میں پیش کیا گیا ہے لیکن اس انشائیہ کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے ہندوستان کے اکثر وکلا کا یہ ہی حال ہوتا ہے اور وکیل کی پریشانیوں کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ جس امید سے گھر سے باہر نکلتے ہیں آج ان کی کمائی ہوگی اس میں وہ اکثر ناکام نظر آتے۔ اس انشائیہ کی خوبی یہ ہے کہ رشید احمد صدیقی اس موضوع کے ساتھ کسی حد تک انصاف کیا ہے۔ انہوں نے سماج کے دونوں رخ بلکہ تینوں رخ کو پیش کیا ہے۔ ایک وکیل، دوسرا موکل، تیسرا وہ وکیل جو سب سے زیادہ پیسہ کماتا ہے جس کے آگے پیچھے متعدد وکیل رہتے ہیں اور کچہری کا

اردلی ان کے استقبال میں سلام کرتے ہوئے جھک جاتا ہے۔

رشید احمد صدیقی کے انشائیہ میں مزاح کا عنصر غالب ہے۔ وہ اپنے مزاحیہ اور طنزیہ اسلوب کے ذریعہ وکیل صاحب کی حالت زار کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

''انہوں نے مایوسی سے کتاب کو میز پر پٹک دیا۔ میز پہلے ہی سے ڈگمگا رہی تھی، ہل چل سے قلابازی کھا گئی قہرِ درویش برجانِ درویش۔ سر جھکائے ہوئے کانٹے درست کر رہے تھے کہ ایک دوسرا موکل نظر آیا معاً اپنی حالتِ زار کا اندازہ کیا اور سر اٹھا کر کرسی پر واپس آنا چاہتے تھے لیکن یہ بھول گئے کہ سر میز کے نیچے ہے۔ اٹھے تو سر میز سے ٹکرا گیا کسان قریب آیا، چوٹ کی وجہ سے ایک ہاتھ مقامِ ماؤف پر، آنکھیں ڈبڈبائی ہوئیں، کچھ خفت، کچھ غصہ لیکن یہ سب حالتیں اس امید پر قابل برداشت تھیں جو نو وارد کی ذات سے وابستہ تھی۔ آنکھوں کے اشارے سے مطلب دریافت کیا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے کہ اس نگاہ میں یاس و امید کے کیسے مدوجزر اٹھ رہے تھے کتنے ایسے ہیں جو اس بد نصیب کی ان مبارک اور خوش آئند امیدوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔''

''وکیل صاحب'' میں رشید احمد صدیقی شگفتگی اور طنز کے ذریعہ معاشرتی شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ انشائیہ زندگی کے گوناگوں مسائل کا عکاس ہے اس میں ایک طرف کسان، غریب، دیہات کے رہنے والے لوگوں کی زندگی کے مسائل کی ترجمانی کی گئی اور غریب انسان کو کورٹ و کچہری میں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔ اگر دولت ہے تبھی آپ انصاف کا گوہار لگا سکتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے اس دکھتی رگ کو ایک دیہات کے موکل کے وساطت سے یوں بیان کرتے ہیں:

''.....حاضر ہے''، عدالت میں پکار ہوئی۔ چپراسی نے کرخت آواز میں مستغیثہ کو آواز دی۔ ایک غریب نوجوان شریف عورت میلے کچیلے لباس میں عدالت کے دروازے پر متوحش کھڑی تھی۔ اس بدنصیب سے چپراسی کو کوئی رقم وصول نہیں ہوئی تھی۔ بڑے سخت لہجے میں پوچھا تیرا وکیل کون ہے۔ غریب عدالت سے ناواقف طرح طرح کے لوگوں کا ہجوم، عدالت کا ایوان، ہر طرف دوڑ، دھوپ اور ڈانٹ ڈپٹ، یہ غریب ایک دور افتادہ گاؤں کی رہنے والی جس نے سادہ دل کسان اور مویشیوں کے علاوہ کچھ اور نہیں دیکھا تھا۔ اس ہنگامے سے اور زیادہ مبہوت ہو گئی۔ چپراسی نے جواب نہ پا کر دھتکار دیا۔''

اس انشائیہ میں بڑے وکیلوں کی زندگی اوران کی ناجائز کمائی کوطنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ان وکیلوں کی وضعداری اوران کے رکھ رکھاؤ کو مصنف نے بہت ہی چابکدستی سے بیان کیا۔رشید احمد صدیقی نے کلکتہ کے بنگالی کی طرز زندگی اوران کی عوام میں جومقبولیت ہےاوران کے پاس بڑی دولت ہےاوران کی موکلوں کی تعداد بھی بے شمار ہےاور کچہری میں ان کا رعب ودبدبہ بھی بہت زیادہ ہےاس لیےان کی طرز زندگی دیگر وکلا سے قدر مختلف ہے۔انہوں نے بنگالی وکیل کے حوالے سےلکھا ہے کہ:

''سامنےایک بوڑھے بنگالی وکیل کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ایک میلا بھدے قسم کا کورٹ اسی کپڑے کا پائجامہ، پاؤ میں کریب سول پر لگی ہوئی تھی۔ چاروں طرف موکل جھکے ہوئے تھے۔کچھ نوجوان وکیل اردگرد بیٹھے ہوئے تھے جن کو وہ کبھی کبھی بنگلہ زبان میں کچھ نہ کچھ سمجھاتے جاتے تھے۔تھوڑی دیر میں ایک شخص ہانپتا کانپتا کمرے میں آیا اور کہنے لگا،حضور پکار ہورہی ہے۔ بوڑھا بنگالی اجلاس پر پہنچا۔ چپراسی نے جھک کر سلام کیا اوراس نے پہنچ کر دو ہی ایک جملے کہے،مقدمے کی سماعت ملتوی کردی گئی۔''

انشائیہ''وکیل صاحب'' رشید احمد صدیقی کے فکروفن کا اعلیٰ نمونہ ہے۔اس میں ہماری معاشرتی زندگی کے متعدد مسائل پنہاں ہیں۔ان مسائل کو رشید احمد صدیقی جیسا باشعور تخلیق کار ہی اجاگر کرسکتا ہے۔رشید احمد صدیقی نے انشائیہ''وکیل صاحب'' میں وکیل کی زندگی کے مختلف زاویوں کواپنے شگفتہ لہجے میں بیان کیا ہے۔اس انشائیہ میں میانہ روی بھی ہےاورسماج،معاشرےاور ماحول کی عکاسی بھی ہے۔وکیل کی زندگی کے تمام واقعات صداقت اورحقیقت پرمبنی ہیں۔انہوں نے وکیل کی زندگی کی مکمل تصویر قاری کے سامنے پیش کردی ہے۔اس انشائیہ کا اختتامیہ بہت ہی کرب ناک ہےاورانشائیہ کا اختتام ایسے موڑ پر کیا گیا ہے جس سے قاری کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اوراس طرح کا اختتام اکثر ہمیں فکشن بالخصوص افسانہ میں ملتا ہے۔رشید احمد صدیقی نے انشائیہ میں ایک غریب وکیل کی زندگی کا نچوڑ آخری کے ایک پیراگراف میں بیان کردی ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''بچے دوڑ کر لپٹ گئے جیبوں میں ہاتھ ڈال دیے''ابا میرے لیے کیا لائے ہیں؟ میں تو آج ناشپاتی ضرورلوں گی،اماں پیسےنہیں دیتی،کہتی ہیں ابا کچہری سے ناشپاتی لائیں گے''چھوٹی لڑکی ماں کے پاس سے دوڑ کر بدقسمت باپ کے گھٹنوں میں لپٹ گئی۔ابا کچہری نہ جایا کروتم نہیں تھے،فاطمہ کی ماں (ہمسائی) آن کراماں سے روپے مانگتی تھی اور جب اماں نے کہا کہ تم کچہری سے آن کردے دوگےتو وہ بہت بگڑی اورشور مچانے لگی۔اماں اب تک رو

رہی تھیں، کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔ کچہری سے آتے ہوتو بیمار معلوم ہوتے ہو۔ میرے ساتھ دن بھر رہا کرو ہم تم ساتھ جھولا جھولیں گے۔ کیوں اما اب بابا بھی ساتھ رہیں گے تو گھر میں آ کر کوئی شور نہیں مچائے گا۔

بیوی جوان کے لیے چشمِ براہ تھی ناہموار قدموں کی چاپ سن کر سمجھ گئی کہ آج بھی حالات میں کوئی امید افزا تبدیلی نہیں ہوئی تھی، لیکن متبسم ہو کر خیر مقدم کیا۔ بیوی کے اس اندازِ پذیرائی سے شوہر کے جذبات متلاطم ہو گئے اس نے بچوں کو گود میں لیا اور پرنم آنکھوں سے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ''خدا کا شکر ہے میری قسمت قابلِ رشک نہیں۔''

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں یہ انشائیہ فکر وفن کے اعتبار سے رشید احمد صدیقی کے اہم انشائیوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس انشائیہ میں رشید احمد صدیقی طنز ومزاح کے ذریعہ ایک وکیل کی زندگی کے مسائل کو قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ زبان وبیان اور اسلوب کے اعتبار سے یہ ایک اہم انشائیہ ہے۔

10.3.1 سرگرمی - آؤ اپنی معلومات جانچیں

عزیز طلبا وطالبات آیئے ایک لمحے کے لیے رکیں اب جبکہ آپ نے رشید احمد صدیقی کا انشائیہ ''وکیل صاحب'' کا مطالعہ کر لیا، اور اس کا خلاصہ اور تجزیہ بھی پڑھ لیا تو نیچے دی گئی مشق کو حل کرنے کی کوشش کیجئے اور صحیح یا غلط پر نشان لگایئے۔

1۔ ''وکیل صاحب'' میں رشید احمد صدیقی نے ایک بنگالی وکیل کا تذکرہ کیا ہے۔ ( )

2۔ ''وکیل صاحب'' انشائیہ میں کسی دیہاتی موکل کا تذکرہ نہیں ہے۔ ( )

3۔ انشائیہ ''وکیل صاحب'' میں وکیل کے بچوں کی خواہشات اور ناسپاتی کا تذکرہ نہیں ہے۔ ( )

4۔ ''وکیل صاحب'' مضامین رشید میں شامل نہیں ہے۔ ( )

5۔ مضامین رشید میں ارہر کا کھیت شامل ہے۔ ( )

10.4 عمومی جائزہ

رشید احمد صدیقی نے اردو انشائیہ نگاری میں اپنی الگ اور منفرد شناخت قائم کی۔ مضامین رشید میں جتنے انشائیے ہیں اس کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ رشید احمد صدیقی علی گڑھ میں پوری دنیا کے حالات سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کا حق ادا کر دیا۔ ان کا انشائیہ ''وکیل صاحب'' بظاہر ایک وکیل کی زندگی کا عکاس ہے۔ وکیل کے تعلق سے ہمارے سماج کی جو سوچ ہے وہ یہ کی ہر وکیل بے ایمان ہوتا ہے۔ وہ لوٹ کھسوٹ کرتا ہے لیکن رشید احمد صدیقی نے یہ انشائیہ لکھ کر یہ واضح کر دیا کہ ہر وکیل ایک طرح کی سوچ نہیں رکھتے ہیں اور انہوں نے اس انشائیہ میں وکیلوں کے ساتھ غریب کی زندگی کے رشتہ دوانیوں کو اجاگر کیا ہے اور اس کے مطالعہ سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ بچوں کی تربیت میں والدین کی بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اگر بچوں کو تعلیم کے تعلق سے والدین سنجیدہ نہیں ہیں تو آگے چل کر وہی بچے جب بڑے ہوتے ہیں اور والدین کی تھوپی ہوئی ڈگری حاصل کرتے ہیں تو ان کو سماج میں وہ وقار و مرتبہ نہیں ملتا ہے جس کے وہ حقدار ہیں اور قانون کی پڑھائی ہر انسان کے لیے نہیں ہے۔ بہر حال یہ انشائیہ بہت دلچسپ اور قابل تحسین ہے۔

10.5 فرہنگ

متعدد	:	زیادہ، گنے ہوئے چند
دانش مند	:	عقلمند
منضبح	:	جلاب سے پہلے پلائی جانے والی دوا
رشک	:	کسی اچھی صفت اور ترقی دیکھ کر اس کے حاصل کرنے کی تمنا
کلفت	:	تکلیف، مصیبت اور بے چینی
دہقانی	:	دیہاتی
شکستہ	:	ٹوٹا ہوا
دریافت	:	تحقیق، تفتیش، جانچ
کچہری	:	اجلاس، عدالت

دیوانی	:	جائداد کے مقدمہ کی فیصلہ کرنے والی عدالت
پوٹلی	:	چھوٹی گٹھری
موکل	:	وکیل کرنے والا، جس نے وکیل کیا ہو
وکیل	:	وکالت کرنے والا
دبیز	:	موٹا گاڑھا
مسودہ	:	وہ تحریر جو سرسری لکھی جائے اور جس کے صاف کرنے کی ضرورت پڑے
پذیرائی	:	قبولیت، منظوری، مہمان کا استقبال
چشم براہ	:	منتظر
مسلوں	:	مقدمے کے کاغذات
خندہ	:	ہنستا ہوا، خوش
فوجداری	:	لڑائی، جھگڑا، مار پیٹ

10.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ رشید احمد صدیقی کی انشائیہ نگاری کا تفصیلی جائزہ لیجئے۔

2۔ انشائیہ ''وکیل صاحب'' کے فکر وفن سے بحث کیجئے۔

3۔ انشائیہ ''وکیل صاحب'' کی کردار نگاری کا جائزہ لیجئے۔

4۔ انشائیہ ''وکیل صاحب'' کے اسلوب سے بحث کیجئے۔

مختصر سوالات

1۔ رشید احمد صدیقی کا مختصر تعارف پیش کیجئے۔

2۔ انشائیہ ''وکیل صاحب'' کا خلاصہ لکھئے۔

3۔ انشائیہ ''وکیل صاحب'' میں ہندوستان کی کچہری کی صورتحال سے بحث کیجئے۔

4۔ انشائیہ ''وکیل صاحب'' میں ایک غریب وکیل کی گھریلو زندگی پر روشنی ڈالئے۔

10.6 مشقی سوالات

1۔ انشائیہ ''وکیل صاحب'' رشید احمد صدیقی کے کس مجموعے میں شامل ہے، اس مجموعے میں شامل پانچ انشائیوں کے نام لکھئے۔

2۔ انشائیہ ''وکیل صاحب'' میں وکیل کی زندگی کے کن اہم واقعات کو موضوع بنایا ہے۔

3۔ انشائیہ ''وکیل صاحب'' کا اختتام کس اقتباس پر ہوتا ہے اسے قلمبند کیجئے۔

4۔ رشید احمد صدیقی نے ہندوستان کی کچہری کے حالات کو کس طرح بیان کیا ہے۔ اظہار خیال کیجئے؟

10.7 مشقی سوالات وجوابات

جوابات

1۔ انشائیہ ''وکیل صاحب'' رشید احمد صدیقی کے مجموعہ ''مضامین رشید'' میں شامل ہے۔ اس مجموعے میں شامل پانچ انشائیوں کے نام یہ ہیں: ارہر کا کھیت، پاسبان، حاجی صاحب، مولانا سہیل اور اپنی یاد میں۔

2۔ انشائیہ ''وکیل صاحب'' میں مصنف نے وکیل کی سماجی زندگی اور کچہری کی خستہ صورت حال اور ان وکلا کی جن کی وکالت نہیں چلتی ان کی گھریلو زندگی کی پریشانیوں کو مصنف نے بحسن وخوبی اس انشائیے میں بیان کیا ہے۔ اس انشائیے میں مصنف نے موکل اور وکیل اور وہ وکیل جن کی وکالت خوب چلتی ہو ان کی ناجائز کمائی کی طرف بھی مصنف نے اشارہ کیا ہے۔

3۔ ''بیوی جوان کے لیے چشمِ براہ تھی ناہموار قدموں کی چاپ سن کر سمجھ گئی کہ آج بھی حالات میں کوئی امید افزا تبدیلی نہیں ہوئی تھی، لیکن متبسم ہو کر خیر مقدم کیا۔ بیوی کے اس اندازِ پذیرائی سے شوہر کے جذبات متلاطم ہو گئے اس نے بچوں کو گود میں لیا اور پرنم آنکھوں سے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا" خدا کا شکر ہے میری قسمت قابلِ رشک نہیں''۔

4۔ رشید احمد صدیقی نے اس انشائیے کے آغاز ہی سے قاری کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔ انہوں نے کچہری کے احاطے میں بیٹھنے والے وکلا کی کرسی اور میز کی خستہ حالی کو طنز کا نشانہ بنایا ہے اور موکل کے انتظار کے تعلق سے وکیل کی نفسیات کو اجاگر کیا ہے۔ ہندوستان کی کچہریوں

میں عام طور پر جہاں وکلا اپنے موکل سے گفتگو کرتے ہیں وہاں کا انتظام وانصرام میں بہتر نہیں ہوتا۔اس انشائیے میں مصنف نے اس امر کی طرف مزاحیہ اسلوب میں اشارہ کیا ہے۔

10.9 امدادی کُتب Books Prescribe

۱۔ انتخاب اُردو نثر) ۱۸۵۷ء ۱۹۲۰ء ایجوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ۔

۲۔ انتخاب اُردو نثر ۱۹۲۰ء کے بعد ای جوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ

Books Recommended.

۱۔ مختصر تاریخ ادب اُردو۔ڈاکٹر سید اعجاز حسین ترجمہ واضافے	ڈاکٹر سید محمد عقیل
۲۔ اُردو ادب میں طنز ومزاح۔	ڈاکٹر وزیر آغا
۳۔ اُردو ادب میں طنز ومزاح۔	غلام احمد فرقت کاکوروی
۴۔ رشید احمد صدیقی۔شخصیت اور فن۔	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
۵۔ اُردو انشائیہ۔	وزیر آغا
۶۔ انشائیہ کے فنی سروکار۔	ڈاکٹر احمد امتیاز
۷۔ انشائیہ کی بنیاد۔	ڈاکٹر سلیم اختر
۸۔ فنِ انشائیہ اور انشائیے۔	ڈاکٹر فرحت شمیم
۹۔ انشائیہ کے خدوخال	وزیر آغا
۱۰۔ انشائیہ کی بنیاد	ڈاکٹر سلیم اختر
۱۱۔ انشائیہ اردو ادب میں	ڈاکٹر انور سدید
۱۲۔ انشائیہ	ڈاکٹر آدم شیخ
۱۳۔ ڈپٹی نذیر احمد احوال وآثار	محمد اکرام چغتائی

۱۴۔	مولوی نذیر احمد احوال و آثار	ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی
۱۵۔	لکچروں کا مجموعہ (مرتبہ)	محمد نذیر حسین
۱۶۔	نذیر احمد	نور الحسن نقوی
۱۷۔	فکر و نظر (ڈپٹی نذیر احمد نمبر) علی گڑھ	
۱۸۔	خواجہ حسن نظامی: شخصیت اور ادبی خدمات	نثار احمد فاروقی
۱۹۔	خواجہ حسن نظامی کی نثر	ڈاکٹر مولا بخش
۲۰۔	خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری	سید محمد نیر رضوی
۲۱۔	خواجہ حسن نظامی کتاب نما	خصوصی شمارہ

سبق۔نمبر 11۔تدریس متن ''میں ایک میاں ہوں'' پطرس بخاری

ساخت

11.0 اغراض ومقاصد

11.1 تعارف

11.2 پطرس بخاری کی مختصر حالات زندگی

11.2.1 انشائیہ ''میں ایک میاں ہوں'' کا متن

11.3 ''میں ایک میاں ہوں'' کا تجزیاتی مطالعہ

11.3.1 سرگرمی ۔آؤ اپنی معلومات جانچیں

11.4 عمومی جائزہ

11.5 فرہنگ

11.7 نمونہ برائے امتحانی سوالات

11.6 مشقی سوالات

11.8 مشقی سوالات کے جوابات۔جوابات سرگرمی

11.9 امدادی کتب

11.0 اغراض ومقاصد

عزیز متعلم اس سبق کے مطالعے کے بعد اس قابل ہو جائیں گے کہ

پطرس بخاری کی حیات وادبی خدمات سے واقف ہوسکیں گے۔

پطرس بخاری کے انشائیہ نگاری سے واقف ہوسکیں گے۔

پطرس بخاری کے انشائیہ ''میں ایک میاں ہوں'' کی تفہیم وتجزیہ کرسکیں گے۔

پطرس بخاری کی مزاح نگاری کی خصوصیات سے واقف ہوسکیں گے۔

اردو انشائیہ نگاری میں پطرس بخاری کا مقام متعین کرسکیں گے۔

11.1 تعارف

اردو کے مزاح نگاروں میں پطرس بخاری کا ایک اہم نام ہے۔ پطرس نے ہمارے خیال میں سب سے کم مضامین لکھکر بہت زیادہ شہرت حاصل کی۔ اردو میں مزاح نگاری کے میدان میں اتنا کم لکھنے کے بعد کسی اور تخلیق کار کو اس طرح کی شہرت نصیب نہ ہوئی۔ پطرس بخاری کے مضامین انشا پردازی کا بین ثبوت ہیں اور طنز ومزاح نگاری میں ان کا اپنا منفرد اسلوب ہے۔ پطرس بخاری نے صرف ایک کتاب ''مضامین پطرس'' تخلیق کر کے ادبی دنیا میں اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے اور طنز ومزاح کے میدان میں پطرس نے غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔ پطرس کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور ان کے انشائیوں کے مطالعے سے انکشاف ہوتا ہے کہ انہوں نے بیشتر مضامین استفہامیہ پیرائے میں لکھا ہے۔ اردو ادب میں پطرس بخاری کی جو الگ پہچان ان کے مضامین سے ہوئی جو کتابی شکل میں ''پطرس کے مضامین'' کے نام سے شائع ہوئی۔ پطرس کا یہ ہی تخلیقی کارنامہ ان کو ادبی دنیا میں زندہ وجاوید رکھا ہے اور پطرس کے مضامین میں صرف گیارہ مضامین شامل ہیں جو اردو ادب میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے مضامین کی تعداد اگر چہ مختصر ہے لیکن ان کی وقعت واہمیت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

11.2 پطرس بخاری کی مختصر حالات زندگی

پطرس بخاری کی ولادت یکم اکتوبر 1898 میں پشاور میں ہوئی۔ آپ کا مکمل نام پیر سید احمد شاہ بخاری تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پطرس لفظ ''پیر'' کو اپنے نام کے ساتھ منسلک نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن جب وہ گورنمنٹ ہائی اسکول پشاور میں وہ ''پیر'' کے نام سے متعارف ہوئے اور ان

کے ہیڈ ماسٹر بھی ان کو ''پیر'' کے نام سے بلاتے تھے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پطرس کا خاندانی نام ''بخاری'' کیسے ہوا۔اس کی وجہ یہ تھی پطرس کے والد صاحب کا اسم گرامی سید اسد اللہ شاہ بخاری تھا اس مناسبت سے ان کا نام بخاری پڑ گیا اور پطرس کے دادا کشمیر سے ہجرت کر کے پشاور گئے تھے اور پطرس کے تین بھائی تھے جن کا نام سید غالب بخاری، سید محمد شاہ رفعت بخاری اور سید ذوالفقار شاہ بخاری تھا لیکن ان کے گھر یہ المیہ سامنے آیا کہ ان کی والدہ کا انتقال ان کے کم سنی میں ہو گیا تھا لیکن ان کے والد نے اکیلے اپنے طور پر بچوں کی تعلیم و تربیت دینے کی سعی کی۔پطرس بخاری اپنے بھائیوں میں زیادہ ذہین، روشن دماغ اور منکسر المزاج تھے۔ان کی ادب سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔1912 میں میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا اور گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔اے میں داخلہ لیا۔یہاں بھی اور اپنے کالج کے ساتھیوں میں سب سے آگے تھے۔پطرس کو انگریزی اور اردو زبان سے تو شغف تھا ہی اور ان دونوں زبانوں میں ید طولیٰ رکھتے تھے علاوہ بریں فارسی، پشتو اور فرانسیسی سے بھی دلچسپی تھی۔

11.2.1 انشائیہ ''میں ایک میاں ہوں'' کا متن

میں ایک میاں ہوں۔مطیع و فرمانبردار۔اپنی بیوی روشن آرا کو اپنی زندگی کی ہر ایک بات سے آگاہ کرنا اصول زندگی سمجھتا ہوں اور ہمیشہ اس پر کاربند رہا ہوں۔خدا میرا انجام بخیر کرے۔چنانچہ میری اہلیہ میرے دوستوں کی تمام عادات و خصائل سے واقف ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے دوست جتنے مجھ کو عزیز ہیں اتنے ہی روشن آرا کو برے لگتے ہیں۔میرے احباب کی جن اداؤں نے مجھے مسحور کر رکھا ہے، انہیں میری اہلیہ ایک شریف انسان کے لیے باعث ذلت سمجھتی ہے۔آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ خدانخواستہ وہ کوئی ایسے آدمی ہیں، جن کا ذکر کسی معزز مجمع میں نہ کیا جا سکے۔کچھ اپنے ہنر کے طفیل اور کچھ خاکسار کی صحبت کی بدولت سب کے سب ہی سفید پوش ہیں لیکن اس بات کو کیا کروں کہ ان کی دوستی میرے گھر کے امن میں اس قدر خلل انداز ہوتی ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔

مثلاً مرزا صاحب ہی کو لیجیے۔اچھے خاصے بھلے آدمی ہیں۔گو محکمہ جنگلات میں ایک معقول عہدے پر ممتاز ہیں لیکن شکل و صورت ایسی پاکیزہ پائی ہے کہ امام مسجد معلوم ہوتے ہیں۔جوا نہیں کھیلتے، گلی ڈنڈے کا ان کو شوق نہیں، جیب کترتے ہوئے کبھی وہ نہیں پکڑے گئے۔البتہ کبوتر پال رکھے ہیں، انھیں سے جی بہلاتے ہیں۔ہماری اہلیہ کی یہ کیفیت ہے کہ محلے کا کوئی بدمعاش جوئے میں قید ہو جائے تو اس کی ماں کے پاس ماتم پرسی تک کو چلی جاتی ہیں۔گلی ڈنڈے میں کسی کی آنکھ پھوٹ جائے تو مرہم پٹی کرتی رہتی ہیں۔کوئی جیب کترا پکڑا جائے تو گھنٹوں آنسو بہاتی رہتی ہیں لیکن وہ بزرگ جن کو دنیا بھر کی زبان مرزا صاحب مرزا صاحب کہتے تھکتی نہیں، ہمارے گھر میں ''موئے کبوتر باز'' کے نام سے یاد کیے جاتے

ہیں۔کبھی بھولے سے بھی میں آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کسی چیل، کوے، گدھ، شکرے کو دیکھنے لگ جاؤں تو روشن آرا کو فوراً خیال ہو جاتا ہے کہ بس اب یہ بھی کبوتر باز بننے لگا۔

اس کے بعد مرزا صاحب کی شان میں ایک قصیدہ شروع ہو جاتا ہے۔ بیچ میں میری جانب گریز۔ کبھی لمبی بحر میں، کبھی چھوٹی بحر میں۔ ایک دن جب یہ واقعہ پیش آیا تو میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس مرزا کمبخت کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دوں گا، آخر گھر سب سے مقدم ہے۔ میاں بیوی کے باہمی اخلاص کے مقابلے میں دوستوں کی خوشنودی کیا چیز ہے؟ چنانچہ ہم غصے میں بھرے ہوئے مرزا صاحب کے گھر گئے، دروازہ کھٹکھٹایا۔ کہنے لگے ''اندر آ جاؤ۔'' ہم نے کہا ''نہیں آتے، تم باہر آؤ۔'' خیر آخر اندر گیا۔ بدن پر تیل مل کر ایک کبوتر کی چونچ منہ میں لئے دھوپ میں بیٹھے تھے۔ کہنے لگے ''بیٹھ جاؤ۔'' ہم نے کہا ''بیٹھیں گے نہیں۔'' آخر بیٹھ گئے معلوم ہوتا ہے ہمارے تیور کچھ بگڑے ہوئے تھے۔ مرزا بولے ''کیوں بھئی؟ خیر باشد!'' میں نے کہا ''کچھ نہیں۔'' کہنے لگے ''اس وقت کیسے آنا ہوا؟'' اب میرے دل میں فقرے کھولنے شروع ہوئے۔ پہلے ارادہ کیا کہ ایک دم ہی سب کچھ کہہ ڈالو اور چل دو۔ پھر سوچا کہ مذاق سمجھے گا، اس لیے کسی ڈھنگ سے بات شروع کرو لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ پہلے کیا کہیں۔ آخر ہم نے کہا:

''مرزا! بھئی کبوتر بہت مہنگے ہوتے ہیں؟''

یہ سنتے ہی مرزا صاحب نے چین سے لے کر امریکہ تک کے تمام کبوتروں کو ایک ایک کر کے گنوانا شروع کیا۔ اس کے بعد دانے کی مہنگائی کے متعلق گل افشانی کرتے رہے اور پھر محض مہنگائی پر تقریر کرنے لگے۔ اس دن تو ہم یوں ہی چلے آئے لیکن ابھی کھٹ پٹ کا ارادہ دل میں باقی تھا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ شام کو گھر میں ہماری صلح ہو گئی۔ ہم نے کہا ''چلو اب مرزا کے ساتھ بگاڑنے سے کیا حاصل؟'' چنانچہ دوسرے دن مرزا سے بھی صلح صفائی ہو گئی۔ لیکن میری زندگی تلخ کرنے کے لیے ایک نہ ایک دوست ہمیشہ کارآمد ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے میری طبیعت میں قبولیت اور صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے کیونکہ ہماری اہلیہ کو ہم میں ہر وقت کسی نہ کسی دوست کی عادات کی جھلک نظر آتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ میری اپنی ذاتی شخصی سیرت بالکل ہی ناپید ہو چکی ہے۔

شادی سے پہلے ہم کبھی کبھی دس بجے اٹھا کرتے تھے ورنہ گیارہ بجے۔ اب کتنے بجے اٹھتے ہیں؟ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کے گھر ناشتہ زبردستی صبح کے سات بجے کرا دیا جاتا ہے اور اگر ہم کبھی بشری کمزوری کے تقاضے سے مرغوں کی طرح تڑکے اُٹھنے میں کوتاہی کریں تو فوراً ہی کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اس نکھٹو نسیم کی صحبت کا نتیجہ ہے۔ ایک دن صبح صبح ہم نہار رہے تھے۔ سردی کا موسم، ہاتھ پاؤں کانپ

رہے تھے۔صابن سر پر ملتے تھے تو ناک میں گھستا تھا کہ اتنے میں ہم نے خدا جانے کس پراسرار جذبے کے ماتحت غسل خانے میں الاپنا شروع کیا اور پھر گانے لگے کہ ''توری چھل بل ہے نیاری.....'' اس کو ہماری انتہائی بدمذاقی سمجھا گیا اور اس بدمذاقی کا اصل منبع ہمارے دوست پنڈت جی کو ٹھہرایا گیا۔لیکن حال ہی میں مجھ پر ایک ایسا سانحہ گزرا ہے کہ میں نے تمام دوستوں کو ترک کر دینے کی قسم کھالی ہے۔

تین چار دن کا ذکر ہے کہ صبح کے وقت روشن آرا نے مجھ سے میکے جانے کے لیے اجازت مانگی۔جب سے ہماری شادی ہوئی ہے روشن آرا صرف دو دفعہ میکے گئی ہے،اور پھر اس نے کچھ اس سادگی اور عجز سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکا۔کہنے لگی،''تو پھر میں ڈیڑھ بجے کی گاڑی میں چلی جاؤں؟''۔میں نے کہا''اور کیا؟'' وہ جھٹ تیاری میں مشغول ہوگئی اور میرے دماغ میں آزادی کے خیالات نے چکر لگانے شروع کیے۔یعنی اب بیشک دوست آئیں،بیشک اودھم مچائیں۔میں بے شک گاؤں،بے شک جب چاہوں اٹھوں۔بے شک تھیٹر جاؤں۔میں نے کہا،

''روشن آرا جلدی کرو۔نہیں تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔''

ساتھ اسٹیشن پر گیا۔جب گاڑی میں سوار کرا چکا تو کہنے لگی،''خط روز لکھتے رہیے''۔میں نے کہا''ہر روز۔اور تم بھی''۔

''کھانا وقت پہ کھالیا لیجیے اور ہاں دھلی ہوئی جرابیں اور رومال الماری کے نچلے خانے میں پڑے ہیں۔''

اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہوگئے اور ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھتے رہے۔اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔میرا دل بھی بیتاب ہونے لگا اور جب گاڑی روانہ ہوئی تو میں دیر تک مبہوت پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔آخر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا کتابوں کی دکان تک آیا اور رسالوں کے ورق پلٹ پلٹ کر تصویریں دیکھتا رہا۔ایک اخبار خریدا۔تہہ کر کے جیب میں ڈالا اور عادت کے مطابق گھر کا ارادہ کر لیا۔پھر خیال آیا کہ اب گھر جانا ضروری نہیں رہا۔اب جہاں چاہوں جاؤں،چاہوں تو گھنٹوں اسٹیشن پر ہی ٹہلتا رہوں۔دل چاہتا تھا قلابازیاں کھاؤں۔

کہتے ہیں جب افریقہ کے وحشیوں کو کسی تہذیب یافتہ ملک میں کچھ عرصہ کے لیے رکھا جاتا ہے تو گو وہ وہاں کی شان وشوکت سے بہت متاثر ہوتے ہیں لیکن جب واپس جنگلوں میں پہنچتے ہیں تو خوشی کے مارے چیخیں مارتے ہیں۔کچھ ایسی ہی کیفیت میرے دل کی بھی ہو رہی تھی۔بھاگتا ہوا اسٹیشن سے آزادانہ باہر نکلا۔آزادی کے لہجہ میں تانگے والے کو بلایا اور کود کر تانگے میں سوار ہو گیا۔سگریٹ سلگا لیا،ٹانگیں سیٹ پر پھیلا دیں اور کلب کو روانہ ہو گیا۔

رستے میں ایک بہت ضروری کام یاد آ گیا۔تانگہ موڑ کر گھر کی طرف پلٹا۔باہر ہی سے نوکر کو آواز دی۔

''امجد!''

''حضور!''

''دیکھو، حجام کو جا کے کہہ دو کہ کل گیارہ بجے آئے۔''

''بہت اچھا۔''

''گیارہ بجے۔سن لیا نا؟ کہیں روز کی طرح پھر چھے بجے وارد نہ ہو جائے۔''

''بہت اچھا حضور۔''

''اور اگر گیارہ بجے سے پہلے آئے تو دھکے دے کر باہر نکال دو۔''

یہاں سے کلب پہنچے۔آج تک کبھی دن کے دو بجے کلب نہ گیا تھا۔اندر داخل ہوا تو سنسان، آدمی کا نام ونشان تک نہیں۔سب کمرے دیکھ ڈالے۔بلیرڈ کا کمرہ خالی، شطرنج کا کمرہ خالی، تاش کا کمرہ خالی۔صرف کھانے کے کمرے میں ایک ملازم چھریاں تیز کر رہا تھا۔

اس سے پوچھا، ''کیوں بے آج کوئی نہیں آیا؟''

کہنے لگا، ''حضور آپ جانتے ہیں، اس وقت بھلا کون آتا ہے؟''

بہت مایوس ہوا۔باہر نکل کر سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ اور کچھ نہ سوجھا تو وہاں سے مرزا صاحب کے گھر پہنچا۔معلوم ہوا ابھی دفتر سے واپس نہیں آئے۔دفتر پہنچا۔دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔میں نے سب حال بیان کیا کہنے لگے، ''تم باہر کے کمرے میں ٹھہرو، تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔بس ابھی بھگتا کے تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔شام کا پروگرام کیا ہے؟''

میں نے کہا، ''تھیٹر۔''

کہنے لگے، ''بس بہت ٹھیک ہے، تم باہر بیٹھو۔میں ابھی آیا۔''

باہر کے کمرے میں ایک چھوٹی سی کرسی پڑی تھی۔اس پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا اور جیب سے اخبار نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔شروع سے آخر تک سب پڑھ ڈالا اور ابھی چار بجنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔پھر سے پڑھنا شروع کر دیا۔سب اشتہار پڑھ ڈالے اور پھر سب اشتہاروں کو دوبارہ پڑھ ڈالا۔

آخر کار اخبار پھینک کر بغیر کسی تکلف یا لحاظ کے جمائیاں لینے لگا۔جمائی پہ جمائی۔جمائی پہ جمائی، حتٰی کہ جبڑوں میں درد ہونے لگا۔اس کے بعد ٹانگیں ہلانا شروع کیا لیکن اس سے بھی تھک گیا۔پھر میز پر طبلے کی گتیں بجاتا رہا۔بہت تنگ آ گیا تو دروازہ کھول کر مرزا سے کہا ''ابے یار!

اب چلتا بھی ہے کہ مجھے انتظار ہی میں مار ڈالے گا۔ مردود کہیں کا، سارا دن میرا ضائع کر دیا۔''

وہاں سے اُٹھ کر مرزا کے گھر گئے۔ شام بڑے لطف میں کٹی۔ کھانا کلب میں کھایا اور وہاں سے دوستوں کو ساتھ لیے تھیٹر گئے۔ رات کے ڈھائی بجے گھر لوٹے۔ تکیے پر سر رکھا ہی تھا کہ نیند نے بے ہوش کر دیا۔ صبح آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ لہریں مار رہی تھی۔ گھڑی کو دیکھا تو پونے گیارہ بجے تھے۔ ہاتھ بڑھا کر میز پر سے ایک سگریٹ اٹھایا اور سلگا کر طشتری میں رکھ دیا اور پھر اونگھنے لگا۔

گیارہ بجے امجد کمرے میں داخل ہوا کہنے لگا، ''حضور! حجام آیا ہے۔''

ہم نے کہا، ''یہیں بلا لاؤ۔'' یہ عیش مدت کے بعد نصیب ہوا کہ بستر پر لیٹے لیٹے حجامت بنوالیں۔ اطمینان سے اٹھے اور نہا دھو کر باہر جانے کے لیے تیار ہوئے لیکن طبیعت میں وہ شگفتگی نہ تھی، جس کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ چلتے وقت الماری سے رومال نکالا تو خدا جانے کیا خیال آیا۔ وہیں کرسی پر بیٹھ گیا اور سودائیوں کی طرح اس رومال کو تکتا رہا۔ الماری کا ایک اور خانہ کھولا تو سرمئی رنگ کا ایک ریشمی دوپٹہ نظر آیا۔ باہر نکالا، ہلکی ہلکی عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ بہت دیر تک اس پر ہاتھ پھیرتا رہا دل بھر آیا، گھر سونا معلوم ہونے لگا۔ بہتیرا اپنے آپ کو سنبھالا لیکن آنسو ٹپک ہی پڑے۔ آنسوؤں کا گرنا تھا کہ بیتاب ہو گیا اور سچ مچ رونے لگا۔ سب جوڑے باری باری نکال کر دیکھے لیکن نہ معلوم کیا کیا یاد آیا کہ اور بھی بے قرار ہوتا گیا۔

آخر نہ رہا گیا، باہر نکلا اور سیدھا تار گھر پہنچا۔ وہاں سے تار دیا کہ، ''میں بہت اداس ہوں۔ تم فوراً آ جاؤ!''

تار دینے کے بعد دل کو کچھ اطمینان ہوا۔ یقین تھا کہ روشن آرا اب جس قدر جلد ہو سکے گا آ جائے گی۔ اس سے کچھ ڈھارس بندھ گئی اور دل پر سے جیسے ایک بوجھ ہٹ گیا۔ دوسرے دن دوپہر کو مرزا کے مکان پر تاش کا معرکہ گرم ہونا تھا۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مرزا کے والد سے کچھ لوگ ملنے آئے ہیں۔ اس لیے تجویز یہ ٹھہری کہ یہاں سے کسی اور جگہ سرک چلو۔ ہمارا مکان تو خالی تھا ہی۔ سب یار لوگ وہیں جمع ہوئے۔ امجد سے کہہ دیا گیا کہ حقے میں اگر ذرا بھی خلل واقع ہوا تو تمہاری خیر نہیں اور پان اس طرح سے متواتر پہنچتے رہیں کہ بس تانتا لگ جائے۔

اب اس کے بعد کے واقعات کو کچھ مرد ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ شروع شروع میں تو تاش باقاعدہ اور باضابطہ ہوتا رہا۔ جو کھیل بھی کھیلا گیا بہت معقول طریقے سے، قواعد وضوابط کے مطابق اور متانت وسنجیدگی کے ساتھ لیکن ایک دو گھنٹے کے بعد کچھ خوش طبعی شروع ہوئی۔ یار لوگوں نے ایک دوسرے کے پتے دیکھنے شروع کر دیئے۔ یہ حالت تھی کہ آنکھ بچی نہیں اور ایک آدھ کام کا پتہ اُڑا نہیں اور ساتھ ہی قہقہے پر قہقہے اُڑنے لگے۔ تین گھنٹے کے بعد یہ حالت تھی کہ کوئی گھٹنا ہلا ہلا کر گا رہا ہے، کوئی فرش پر بازو ٹیکے بجا رہا ہے۔ کوئی تھیٹر کا ایک آدھ مذاقیہ فقرہ لاکھوں دفعہ دہرا رہا ہے لیکن تاش برابر ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دھول دھپا شروع ہو گیا۔ ان خوش فعلیوں کے دوران میں ایک مسخرے نے ایک ایسا

کھیل تجویز کر دیا۔ جس کے آخر میں ایک آدمی بادشاہ بن جاتا ہے۔ دوسرا وزیر، تیسرا کوتوال اور جو سب سے ہار جائے وہ چور۔ سب نے کہا ''واہ !وا کیا بات کہی ہے۔'' ایک بولا ''پھر آج جو چور بنا اس کی شامت آجائے گی۔'' دوسرے نے کہا ''اور نہیں تو کیا۔ بھلا کوئی ایسا ویسا کھیل ہے۔ سلطنتوں کے معاملے ہیں، سلطنتوں کے۔''

کھیل شروع ہوا۔ بدقسمتی سے ہم چور بن گئے۔ طرح طرح کی سزائیں تجویز ہونے لگیں۔'' کوئی کہے،'' ننگے پاؤں بھاگتا ہوا جائے اور حلوائی کی دکان سے مٹھائی خرید کر لائے۔'' کوئی کہے ''نہیں حضور! سب کے پاؤں پڑے، اور ہر ایک سے دو دو چانٹے کھائے۔'' دوسرے نے کہا ''نہیں صاحب ایک پاؤں پر کھڑا ہو کر ہمارے سامنے ناچے۔'' آخر میں بادشاہ سلامت بولے،'' ہم حکم دیتے ہیں کہ چور کو کاغذ کی ایک لمبوتری نوک دار ٹوپی پہنائی جائے اور اس کے چہرے پر سیاہی مل دی جائے اور یہ اسی حالت میں جا کر اندر سے حقے کی چلم بھر کر لائے۔'' سب نے کہا ''کیا دماغ پایا ہے حضور نے! کیا سزا تجویز کی ہے! واہ واہ''

ہم بھی مزے میں آئے ہوئے تھے، ہم نے کہا ''تو ہوا کیا؟ آج ہم ہیں کل کسی اور کی باری آجائے گی۔'' نہایت خندہ پیشانی سے اپنے چہرے کو پیش کیا۔ ہنس ہنس کر وہ بیہودہ سی ٹوپی پہنی۔ ایک شان استغنا کے ساتھ چلم اٹھائی اور زنانے کا دروازہ کھول کر باورچی خانے کو چل دیے اور ہمارے پیچھے کمرہ قہقہوں سے گونج رہا تھا۔

صحن میں پہنچے ہی تھے کہ باہر کا دروازہ کھلا اور ایک برقعہ پوش خاتون اندر داخل ہوئی۔ منہ سے برقعہ الٹا تو روشن آرا۔

دم خشک ہو گیا۔ بدن پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ زبان بند ہو گئی۔ سامنے وہ روشن آرا جس کو میں نے تار دے کر بلایا تھا کہ،'' تم فوراً آجاؤ میں بہت اداس ہوں'' اور اپنی یہ حالت کہ منہ پر سیاہی ملی ہے، سر پر وہ لمبوتری سی کاغذ کی ٹوپی پہن رکھی ہے اور ہاتھ میں چلم اٹھائے کھڑے ہیں اور مردانے کمرے سے قہقہوں کا شور برابر آرہا ہے۔ روح منجمد ہو گئی اور تمام حواس نے جواب دے دیا۔ روشن آرا کچھ دیر تک چپکی کھڑی دیکھتی رہی اور پھر کہنے لگی.....بس میں کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی؟ اس کی آواز تو میرے کانوں تک جیسے بیہوشی کے عالم میں پہنچ رہی تھی۔

اب تک آپ اتنا تو جان گئے ہوں گے کہ میں بذات خود از حد شریف واقع ہوا ہوں۔ جہاں تک میں میں ہوں۔ مجھ سے بہتر میاں دنیا پیدا نہیں کر سکتی۔ میری سسرال میں سب کی یہی رائے ہے اور میرا اپنا ایمان بھی یہی ہے لیکن ان دوستوں نے مجھے رسوا کر دیا ہے۔ اس لیے میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اب یا گھر میں رہوں گا یا کام پر جایا کروں گا۔ نہ کسی سے ملوں گا اور نہ کسی کو اپنے گھر آنے دوں گا، سوائے ڈاکیے یا حجام کے اور ان سے بھی نہایت مختصر باتیں کروں گا۔

''خط ہے؟''

''جی ہاں۔''

''دے جاؤ۔ چلے جاؤ۔''

''ناخن تراش دو۔''

''بھاگ جاؤ۔''

بس اس سے زیادہ کلام نہ کروں گا۔ آپ دیکھئے تو سہی!

11.3 ''میں ایک میاں ہوں'' کا تجزیاتی مطالعہ

اردو کے اہم انشائیہ نگاروں میں ایک نام پطرس بخاری کا ہے۔ پطرس کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے صرف ایک مضامین کا مجموعہ ''مضامین پطرس'' لکھ کر اردو مزاح نگاری میں اپنی جگہ مسلم کر لی ہے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ ''مضامین پطرس'' کے نام سے شائع ہو کر داد و تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اس مجموعے کی اولین اشاعت 1930 میں ہوئی جس میں گیارہ مضامین شامل ہیں۔ اس کتاب کے تمام مضامین منفرد نوعیت کے ہیں اور تقریباً تمام مضامین میں مزاح کا پہلو ہی غالب ہے۔ انہوں نے کسی کو بھی طنز کا نشانہ نہیں بنایا ہے۔ پطرس خالص مزاح نگار ہونے کے ساتھ ایک اچھے فنکار بھی ہیں۔ ''مضامین پطرس'' میں گیارہ انشائیے ہیں۔ ان انشائیوں کے نام یہ ہیں ہاسٹل میں پڑھنا، سویرے جو کل آنکھ میری کھلی، کتے، اردو کی آخری کتاب، میں ایک میاں ہوں، مرید پور کا پیر، انجام بخیر، سنیما کا عشق، ببل اور میں، مرحوم کی یاد میں، لاہور کا جغرافیہ۔ یہ تمام انشائیے اردو مزاح نگاری میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں ایک انشائیہ ''میں ایک میاں ہوں'' منفرد نوعیت کا ہے۔ اس میں انشائیہ نگار نے اپنے دوستوں کے کارناموں کو اجاگر کیا ہے اور جن دوستوں کے لیے وہ سب کچھ قربان کر دیتا وہ دوست اسے ذلیل کرنے میں پیچھے نہیں رہتے۔ دوستوں کی رفاقت کو بیوی پر ترجیح دیتا ہے اور بیوی کو اس بات کا احساس کی ان کے دوست بالخصوص مرزا صاحب ان سے صرف اپنا کام نکالتے ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی قدر نہیں کرتے ہیں اور بیوی اپنے شوہر کا خیال بہت کرتی ہے۔ ان کے شوہر بھی ان کو مانتے ہیں۔ لیکن جب ایک بار بیوی میکے جاتی ہے تو میاں صاحب کو زندگی کی سب سے بڑی آزادی مل جاتی ہے اور ان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اب گھر میں ان کو کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے۔ اس واقعہ کا اظہار پطرس مزاحیہ اسلوب میں یوں کرتے ہیں:

''کہتے ہیں جب افریقہ کے وحشیوں کو کسی تہذیب یافتہ ملک میں کچھ عرصہ کے لیے رکھا جاتا ہے تو وہ وہاں کی شان وشوکت سے بہت متاثر ہوتے ہیں لیکن جب واپس جنگلوں میں پہنچتے ہیں تو خوشی کے مارے چیخیں مارتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میرے دل کی بھی ہو رہی تھی۔ بھاگتا ہوا اسٹیشن سے آزادانہ باہر نکلا۔ آزادی کے لہجہ میں تانگے والے کو بلایا اور کود کر تانگے میں سوار ہو گیا۔ سگریٹ سلگا لیا، ٹانگیں سیٹ پر پھیلا دیں اور کلب کو روانہ ہو گیا۔

رستے میں ایک بہت ضروری کام یاد آ گیا۔ تانگہ موڑ کر گھر کی طرف پلٹا۔ باہر ہی سے نوکر کو آواز دی۔

''امجد!''

''حضور!''

''دیکھو، حجام کو جا کے کہہ دو کہ کل گیارہ بجے آئے۔''

''بہت اچھا۔''

''گیارہ بجے۔ سن لیا نا؟ کہیں روز کی طرح پھر چھے بجے وارد نہ ہو جائے۔''

''بہت اچھا حضور۔''

''اور اگر گیارہ بجے سے پہلے آئے تو دھکے دے کر باہر نکال دو۔''

اس اقتباس سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ بیوی کے میکے جانے کے بعد میاں صاحب کو کتنی خوشی محسوس ہوتی ہے اور وہ مکمل آزادی کی زندگی گزارتا ہے۔ اب گیارہ بجے سو کر اٹھے یا بارہ بجے سو کر اٹھے کوئی خلل ڈالنے والا نہیں ہے۔ اس انشائیہ میں ایک طرف میاں بیوی کے باہمی رشتے کو اجاگر کیا گیا ہے۔ مزید براں بیوی کا اپنے شوہر کے دوستوں کے تعلق سے کیا نظریہ ہے۔ یہ اقتباس دیکھیں:

''چنانچہ میری اہلیہ میرے دوستوں کی تمام عادات و خصائل سے واقف ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے دوست جتنے مجھ کو عزیز ہیں اتنے ہی روشن آرا کو برے لگتے ہیں۔ میرے احباب کی جن اداؤں نے مجھے مسحور کر رکھا ہے، انہیں میری اہلیہ ایک شریف انسان کے لیے باعث ذلت سمجھتی ہے۔

آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ خدانخواستہ وہ کوئی ایسے آدمی ہیں، جن کا ذکر کسی معزز مجمع میں نہ کیا جا سکے۔ کچھ اپنے ہنر کے طفیل اور کچھ خاکسار کی صحبت کی بدولت سب کے سب ہی سفید پوش ہیں لیکن اس بات کو کیا کروں کہ ان کی دوستی

میرے گھر کے امن میں اس قدر خلل انداز ہوتی ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔''

اس انشائیہ میں میاں صاحب کی وفاداری بیوی روشن آرا سے غیر معمولی ہے جس کا اظہار انہوں نے آغاز انشائیہ میں کر دیا ہے۔''میں ایک میاں ہوں'' کے مطالعہ سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ اس واقعہ کے ذریعہ پطرس نے ایک خوبصورت انشائیہ قلم بند کر دیا اور قاری کو صورت واقعہ سے مزاح پیدا کر کے اپنا گرویدہ بنالیا ہے اور انہوں نے اپنے انشائیہ میں رعایت لفظی، موازنہ اور صورت واقعہ اور کرداروں کی وساطت سے واحد متکلم کے صیغے میں مزاح پیدا کر دیا ہے۔ دوستوں کی لمبی فہرست ہے لیکن انہوں نے کچھ دوستوں کا ہی ذکر کیا ہے۔ اس انشائیہ کا ایک کردار مرزا صاحب ہے جو میاں صاحب کا خاص دوست ہے۔ جس سے میاں صاحب کی بیوی روشن آرا خار کھاتی ہے۔ یہاں مصنف نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ان کی بیوی بہت ہی شریف خاتون ہے۔ ان میں مشفقانہ اور ہمدردانہ رویہ بھی ہے۔ وہ سب کی مدد کرنے کو تیار ہے لیکن مرزا صاحب کے تعلق سے اس کا ردعمل حیرت انگیز ہے۔ انہوں نے اس واقعہ کے بیان کے ذریعہ اس طرح مزاح پیدا کیا ہے۔ اقتباس دیکھئے:

> ''ہماری اہلیہ کی یہ کیفیت ہے کہ محلے کا کوئی بدمعاش جوئے میں قید ہو جائے تو اس کی ماں کے پاس ماتم پرسی تک کو چلی جاتی ہیں۔ گلی ڈنڈے میں کسی کی آنکھ پھوٹ جائے تو مرہم پٹی کرتی رہتی ہیں۔ کوئی جیب کترا پکڑا جائے تو گھنٹوں آنسو بہاتی رہتی ہیں لیکن وہ بزرگ جن کو دنیا بھر کی زبان مرزا صاحب مرزا صاحب کہتے تھکتی نہیں، ہمارے گھر میں ''موئے کبوتر باز'' کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ کبھی بھولے سے بھی میں آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کسی چیل، کوے، گدھ، شکرے کو دیکھنے لگ جاؤں تو روشن آرا کو فوراً خیال ہو جاتا ہے کہ بس اب یہ بھی کبوتر باز بننے لگا۔''

پطرس کے مزاح کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ صورت واقعہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ان کا ذاتی واقعہ ہے۔ اپنے آپ پر ہنسنے اور دوسروں کو ہنسانے میں ان کو امتیاز حاصل ہے۔ پطرس بخاری نے ''میں ایک میاں ہوں'' کے ذریعہ روشن آرا کی نفسیات کو بہترین طریقے سے پیش کیا ہے۔ پطرس نے اپنے انشائیوں میں صرف مزاح پیدا نہیں کیا ہے بلکہ زندگی کی بعض تلخ حقیقتوں کا اظہار بھی کیا ہے۔ ایک بیوی اپنے شوہر کے تئیں کیا نظریہ رکھتی ہے وہ اپنے شوہر کے لیے ہمیشہ اچھائی ہی سوچے گی اور شوہر کو ان کے دوستوں سے اس لیے دور رکھنا چاہتی ہے کہ وہ دوست بالکل عیار اور مکار ہیں، وقت شناس نہیں۔ پطرس نے ''میں ایک میاں ہوں'' میں بہترین مزاح وظرافت کے گل بوٹے سجائے ہیں۔ پطرس کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اس انشائیہ میں معمولی اشیاء پر غور کرتے ہیں اور اس سے مضحکہ پہلوؤں کو تلاش کرتے ہیں۔ ایک دوست اپنے دوست کے ساتھ جو برا سلوک کرتا ہے اسے بیوی ہرگز برداشت نہیں کر سکتی ہے۔ پطرس کا مشاہدہ بہت وسیع ہے۔ انہوں نے تجربے

کی بنیاد پر اس طرح کے انشائیہ کو قلم بند کر دیا ہے۔ اس انشائیہ میں بیوی کی تنک مزاجی اور ناراضگی انشائیہ میں مزاح پیدا کرنے کا ایک وسیلہ بھی ہے اور عورتوں کی نفسیات کا خاصہ بھی ہے لیکن بیوی کی ناراضگی انشائیہ نگار نے انشائیہ کے اختتام پر صحیح ثابت کر دیا ہے اور اپنے دوستوں کی حرکتوں کا مکمل اظہار بھی کیا ہے۔ یہاں بیوی نے جو کچھ کیا ظرافت کا بین ثبوت ہے۔ میاں صاحب کے منھ میں کالی اور لمبوتری ٹوپی دیکھ بیوی کا جو ردعمل مصنف نے پیش کیا ہے یہ انشائیہ نگار کے وسیع مشاہدے کا غماز ہے۔

''کھیل شروع ہوا۔ بدقسمتی سے ہم چور بن گئے۔ طرح طرح کی سزائیں تجویز ہونے لگیں۔'' کوئی کہے، ''ننگے پاؤں بھاگتا ہوا جائے اور حلوائی کی دکان سے مٹھائی خرید کر لائے۔'' کوئی کہے ''نہیں حضور! سب کے پاؤں پڑے، اور ہر ایک سے دو دو چانٹے کھائے۔'' دوسرے نے کہا ''نہیں صاحب ایک پاؤں پر کھڑا ہو کر ہمارے سامنے ناچے۔'' آخر میں بادشاہ سلامت بولے، ''ہم حکم دیتے ہیں کہ چور کو کاغذ کی ایک لمبوتری نوک دار ٹوپی پہنائی جائے اور اس کے چہرے پر سیاہی مل دی جائے اور یہ اسی حالت میں جا کر اندر سے حقے کی چلم بھر کر لائے۔'' سب نے کہا ''کیا دماغ پایا ہے حضور نے! کیا سزا تجویز کی ہے! واہ واہ'' اپنی یہ حالت کہ منہ پر سیاہی ملی ہے، سر پر وہ لمبوتری سی کاغذ کی ٹوپی پہن رکھی ہے اور ہاتھ میں چلم اٹھائے کھڑے ہیں اور مردانے کمرے سے قہقہوں کا شور برابر آ رہا ہے۔ روح منجمد ہوگئی اور تمام حواس نے جواب دے دیا۔ روشن آرا کچھ دیر تک چپکی کھڑی دیکھتی رہی اور پھر کہنے لگی.....بس میں کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی؟ اس کی آواز تو میرے کانوں تک جیسے بیہوشی کے عالم میں پہنچ رہی تھی۔''

پطرس نے اس انشائیے میں بیوی اور دوستوں کے واقعات کو بیان کر کے ایک دلچسپ انشائیہ لکھا ہے اور پطرس کے مزاح میں روانی اور شگفتگی ہے۔ ان کے یہاں طنز بہت تیکھا نہیں ہے ان کے اس انشائیے میں موضوعات کا تنوع ہے۔ انہوں نے صورت واقعہ سے مزاح پیدا کر کے ''میں ایک میاں ہوں'' کو بلند مقام عطا کیا ہے۔ مختصر طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ پطرس کو زبان و بیان پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ وہ زبان کی باریکیوں اور لطافتوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کا ذخیرۂ الفاظ بھی وسیع ہے۔ وہ فکری بلندی اور ذہنی بصیرت سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ان کے مزاح میں دلکشی ہے اور قاری کو بار بار پڑھنے پر مجبور بھی کرتے ہیں اور سماجی حقیقت کو آشکار بھی کرتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں میں مزاحیہ اسلوب سے سماج کی حقیقتوں کا انکشاف کرتے ہیں۔

پطرس بخاری نے اس انشائیہ میں گھر کے اس خلل، بیوی کا میکے جانا اور شوہر کی آزادی کا جشن، دوستوں کی محفل اور ہنگامہ آرائی

اور بیوی کا شوہر کے دوستوں سے کوفت کرنا، اور بیوی کا اچان میکے سے آنا۔شوہر منہ میں سیاہی اور سر پر لمبوتری کاغذ کی ٹوپی کا دیکھنا۔ان موضوعات کو پطرس نے مزاحیہ اسلوب میں بیان کیا ہے۔یہ انشائیہ اردو کے اہم انشائیوں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔

11.3.1 سرگرمی - آؤاپنی معلومات جانچیں

عزیز طلبا وطالبات آیئے ایک لمحے کے لیے رکیں اب جبکہ آپ نے پطرس بخاری کا انشائیہ ''میں ایک میاں ہوں'' کا مطالعہ کرلیا اوراس کا تجزیہ بھی پڑھ لیا تو نیچے دی گئی مشقیں حل کریں اور صحیح یا غلط کا نشان لگائیں۔

1۔ ''میں ایک میاں ہوں'' پطرس بخاری کے مجموعہ ''مضامین پطرس'' میں شامل ہے۔ ( )

2۔ ''میں ایک میاں ہوں'' میں میاں، بیوی اور دوستوں کے واقعات قلم بند ہیں۔ ( )

3۔ مضامین پطرس میں کل بارہ مضامین ہیں۔ ( )

4۔ مضامین پطرس میں ایک انشائیہ ''ہاسٹل میں پڑھنا'' بھی شامل ہے۔ ( )

5۔ مرزا صاحب، روشن آرا ''میں ایک میاں ہوں'' کے کردار ہیں۔ ( )

11.4 عمومی جائزہ

پطرس بخاری اردو کے نامور انشائیہ نگار ہیں۔ان کے کل گیارہ انشائیے ہیں۔ ہر انشائیہ موضوع اور فن کے اعتبار سے منفرد نوعیت کا ہے۔ان کا انشائیہ ''میں ایک میاں ہوں'' بہت ہی دلچسپ اور عمدہ انشائیہ ہے۔اس انشائیہ میں مصنف نے سماج کی حقیقت نگاری کو مزاح کے پیرائے میں پیش کیا ہے۔اس انشائیہ میں تین لوگوں کی طرز زندگی اور سوچ کو اجاگر کیا گیا ہے۔شوہر، بیوی اور دوستوں کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ بیوی شوہر کو دل وجان سے چاہتی ہے لیکن ان کے دوستوں سے نفرت کرتی ہے اور اس لیے نفرت کرتی ہے کہ شوہر کے دوستوں کا اخلاق واقدار صحیح نہیں ہے اور وہ شوہر کو ان کے ساتھ رہنے دینا نہیں چاہتی۔میاں صاحب کو بعد میں احساس ہوتا ہے کہ ان کے دوست اچھے نہیں ہیں اور آخر میں بیوی کی بات مانتے ہیں۔پطرس کے اس انشائیہ کی مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ پطرس نے صورت واقعہ سے مزاح پیدا کر کے معاشرے کی حقیقت سے روشناس کرایا ہے۔پطرس نے یقیناً اردو مزاحیہ ادب میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ان کی ان خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

11.5 فرہنگ

مطیع	:	فرمانبردار، اطاعت کرنے والا
خصائل	:	خصلت کی جمع، عادت
طفیل	:	واسطہ، ذریعہ، وسیلہ
معقول	:	عقل کے مطابق، مناسب
فطرت	:	قدرت، شرارت، سازش
خوشنودی	:	رضاجوئی، خوشی
مشغول	:	مصروف، کام میں لگا ہوا
مبہوت	:	حیران، سرشار
تہذیب	:	پاکیزگی، شایستگی، خوش اخلاقی
اشتہار	:	اعلان، اطلاع عام، شہرت دینا
شگفتگی	:	پھول کا کھلنا، خوشی، فرحت
معرکہ	:	جنگ، مقابلہ
ضوابط	:	ضابطہ کی جمع، قواعد، قوانین
متانت	:	سنجیدگی
سنجیدگی	:	وقعت، متانت
مسخرہ	:	مزاقیہ، ٹھٹھے باز
برقعہ پوش	:	برقع اوڑھنے والی
منجمد	:	جما ہوا، ٹھوس، سردی سے جما ہوا

لمبوترا	:	لمبے چہرہ والا، لمبا
بےتاب	:	کمزور، بےچین

11.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

طویل سوالات

1۔ ''میں ایک میاں ہوں'' کا تجزیہ کیجئے۔

2۔ اردو مزاح نگاروں میں پطرس کا مقام متعین کیجئے۔

3۔ اردو انشائیوں میں ''میں ایک میاں ہوں'' کی انفرادیت واضح کیجئے۔

4۔ پطرس کے مزاحیہ اسلوب پر سیر حاصل گفتگو کیجئے۔

مختصر سوالات

1۔ پطرس بخاری کے سوانحی کوائف کا مختصر جائزہ لیجئے۔

2۔ ''میں ایک میاں ہوں'' کے روشن آرا کے مزاحیہ کردار سے بحث کیجئے۔

3۔ پطرس بخاری کا اسلوب بیان کیجئے۔

4۔ ''میں ایک میاں ہوں'' کا خلاصہ لکھیے۔

11.7 مشقی سوالات

سوالات

1۔ ''میں ایک میاں ہوں'' پطرس بخاری کے کس مجموعے میں شامل ہے اور ان میں کل کتنے مضامین ہیں؟ کسی دو مضمون کا نام لکھیے۔

2۔ ''میں ایک میاں ہوں'' میں سے تین کرداروں کے نام لکھئے، ان کے باہمی رشتے بیان کیجئے۔

3۔ پطرس بخاری کے اسلوب کا مختصر جائزہ لیجئے؟

11.8 مشقی سوالات کے جوابات

1۔ ''میں ایک میاں ہوں'' مضامین پطرس میں شامل ہے اس میں کل گیارہ مضامین ہیں۔ ہاسٹل میں پڑھنا، مرید پور کا پیر، کتے، سویرے جو کل آنکھ میری کھلی۔

2۔ میاں، مرزا صاحب، روشن آرا، یہ تین کردار ہیں۔ روشن آرا کے شوہر میاں صاحب ہیں، مرزا صاحب میاں صاحب کے دوست ہیں۔

3۔ پطرس بخاری کا اسلوب بہت دلچسپ ہے۔ ان کے یہاں طنز کم اور مزاح زیادہ پایا جاتا ہے۔ زبان میں سادگی، سلاست اور روانی ہے۔ انہوں نے ثقیل الفاظ اور محاوروں اور ضرب الامثال کے استعمال سے گریز کیا ہے۔ اس لئے ان کا انشائیہ عام قاری بھی دلچسپی سے پڑھتا ہے۔

11.9 امدادی کُتب Books Prescribed

امدادی کُتب Books Prescribed.

۱۔ انتخاب اُردو نثر) ۱۸۵۷ء ۱۹۲۰ء ایجوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ۔

۲۔ انتخاب اُردو نثر ۱۹۲۰ء کے بعد ای جوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ

Books Recommended.

۱۔ مختصر تاریخ ادب اُردو۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین ترجمہ و اضافے	ڈاکٹر سید محمد عقیل
۲۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح۔	ڈاکٹر وزیر آغا
۳۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح۔	غلام احمد فرقت کاکوروی
۴۔ رشید احمد صدیقی۔ شخصیت اور فن۔	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
۵۔ اُردو انشائیہ۔	وزیر آغا
۶۔ انشائیہ کے فنی سروکار۔	ڈاکٹر احمد امتیاز
۷۔ انشائیہ کی بنیاد۔	ڈاکٹر سلیم اختر

۸۔ فنِ انشائیہ اور انشائیے۔	ڈاکٹر فرحت شمیم
۹۔ انشائیہ کے خدوخال	وزیر آغا
۱۰۔ انشائیہ کی بنیاد	ڈاکٹر سلیم اختر
۱۱۔ انشائیہ اردو ادب میں	ڈاکٹر انور سدید
۱۲۔ انشائیہ	ڈاکٹر آدم شیخ
۱۳۔ ڈپٹی نذیر احمد احوال و آثار	محمد اکرام چغتائی
۱۴۔ مولوی نذیر احمد احوال و آثار	ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی
۱۵۔ لکچروں کا مجموعہ (مرتبہ)	محمد نذیر حسین
۱۶۔ نذیر احمد	نور الحسن نقوی
۱۷۔ فکر و نظر (ڈپٹی نذیر احمد نمبر) علی گڑھ	
۱۸۔ خواجہ حسن نظامی: شخصیت اور ادبی خدمات	نثار احمد فاروقی
۱۹۔ خواجہ حسن نظامی کی نثر	ڈاکٹر مولا بخش
۲۰۔ خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری	سید محمد نیر رضوی
۲۱۔ خواجہ حسن نظامی کتاب نما	خصوصی شمارہ

سبق نمبر12 تدریس متن ''غالبؔ جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' - کنہیالال کپور

ساخت

12.0 اغراض ومقاصد

12.1 تعارف

12.2 کنہیالال کپور کی مختصر حالات زندگی

12.2.1 انشائیہ ''غالبؔ جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' کا متن

12.3 ''غالبؔ جدید شعرا کی مجلس میں'' کا تجزیاتی مطالعہ

12.3.1 سرگرمی- صحیح یا غلط

12.4 عمومی جائزہ

12.5 فرہنگ

12.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

12.7 مشقی سوالات

12.8 مشقی سوالات کے جوابات/جوابات سرگرمی

12.9 امدادی کتب

12.0 اغراض ومقاصد

عزیز متعلّم اس سبق کے مطالعے کے بعد اس قابل ہو جائیں گے کہ

پطرس بخاری کی حیات وادبی خدمات سے واقف ہوسکیں گے۔

پطرس بخاری کے انشائیہ نگاری سے واقف ہوسکیں گے۔

پطرس بخاری کے انشائیہ ''جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' کے متن کی تفہیم کرسکیں گے۔

کنہیالال کپور کی مزاح نگاری کی خصوصیات سے واقف ہوسکیں گے۔

کنہیالال کپور کے اسلوب سے بھی واقف ہوسکیں گے۔

12.1 تعارف

اردو میں مزاحیہ ادب کا گراں قدر سرمایہ موجود ہے۔اردو کے مزاح نگاروں کی تعداد خاصی طویل ہے لیکن اردو انشائیہ نگاری کی فہرست میں کچھ ایسے نام ہیں جن کے ذکر کے بغیر مزاح وانشائیہ کا تصور ممکن نہیں۔رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، کنہیالال کپور کا نام بہت بلند ہے۔کنہیالال کپور کو کسی ایک خانے میں ہم نہیں رکھ سکتے۔ان کو انشا پرداز کہا جائے یا ظرافت نگار یا پیروڈی نگار وہ ان تمام میدان میں اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔وہ اپنے رنگ وروپ میں ایک مشاق فنکار ہیں مزاحیہ ادب بالخصوص انشا پردازی میں کنہیالال کپور کی قدر و قیمت متعین کرنا آسان نہیں۔انہوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کا حق ادا کردیا۔انہوں نے اپنے انشائیوں کا آغاز ڈرامائی انداز میں کیا ہے۔کنہیالال کپور کا مطالعہ بے حد وسیع تھا وہ انگریزی ادب سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔انہوں نے انگریزی ادب کے مزاحیہ مضامین کا بہت مطالعہ کیا تھا اور اس سے کسی حد تک استفادہ بھی کیا۔کنہیالال کپور کی بنیادی ادبی شناخت پیروڈی ہے اور وہ اردو دنیا میں پیروڈی کے حوالے سے زیادہ مشہور ہوئے۔ لیکن انہوں نے اپنے آپ کو پیروڈی تک محدود نہیں رکھا ان کے بیشتر مضامین انشائیہ کے پیرائے میں بھی موجود ہیں۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں انشائیہ نگاری میں مزاح کے استعمال کا فن اچھی طرح کیا ہے۔ان کو اردو زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی اور اردو زبان سے غیر معمولی محبت بھی کرتے تھے۔کنہیا کو مزاح پیدا کرنے کا ہنر آتا تھا انہوں نے اس میدان میں اپنے مشاہدے اور تجربے کا بھرپور استعمال کیا ہے۔''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' کے مطالعہ سے عیاں ہوتا ہے کہ انہوں نے اس پیروڈی میں صرف طنز ومزاح سے کام نہیں لیا ہے بلکہ اس میں تنقیدی عناصر بھی کارفرما ہیں۔

12.2 کنہیالال کپور کی مختصر حالات زندگی

آپ کی پیدائش 27 جون 1910 ضلع لائل پور موجودہ فیصل آباد پاکستان میں ہوئی۔ اور ان کے والد محترم لابری رام کپور، اور دادا ناٹگ چند کپور نیز والدہ محترمہ مسز دیوی کپور بہت ہی با اخلاق فیملی تھی ان کا آبائی پیشہ تجارت تھا اور یہ لوگ ہندو کھتری تھے اور ان پر ان کو فخر حاصل تھا۔ کنہیالال کپور کی ابتدائی تعلیم اس دور کی روایت کے حساب سے ہوئی۔ اور انہوں نے تعلیم کا آغاز مقامی اسکول سے کیا۔ اس کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ ضلع لائل پور، 1928 میں میٹرک پاس کیا اور اس کے بعد وہ لاہور آ گئے۔ یہاں ایم اے کی تعلیم مکمل کر کے ایک کالج میں انگریزی کے استاد مقرر ہو گئے۔ کپور ڈج کالج کے موکا ہی وائس پرنسپل اور پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ زمانہ طالب علمی میں کپور تصنیف و تالیف میں منہمک ہو گئے تھے۔ اور اسی زمانے میں رامپور کی اہم میگزین ''اراوی'' سے اپنے مضمون کی ابتدا انگریزی میں لکھ کر کی۔ اور 1932 میں کرشن چندر کے افسانے ''یرقان'' کی پیروڈی خفقان کے نام قلم بند کی۔ اور با قاعدہ مضامین لکھنے کا آغاز 1938 سے کیا۔ کنہیالال کپور نے فلمی دنیا میں بہت کام کیا۔ وہ بحیثیت ڈائیلاگ نگراں، اسکرپٹ نگراں کا کام کیا۔ کنہیالال کپور نے اردو ادب میں بیش بہا سرمایہ چھوڑا ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ ''سنگ و خشت'' (1944) شیشہ و تیشہ جنگ در باب (1944) اور 1946 میں شائع ہوا۔ ان کی شاہ کار پیروڈی ''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' بہت مقبول و معروف ہوئی اور اکثر جامعات میں اردو کے نصاب کا حصہ ہے۔ انہوں نے بہت سے مضامین انشائیہ کے پیرائے میں لکھے ہیں اور یہ انشائیے اردو مزاحیہ ادب میں بہت مقبول بھی ہوئے اور قاری نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کنہیالال کپور نے اردو ادب کے لیے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ 5 مئی 1980 کو اس دنیا کو چھوڑ کر چلے گئے۔

12.2.1 انشائیہ ''غالبؔ جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' کا متن

دور جدید کے شعرا کی ایک مجلس میں مرزا غالبؔ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ اس مجلس میں تقریباً تمام جلیل القدر جدید شعرا تشریف فرما ہیں۔ مثلاً م۔ ن ارشدؔ، ہیراجیؔ، ڈاکٹر قربان حسین خالصؔ، میاں رقیق احمد خوگر، راجہ عہد علی خاںؔ، پروفیسر غیظ احمد غیظؔ، بکرماجیت ورما، عبدالحی نگاہؔ وغیرہ۔ یکا یک مرزا غالبؔ داخل ہوتے ہیں ان کی شکل و صورت بعینہ وہی ہے جو مولانا حالیؔ نے ''یادگار غالب'' میں بیان کی ہے۔ ان کے ہاتھ میں ''دیوان غالب'' کا ایک نسخہ ہے۔ تمام شعرا کھڑے ہو کر آداب بجالاتے ہیں۔

غالبؔ: ''حضرات! میں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے جنت میں دعوت نامہ بھیجا اور اس مجلس میں مدعو کیا۔ میری مدت

سے آرزو تھی کہ دور جدید کے شعرا سے شرف نیاز حاصل کروں۔

ایک شاعر: یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے وگرنہ،

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

غالب: رہنے بھی دیجئے اس بے جا تعریف کو۔ من آنم کہ من دانم۔

دوسرا شاعر: تشریف رکھئے گا۔ کہئے جنت میں خوب گذرتی ہے۔ آپ تو فرمایا کرتے تھے۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن

غالب: (مسکرا کر) بھئی جنت بھی خوب جگہ ہے۔ جب سے وہاں گیا ہوں، ایک شعر بھی موزوں نہیں کر سکا۔

دوسرا شاعر: تعجب! جنت میں تو آپ کو کافی فراغت ہے اور پھر ہر ایک چیز میسر ہے۔ پینے کو شراب، انتقام لینے کو پری زاد ____ اور اس پر یہ فکر کوسوں دور کہ

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

باوجود اس کے آپ کچھ لکھ.....

تیسرا شاعر: (بات کاٹ کر) سنایئے اقبالؔ کا کیا حال ہے؟

غالب: وہی جو اس دنیا میں تھا۔ دن رات خدا سے لڑنا جھگڑنا۔ وہی پرانی بحث۔

مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

پہلا شاعر: میرے خیال میں وقت کافی ہو گیا ہے۔ اب مجلس کی کاروائی شروع کرنی چاہیے۔

دوسرا شاعر، میں کرسئ صدارت کے لئے جناب م۔ن۔ارشد کا نام تجویز کرتا ہوں۔

(ارشد صاحب کرسئ صدارت پر بیٹھنے سے پہلے حاضرین مجلس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔)

م۔ن۔ارشد: میرے خیال میں ابتدا مرزا غالب کے کلام سے ہونی چاہیے۔۔۔ میں نہایت ادب سے مرزا موصوف سے درخواست

کرتا ہوں کہ اپنا کلام پڑھیں۔

غالب: بھئی جب ہمارے سامنے شمع لائی جائے گی تو ہم بھی کچھ پڑھ کر سنا دیں گے۔

م۔ن۔ارشد: معاف کیجئے گا۔مرزا، اس مجلس میں شمع وغیرہ کسی کے سامنے نہیں جائے گی۔شمع کی بجائے یہاں پچاس کینڈل پاور کا لیمپ ہے، اس کی روشنی میں ہر ایک شاعر اپنا کلام پڑھے گا۔

غالب: بہت اچھا صاحب تو غزل سنئے گا۔

باقی شعرا: ارشاد۔

غالب: عرض کیا ہے۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

(باقی شعرا ہنستے ہیں۔مرزا حیران ہو کر ان کی جانب دیکھتے ہیں)

غالب: جی صاحب یہ کیا حرکت ہے۔نہ داد نہ تحسین، اس بے موقع خندہ زنی کا مطلب؟

ایک شاعر: معاف کیجئے مرزا، ہمیں یہ شعر کچھ بے معنی سا معلوم ہوتا ہے۔

غالب: بے معنی؟

ہیرا جی: دیکھئے نا مرزا، آپ فرماتے ہیں ''خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو'' اگر مطلب کچھ نہیں تو خط لکھنے کا فائدہ ہی کیا۔اور اگر آپ صرف معشوق کے نام کے ہی عاشق ہیں تو تین پیسے کا خط برباد کرنا ہی کیا ضرور، سادہ کاغذ پر اس کا نام لکھ لیجئے۔

ڈاکٹر قربان حسین خالص: میرے خیال میں اگر یہ شعر اس طرح لکھا جائے تو زیادہ موزوں ہے،

خط لکھیں گے کیوں کہ چھٹی ہے ہمیں دفتر سے آج
اور چاہے بھیجنا ہم کو پڑے بیرنگ ہی
پھر بھی تم کو خط لکھیں گے ہم ضرور
چاہے مطلب کچھ نہ ہو

جس طرح سے میری اک اک نظم کا

کچھ بھی تو مطلب نہیں

خط لکھیں گے کیوں کہ الفت ہے ہمیں

میرا مطلب ہے محبت ہے ہمیں

یعنی عاشق ہیں تمہارے نام کے

غالب: یہ تو اس طرح معلوم ہوتا ہے، جیسے آپ میرے اس شعر کی ترجمانی کر رہے ہیں۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ہیرا جی: جنوں، جنوں کے متعلق مرزا میں نے کچھ عرض کیا ہے اگر اجازت ہو تو کہوں۔

غالب: ہاں، ہاں بڑے شوق سے۔

ہیرا جی:

جنوں ہوا جنوں ہوا

مگر کہاں جنوں ہوا

کہاں ہوا ،وہ کب ہوا

ابھی ہوا یا اب ہوا

نہیں ہوں میں یہ جانتا

مگر جدید شاعری

میں کہنے کا جو شوق ہے

تو بس یہی ہے وجہ کہ

دماغ میرا چل گیا

یہی سبب ہے جو مجھے

جنوں ہوا جنوں ہوا

غالب: (ہنسی کو روکتے ہوئے) سبحان اللہ کیا برجستہ اشعار ہیں۔

م۔ن۔ارشد: اب مرزا، غزل کا دوسرا شعر فرمائیے۔

غالب: میں اب مقطع ہی عرض کروں گا، کہا ہے۔

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

عبدالحی نگاہ: گستاخی معاف مرزا۔ اگر اس شعر کا پہلا مصرع اس طرح لکھا جاتا تو ایک بات پیدا ہو جاتی۔

غالب: کس طرح؟

عبدالحی نگاہ:

عشق نے، ہاں ہاں تمہارے عشق نے

عشق نے سمجھے تمہارے عشق نے

مجھ کو نکما کر دیا

اب نہ اٹھ سکتا ہوں میں

اور چل تو سکتا ہی نہیں

جانے کیا بکتا ہوں میں

یعنی نکما کر دیا

اتنا تمہارے عشق نے

گرتا ہوں اور اٹھتا ہوں میں

اٹھتا ہوں اور گرتا ہوں میں

یعنی تمہارے عشق نے

اتنا نکما کر دیا

غالب: (طنزاً) بہت خوب۔ بھئی غضب کر دیا۔

غیظ احمد غیظؔ: اور دوسرا مصرع اس طرح لکھا جا سکتا تھا۔

جب تک نہ مجھ کو عشق تھا

تب تک مجھے کچھ ہوش تھا

سب کام کر سکتا تھا میں

اور دل میں میرے جوش تھا

اس وقت تھا میں آدمی

اور آدمی تھا کام کا

لیکن تمہارے عشق نے

مجھ کو نکما کر دیا

غالب: واللہ۔ کمال ہی تو کر دیا، بھئی اب آپ لوگ اپنا کلام سنائیں۔

م۔ن۔ارشد: اب ڈاکٹر قربان حسین خالصؔ، جو جدید شاعری کے امام ہیں اپنا کلام سنائیں گے۔

ڈاکٹر خالصؔ: اجی ارشد صاحب میں کیا کہوں، اگر میں امام ہوں تو آپ مجتہد ہیں۔ آپ جدید شاعری کی منزل ہیں اور میں سنگ میل اس لئے آپ اپنا کلام پہلے پڑھئے۔

م۔ن۔ارشد: توبہ توبہ! اتنی کسر نفسی۔ اچھا اگر آپ مصر ہیں تو میں ہی اپنی نظم پہلے پڑھتا ہوں۔ نظم کا عنوان ہے۔ ''بدلہ'' عرض کیا ہے۔

آ مری جان مرے پاس انگیٹھی کے قریب

جس کے آغوش میں یوں ناچ رہے ہیں شعلے

جس طرح دور کسی دشت کی پہنائی میں

رقص کرتا ہو کوئی بھوت کہ جس کی آنکھیں
کرم شب تاب کی مانند چمک اٹھتی ہیں
ایسی تشبیہ کی لذت سے مگر دور ہے تو
تو کہ اک اجنبی انجان سی عورت ہے جسے
رقص کرنے کے سوا اور نہیں کچھ آتا
اپنے بے کار خدا کے مانند

دوپہر کو جو کبھی بیٹھے ہوئے دفتر میں
خودکشی کا مجھے یک لخت خیال آتا ہے
میں پکار اٹھتا ہوں یہ جینا بھی ہے کیا جینا
اورچپ چاپ دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں

آ مری جان مرے پاس انگیٹھی کے قریب
تاکہ میں چوم ہی لوں عارض گلفام ترا
اور ارباب وطن کو یہ اشارہ کردوں
اس طرح لیتا ہے اغیار سے بدلہ شاعر
اور شب عیش گزر جانے پر
بہر جمع درم و دام نکل جاتا ہے
ایک بوڑھے سے تھکے ماندے سے رہوار کے پاس
چھوڑ کر بستر سنجاب و سمور

(نظم سن کر سامعین پر وجد کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ ہیرا جی یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ یہ نظم اس

صدی کی بہترین نظم ہے، بلکہ میں تو کہوں گا کہ اگر ایک طرح سے دیکھا جائے تو اس میں انگیٹھی، بھوت اور دفتر، تہذیب وتمدن کی مخصوص الجھنوں کے حامل ہیں۔)

(حاضرین ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے زیرلب مسکراتے ہیں۔)

غالب: ارشد صاحب معاف کیجئے۔ آپ کی یہ نظم کم از کم میرے فہم سے تو بالاتر ہے۔

غیظ احمد غیظ: یہ صرف ارشد پر ہی کیا منحصر ہے، مشرق کی جدید شاعری ایک بڑی حد تک مبہم، اور ادراک سے بالاتر ہے۔

م۔ن۔ارشد: مثلاً میرے ایک دوست کے اس شعر کو لیجئے۔

پاپوش کی کیا فکر ہے دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج گزر جائے گی سر سے

اب بتایئے اس شعر کا کیا مطلب ہے؟

غالب: (شعر کو دہرا کر) صاحب سچ تو یہ ہے کہ اگرچہ اس شعر میں سر اور پیر کے الفاظ شامل ہیں، مگر باوجود ان کے اس شعر کا نہ سر ہے نہ پیر۔

م۔ن۔ارشد: اجی چھوڑیئے اس حرف گیری کو۔ آپ اس شعر کو سمجھے ہی نہیں۔ مگر خیر اس بحث میں کیا رکھا ہے۔ کیوں نہ اب ڈاکٹر قربان حسین خالصؔ سے درخواست کی جائے کہ اپنا کلام پڑھیں۔

ڈاکٹر خالصؔ: میری نظم کا عنوان ہے ''عشق'' عرض کیا ہے۔

عشق کیا ہے؟
میں نے اک عاشق سے پوچھا۔
اس نے یوں رو کر کہا
عشق اک طوفان ہے
عشق اک سیلاب ہے
عشق ہے اک زلزلہ
شعلۂ جوالہ ــــــ عشق

عشق ہے پیغام موت

غالب: بھئی یہ کیا مذاق ہے، نظم پڑھیے۔ مشاعرے میں نثر کا کیا کام؟

ڈاکٹر خالص: (جھنجھلا کر) تو آپ کے خیال میں یہ نثر ہے؟ یہ ہے آپ کی سخن فہمی کا عالم، اور فرمایا تھا آپ نے:

''ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں''

غالب: میری سمجھ میں تو نہیں آیا کہ یہ کس قسم کی نظم ہے نہ ترنم، نہ قافیہ، نہ ردیف۔

ڈاکٹر خالص: مرزا صاحب! یہی تو جدید شاعری کی خصوصیت ہے۔ آپ نے اردو شاعری کو قافیہ اور ردیف کی فولادی زنجیروں میں قید کر رکھا تھا۔ ہم نے اس کے خلاف جہاد کر کے اسے آزاد کیا ہے اور اس طرح اس میں وہ اوصاف پیدا کئے ہیں جو محض خارجی خصوصیات سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ میری مراد رفعت تخیل، تازگی افکار اور ندرت فکر سے ہے۔

غالب: رفعت تخیل، کیا خوب۔ کیا پرواز ہے،

میں نے اک عاشق سے پوچھا، اس نے یوں رو کر کہا

ڈاکٹر خالص: (چڑ کر) عاشق رو کر نہیں کہے گا تو کیا قہقہہ لگا کر کہے گا؟ مرزا آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ عشق اور رونے میں کتنا گہرا تعلق ہے۔

غالب: مگر آپ کو قافیہ اور ردیف ترک کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

رفیق احمد خوگر: اس کی وجہ مغربی شعرا کا تتبع نہیں بلکہ ہماری طبیعت کا فطری میلان ہے، جو زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح شعر و ادب میں بھی آزادی کا جویا ہے۔ اس کے علاوہ دور جدید کی روح انقلاب، کشمکش، تحقیق، تجسس، تعقل پرستی اور جدوجہد ہے۔ ماحول کی اس تبدیلی کا اثر ادب پر ہوا ہے۔ اور میرے اس نکتے کو تھیکرے نے بھی اپنی کتاب وینٹی فیئر میں تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ اسی لئے ہم نے محسوس کیا کہ قدیم شاعری ناقص ہونے کے علاوہ روح میں وہ لطیف کیفیت پیدا نہیں کر سکتی، جو مثال کے طور پر ڈاکٹر خالص کی شاعری کا جوہر ہے۔ قدیم شعرا اور جدید شعرا کے ماحول میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قدیم شعرا بقول مولانا آزاد حسن و عشق کی حدود سے باہر نہ نکل سکے اور ہم جن میدانوں میں گھوڑے دوڑا رہے ہیں نہ ان کی وسعت کی انتہا ہے اور نہ ان کے عجائب و لطائف کا شمار۔

غالب: میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

م۔ن۔ ارشد: خوگر صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم ایک نئی دنیا میں رہتے ہیں۔ یہ ریڈیو ہوائی جہاز اور دھماکے سے پھٹنے والی بموں کی

دنیا ہے۔ یہ بھوک، بیکاری، انقلاب اور آزادی کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں رہ کر ہم اپنا وقت حسن و عشق، گل و بلبل، شیریں فرہاد کے افسانوں میں ضائع نہیں کر سکتے۔ شاعری کے لئے اور بھی موضوع سخن ہیں، جیسا کہ ہمارے ایک شاعر نے کہا:

آج تک سرخ سیہ صدیوں کے سائے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی اجداد پہ کیا گزری ہے
یہ حسیں کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
یہ ہر اک سمت پر اسرار کڑی دیواریں
یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے

راجہ عہد علی خاں: بہت خوب، ''یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے''، ایسے ہی مضامین میں سے ایک مضمون ''ڈاک خانہ'' ہے جو میری اس نظم کا جو میں ابھی آپ کے سامنے پڑھوں گا، موضوع ہے۔

غالب: ڈاک خانہ۔

راجہ عہد علی خاں: مرزا اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ سنئے عرض کیا ہے۔

ڈاک خانے کے ہے اندر آج اف کتنا ہجوم
ڈالنے کو خط کھڑے ہیں کس قدر اُف آدمی
ان میں ہر اک کی تمنا ہے کہ وہ
ڈال کر جلدی سے خط یا پارسل
بھاگ کر دیکھے کہ اس کی سائیکل
ہے پڑی باہر جہاں رکھ کر اسے
ڈاک خانے میں ابھی آیا تھا وہ خط ڈالنے

جا رہے ہیں خط چہار اطراف کو

بمبئی کو، مصر کو، لندن کو، کوہ قاف کو

دیکھنا آئی ہے اک عورت لفافہ ڈالنے

کون کہتا ہے کہ اک عورت ہے یہ

یہ تو لڑکا ہے کسی کالج کا کہ

جس کے بال

خدوخال

اس قدر ملتے ہیں عورت سے کہ ہم

اس کو عورت کا سمجھتے ہیں بدل

اف ہماری لغزشیں

ہے مگر کس شخص کا یہ سب قصور

کیا نظر میری نہیں کرتی ہے کام

جھٹپٹا سا ہو گیا ہے شام کا

یا ہمارے ہے تمدن کا قصور

کہ ہمارے نوجواں

ڈاک خانے میں ہیں جب آتے لفافہ ڈالنے

اس قدر دیتے ہیں وہ دھوکا ہمیں

کہ نظر آتے ہیں ہم کو عورتیں

(زوروں کی داد دی جاتی ہے۔ ہر طرف سے مرحبا، بھئی کمال کر دیا، کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ مرزا غالب کی سراسیمگی ہر لمحہ بڑھتی جا رہی ہے۔)

ن۔م۔ارشد: اب میں ہندوستان کے مشہور شاعر پروفیسر غیظ سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے تازہ افکار سے ہمیں نوازیں۔

پروفیسر غیظ: میں نے تو کوئی نئی چیز نہیں لکھی۔

ہیرا جی: تو پھر وہی نظم سنا دیجئے جو پچھلے دنوں ریڈیو والوں نے آپ سے لکھوائی تھی۔

پروفیسر غیظ: آپ کی مرضی، تو وہی سن لیجئے۔عنوان ہے ''لگائی۔''

فون پھر آیا دل زار! نہیں فون نہیں
سائیکل ہو گا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات اترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرد چراغ
تھک گیا رات کو چلا کے ہر اک چوکیدار
گل کرو دامن افسردہ کے بوسیدہ داغ
یاد آتا ہے مجھے سر مہ دنبالہ وار
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو واپس لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

(نظم کے دوران میں اکثر مصرعے دو دو بلکہ چار چار بار پڑھوائے جاتے ہیں اور پروفیسر غیظ بار بار مرزا غالب کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔مرزا غالب مبہوت ہیں۔)

م۔ن۔ارشد: حضرات میرے خیال میں یہ کوئی عشقیہ نظم نہیں ہے، بلکہ اس میں شاعر نے ملک کے اینٹی فاشسٹ جذبے کو خوب نبھایا ہے۔

رقیق احمد: (سرگوشی کے انداز میں ہیرا جی سے) بکواس ہے۔

م۔ن ارشد: اب ہیرا جی اپنا کلام پڑھیں گے۔

ہیرا جی: میری نظم کا عنوان ہے۔''بینگن''

غالب: بینگن؟

ہیرا جی: بینگن۔ اگر آپ آم کی صفت میں قصیدہ لکھ سکتے ہیں تو کیا بندہ بینگن پر نظم لکھنے کا حقدار نہیں۔

غالب: معاف کیجئے گا، نظم پڑھیے۔

ہیرا جی: عرض کیا ہے:

چنچل بینگن کی چھب نیاری
رنگ میں تم ہو کرشن مراری
جان گئی ہیں سکھیاں پیاری
ادھارانی آ ہی گئی تو
کرشن کنہیا ڈھونڈ رہے ہیں
لیکن میں تو بھول چکا ہوں
بینگن سے یہ بات چلی تھی
بھوک لگی ہے کتنی ہائے
جی میں ہے اک بھون کے بینگن
کھاؤ لیکن رادھا پیاری
رنگ کو اس کے دیکھ کے مجھ کو
یاد آتے ہیں کرشن مراری
اس لئے بھوکا رہنا بہتر
چونکہ میں ہوں پریم پجاری

(ہر طرف سے داد دی جاتی ہے، بعض شعرا یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں۔ بھئی جدید شاعری ہیرا جی کا ہی حصہ ہے۔)

م۔ن۔ارشد: اب جناب بکرماجیت صاحب ورما سے استدعا کی جاتی ہے کہ اپنا کلام سنائیں۔

بکرماجیت ورما: میں نے حسب معمول کچھ گیت لکھے ہیں۔

غالب: (حیران ہوکر) شاعر اب گیت لکھ رہے ہیں۔ میرے اللہ دنیا کدھر جارہی ہے۔

بکرماجیت ورما: مرزا، آپ کے زمانے میں گیت شاعری کی ایک باقاعدہ صنف قرار نہیں دیئے گئے تھے، دور جدید کے شعرانے انھیں ایک قابل عزت صنف کا درجہ دیا ہے۔

غالب: جی ہاں، ہمارے زمانے میں عورتیں، بھانڈ، میراثی یا اس قماش کے لوگ گیت لکھا کرتے تھے۔

بکرماجیت: پہلا گیت ہے ''برہن کا سندیس''، عرض کیا ہے،

اڑ جا دیس بدیس رے کوے اڑ جا دیس بدیس

سن کر تیری کائیں کائیں

غالب: خوب، سن کر تیری کائیں کائیں!

بکرماجیت ورما: عرض کیا ہے،

سن کر تیری کائیں کائیں

آنکھوں میں آنسو بھر آئیں

بول یہ تیرے من کو بھائیں

مت جانا پردیس رے کوے اڑ جا دیس بدیس

م۔ن ارشد: بھئی کیا اچھوتا خیال ہے۔ پنڈت صاحب میرے خیال میں ایک گیت آپ نے کبوتر پر بھی لکھا تھا، وہ بھی مرزا کو سنا دیجئے۔

بکرماجیت، سنئے پہلا بند ہے۔

بول کبوتر بول

دیکھ کوئلیا کوک رہی ہے

من میں میرے ہوک اٹھی ہے

کیا تجھ کو بھی بھوک لگی ہے

بول غٹرغوں بول کبوتر

بول کبوتر بول

باقی شعرا: (یک زبان ہوکر) بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول۔

(اس اثنا میں مرزا غالب نہایت گھبراہٹ اور سراسیمگی کی حالت میں دروازے کی طرف دیکھتے ہیں۔)

بکرماجیت ورما: اب دوسرا بند سنئے،

بول کبوتر بول

کیا میرا ساجن کہتا ہے

کیوں مجھ سے روٹھا رہتا ہے

کیوں میرے طعنے سہتا ہے

بھید یہ سارے کھول کبوتر

بول کبوتر بول!

باقی شعرا: (یک زبان ہوکر) بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول۔

(اس شوروغل کی تاب نہ لاکر مرزا غالب بھاگ کر کمرے سے باہر نکل جاتے ہیں۔)

12.3 ''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' کا تجزیاتی مطالعہ

''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' کنہیالال کپور کی اہم تخلیق ہے اور اردو انشائیہ نگاری کی تاریخ اس کے ذکر کے بغیر ادھوری رہے گی۔ اور یہ انشائیہ ان کے پہلے مجموعہ ''سنگ وخشت'' میں شامل ہے۔ اور یہ ایک طرح سے پیروڈی ہے اور انہوں نے اس پیروڈی کے ذریعہ قاری کے دل ودماغ میں مسرت پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔ یہ ایک دلچسپ انشائیہ ہے جس میں مزاح کا عنصر غالب ہے۔ بظاہر تو یہ انشائیہ بہت ہی دلچسپ ہے اور عام قاری زیرلب مسکرانے پر مجبور ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ عام قاری اس انشائیہ کے گہرائی و گیرائی تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس کے طنز ومزاح کے پس پردہ کچھ اور چیزیں ہیں جس کی تفہیم ہر شخص کے لیے آسان نہیں ہے۔ اس حقیقت کا اظہار

ضروری ہے کہ ''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' کا مواد غالب اور جدید شعرا کی زندگی کے حوالے سے لیا گیا ہے۔اس انشائیہ کا تانا بانا کپور نے بہت ہی خوش اسلوبی سے بنا ہے اور یہاں غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں تشریف لاتے ہیں اور اس کا جلسہ اس طرح ہوتا ہے جس طرح حالی کے یادگار غالب میں بیان کیا ہے۔وہ اپنے ہاتھ میں دیوان غالب کا ایک نسخہ بھی رکھتے ہیں اور غالب مجلس میں سب کے دعوت نامے کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔اور اس کے بعد جدید شعرا غالب سے جنت کا احوال پوچھتے ہیں۔اور جب جدید شعرا اقبال کے تعلق سے غالب سے پوچھتے ہیں تو غالب جواب دیتے ہیں کہ اقبال وہاں بھی وہی کرتا ہے جس طرح وہ دنیا میں کرتا تھا۔اور وہاں بھی اقبال خدا سے لڑتا جھگڑتا ہے۔وہی پرانی بحث:

مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

کنہیا لال کپور کو طنز و مزاح پیدا کرنے کا ہنر اچھی طرح آتا ہے۔انہوں نے اپنے مشاہدے اور تجربے سے طنز و مزاح کو نئے نئے پیرائے میں بیان کیا ہے۔کنہیا لال کپور کو اردو ادب سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔انہوں نے کلاسیکی اور جدید شاعری کا مطالعہ کیا تھا۔اسی لیے اردو شاعری کے فکر و فن پر ان کی گہری نظر تھی۔کنہیا لال کپور نے اپنے انشائیے ''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' ن۔م۔راشد، فیض احمد فیض، میرا جی، عبدالحی فگار کے حوالے سے پر مغز گفتگو کی ہے۔اس مجلس کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کی صدارت ن۔م۔راشد فرماتے ہیں اور تمام جدید شعرا کی پوری کہانی مکالمے کی صورت میں ڈراما کے انداز میں بیان کی گئی ہے۔کنہیا لال کپور کا یہ اسلوب بہت ہی دلچسپ ہے۔اس مجلس میں جدید شعرا غالب کو جدید شاعری کے فکر و فن سے آگاہ کرتے ہیں اور ان جدید شعرا کے مکالمے اور شاعری سے کنہیا لال کپور نے طنز و مزاح کے اچھے گل بوٹے سجائے ہیں اور دوسری بات یہ کہ انہوں نے غالب اور جدید شعرا کی شاعری میں پیروڈی کر کے اس انشائیہ کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔کنہیا لال کپور ہی غالب کی شاعری کی پیروڈی کر سکتے تھے اور اس انشائیہ میں کپور نے طنز و مزاح کو بام عروج پر پہونچا دیا ہے۔

کنہیا لال کپور کو مزاح پیدا کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔انہوں نے اپنے مشاہدے اور تجربے کا بھرپور استعمال کیا ہے۔کنہیا لال کپور نے انشائیہ ''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' کا آغاز دلچسپ پیرائے میں کیا ہے۔وہ انشائیے کے آغاز سے ہی قاری کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیتے ہیں۔اس انشائیہ کے آغاز کا پس منظر دیکھیں:

> ''دور جدید کے شعرا کی ایک مجلس میں مرزا غالبؔ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔اس مجلس میں تقریباً تمام جلیل القدر جدید شعرا تشریف فرما ہیں۔مثلاً م۔ن ارشدؔ، میرا جیؔ، ڈاکٹر قربان حسین خالصؔ، میاں رفیق احمد خوگر، راجہ مہدی علی خاںؔ، پروفیسر غیظ احمد غیظؔ، بکرماجیت ورما، عبدالحی نگاہؔ وغیرہ۔یکا یک مرزا غالبؔ داخل ہوتے ہیں ان کی شکل وصورت

بعینہ وہی ہے جو مولانا حالؔی نے ''یادگار غالب'' میں بیان کی ہے۔ان کے ہاتھ میں ''دیوان غالب'' کا ایک نسخہ ہے۔تمام شعرا کھڑے ہوکر آداب بجالاتے ہیں۔

غالبؔ:''حضرات! میں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے جنت میں دعوت نامہ بھیجا اور اس مجلس میں مدعو کیا۔میری مدت سے آرزو تھی کہ دور جدید کے شعرا سے شرف نیاز حاصل کروں۔''

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ کنہیالال کپور نے انشائیہ کا جو ابتدائی پس منظر بیان کیا ہے اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ قاری کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ یہ انشائیہ ان ہی لوگوں کے لیے ہے جو ادبی ذوق رکھتے ہیں اور وہی قاری اس کی تفہیم کرسکتا ہے جو اردو ادب سے واقف ہو۔انہوں نے اس انشائیہ میں جدید شاعری کی، ہیئت، اسلوب اور موضوع پر بحث کی ہے۔مزید براں جدید شاعری کے فکر وفن کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے۔انہوں نے پیروڈی کی وساطت سے جدید شاعری اور کلاسیکی شاعری کا ایک طرح سے موازنہ بھی کیا ہے۔

''م۔ن۔ارشد: معاف کیجئے گا۔مرزا، اس مجلس میں شمع وغیرہ کسی کے سامنے نہیں جائے گی۔شمع کی بجائے یہاں پچاس کینڈل پاور کا لیمپ ہے، اس کی روشنی میں ہر ایک شاعر اپنا کلام پڑھے گا۔

غالب: بہت اچھا صاحب تو غزل سنئے گا۔

باقی شعرا: ارشاد۔

غالب: عرض کیا ہے۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

(باقی شعرا ہنستے ہیں۔مرزا حیران ہوکر ان کی جانب دیکھتے ہیں)

غالب: جی صاحب یہ کیا حرکت ہے۔نہ داد نہ تحسین، اس بے موقع خندہ زنی کا مطلب؟

ایک شاعر: معاف کیجئے مرزا، ہمیں یہ شعر کچھ بے معنی سا معلوم ہوتا ہے۔

غالب: بے معنی؟

ہیرا جی: دیکھئے نا مرزا، آپ فرماتے ہیں ''خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ

ہو'' اگر مطلب کچھ نہیں تو خط لکھنے کا فائدہ ہی کیا۔''

اس انشائیہ میں پیروڈی کی وساطت سے جدید اور کلاسیکی شاعری کے فرق کو واضح کرنے کے ساتھ ان دونوں کے درمیان باہمی رشتے کو استوار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس میں فیض احمد فیض کی شاہکار نظم ''تنہائی'' کا تذکرہ فیض کو داد تحسین دینے کے لیے کیا گیا ہے۔ یہ اقتباس دیکھیے :

فون پھر آیا دل زار! نہیں فون نہیں
سائیکل ہو گا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات اترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرد چراغ
تھک گیا رات کو چلا کے ہر اک چوکیدار
گل کرو دامن افسردہ کے بوسیدہ داغ
یاد آتا ہے مجھے سر مہ دنبالہ وار
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو واپس لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

اس انشائیہ کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ کنہیالال کپور نے ایک طرف قاری کو طنز و مزاح کے ذریعہ اپنا گرویدہ بنالیا ہے تو دوسری طرف ایک نقاد کی طرح جدید شاعری بالخصوص راشد کی نظم دریچے کے قریب اور انتقام کے مرکزی خیال کی تحریف کر کے جدید شاعری کے موضوعات اور فنی اصول پر گہری ضرب لگائی ہے۔مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک دلچسپ انشائیہ ہے جس میں جدید شاعری کے فن اور اصول پر گہری نظر ڈالی گئی ہے۔کلاسیکی اور جدید شاعری کے موازنے کے باوجود انشائیہ کی ادبی اہمیت برقرار ہے۔ کپور کی خوبی یہ ہے کہ وہ جس بھی موضوع پر قلم اٹھاتے اس میں اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہیں۔انہوں نے اپنے تصوراتی خیال سے غالب کی آمد کو پیش کر کے اردو کے مزاح نگاروں کو چونکا دیا تھا۔ان کے انشائیے کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہنسی ہنسی میں اپنے ایک عظیم مقصد کو قاری کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔اس انشائیہ میں کپور کا انداز بیان مزاحیہ اور شگفتہ ہے۔وزیر آغا کپور کے طنزیہ انشائیے بالخصوص غالب جدید شعرا کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''سنگ و خشت میں غالب کو جدید شعرا کے دربار میں تصور کیجئے۔ وہاں کپور اپنے عروج پر ہے۔ دو چار طرف اینٹیں

پھینکتا ہے، کسی کا لحاظ نہیں کرتا، کسی سماجی سوزش، اخلاقی تقاضے سے متاثر نہیں ہوتا۔ بس ایک دربار ہے خس وخاشاک کو اپنے ساتھ لیے بہا چلا جاتا ہے۔''

(اودھ پنچ، بارہواں شمارہ، کنہیالال کپور نمبر، تیسرا دور، تیسرا سال، تیسرا شمارہ)

کنہیالال کپور کا یہ انشائیہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ انہوں نے اپنے اسلوب بیان اور انشا پردازی کا جوہر دکھایا ہے۔ یہ انشائیہ فکر وفن کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' میں شگفتگی وروانی پائی جاتی ہے۔ اور اس اہم موضوع کا انتخاب کرنا ان کے عالمانہ ذہنی، فکری بصیرت کا غماز ہے۔ ہمارے خیال میں کپور نے اس وسیع تجربے کو قاری کے سامنے پیش کیا ہے جس کی مثال اردو کے انشائیوں میں کم کم ملتی ہے۔ یہ انشائیہ اردو کے اہم انشائیوں میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب نظر آتا ہے۔ اس کی اہمیت اردو مزاحیہ ادب میں مسلم ہے۔

12.3.1 سرگرمی - صحیح یا غلط

عزیز طلبا وطالبات آیئے ایک لمحے کے لیے رکیں اب جبکہ آپ نے کنہیالال کپور کا تعارف، ان کے اہم انشائیے، ''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' کا تجزیہ کرلیا ہے تو نیچے دی گئی مشقیں کو حل کرنے کی کوشش کیجئے اور صحیح یا غلط کا نشان لگایئے۔

1۔ ''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' ن۔م۔ راشد کا تذکرہ ہے۔ ( )

2۔ ''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' میں جدید اور کلاسیکی شاعری کے فرق کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ ( )

3۔ ''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' میں علامہ اقبال کا ذکر آیا ہے۔ ( )

4۔ ''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' میں پیروڈی نہیں پائی جاتی ہے۔ ( )

5۔ کنہیالال کپور نے کبھی پیروڈی تحریر کی ہی نہیں ہے۔ ( )

12.4 عمومی جائزہ

کنہیالال کپور اردو کے اہم مزاح نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اردو مزاح نگاری کو فروغ دینے میں ان کا اہم کردار رہا ہے۔ ''غالب

جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے اس انشائیے کو پیروڈی کا جامہ پہنا کر اسے مزید دلچسپ بنا دیا ہے۔ کپور نے راشد کی نظم ''دریچے کے قریب'' اور ''انتقام'' کے مرکزی خیال کو تحریف کر کے جدید شاعری، اس کے موضوعات اور اس کے فنی اصول ومبادیات پر گہری چوٹ کی ہے۔ یہاں کنہیالال کپور کا طنزیہ لہجہ تلخ انداز میں سامنے آتا ہے جو عام قاری کی تفہیم سے بالاتر بھی ہے۔ کنہیالال کپور کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اس انشائیہ میں قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھا ہے اور قاری نہ صرف زیرلب مسکراتا ہے بلکہ جدید شاعری اور کلاسیکی شاعری کے موازنے سے بھی باعلم ہوتا ہے۔ کنہیالال کپور ایک تیر سے کئی نشانے لگاتے ہیں اور سب میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' اس کی روشن مثال ہے۔ یہ زبان وبیان اور شاعرانہ اسلوب اور مکالمہ نگاری کے حوالے سے بہت اہم انشائیہ ہے۔

12.5 فرہنگ

جلیل القدر	:	بڑے مرتبے والا، معزز
شرف	:	عزت، افتخار
فراغت	:	چھٹکارہ، نجات، فرصت
شمع	:	موم کی بتی
خندہ	:	ہنستا ہوا، خوش
جنوں	:	دیوانگی
نکما	:	ناکارہ، بے کار
رقص	:	ناچنا
تخیل	:	خیال کرنا
کشمکش	:	الجھن، مخمصہ
تعقل	:	سمجھنا، سوچنا، غور کرنا
تجسس	:	تلاش وجستجو

جدوجہد	:	کوشش کرنا
کوہ قاف	:	وہ جگہ جہاں آدمی کا گزر نہ ہو سکے
لغزشیں	:	غلطیاں
قصور	:	غلطی
قماش	:	ڈھنگ،قسم،نوع
سراسیمگی	:	پریشانی،اضطراب

12.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

طویل سوالات

1۔ اردو انشائیہ نگاری میں کنہیالال کپور کا مقام متعین کیجئے۔

2۔ ''غالب جدید شعرا کی مجلس میں'' کا تجزیہ لکھیے۔

3۔ اردو انشائیوں میں ''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' کی معنویت پر اظہار خیال کیجئے۔

4۔ ''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' کے اسلوب اور زبان و بیان سے بحث کیجئے۔

مختصر سوالات

1۔ کنہیالال کپور کی پیروڈی نگاری پر مختصر نوٹ لکھیے۔

2۔ کنہیالال کپور کے انشائیہ ''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' کا خلاصہ لکھیے۔

3۔ کنہیالال کپور کا انشائیہ ''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' لکھنے کا مقصد کیا تھا۔

4۔ کنہیالال کپور نے اپنے اس انشائیہ میں قدیم و جدید شاعری کا موازنہ کس طرح کیا ہے۔

12.7 مشقی سوالات

سوالات

1۔ ''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' کن کا انشائیہ ہے اور اس میں فیض کی کونسی نظم کی پیروڈی کی گئی ہے۔

2۔ ''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' غالب کے دو اشعار قلم بند کیجئے۔

3۔ ''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' سے پانچ شاعروں کا نام لکھئے۔

12.8 مشقی سوالات کے جوابات

1۔ ''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' کنہیالال کپور کا انشائیہ ہے۔اس میں فیض احمد فیض کی نظم ''تنہائی'' کی پیروڈی کی گئی ہے۔

2۔ ''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' غالب کے دو اشعار یہ ہیں:

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
عشق نے غالب نکما کردیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

3۔ ''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' سے پانچ شاعروں کے نام یہ ہیں: م۔ن ارشد، ہیرا جی، ڈاکٹر قربان حسین خالص، میاں رفیق احمد خوگر اور راجہ مہدعلی خاں۔

12.9 امدادی کُتب Books Prescribe

ا۔ انتخاب اُردو نثر) ۱۸۵۷ء ۱۹۲۰ء ایجوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ۔

۲۔ انتخاب اُردو نثر ۱۹۲۰ء کے بعد ای جوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ

Books Recommended.

ا۔ مختصر تاریخ ادب اُردو۔ڈاکٹر سید اعجاز حسین ترجمہ واضافے	ڈاکٹر سید محمد عقیل
۲۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح۔	ڈاکٹر وزیر آغا
۳۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح۔	غلام احمد فرقت کاکوروی

۴۔ رشید احمد صدیقی۔شخصیت اور فن۔	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
۵۔ اُردو انشائیہ۔	وزیر آغا
۶۔ انشائیہ کے فنی سروکار۔	ڈاکٹر احمد امتیاز
۷۔ انشائیہ کی بنیاد۔	ڈاکٹر سلیم اختر
۸۔ فنِ انشائیہ اور انشائیے۔	ڈاکٹر فرحت شمیم
۹۔ انشائیہ کے خدوخال	وزیر آغا
۱۰۔ انشائیہ کی بنیاد	ڈاکٹر سلیم اختر
۱۱۔ انشائیہ اردو ادب میں	ڈاکٹر انور سدید
۱۲۔ انشائیہ	ڈاکٹر آدم شیخ
۱۳۔ ڈپٹی نذیر احمد احوال و آثار	محمد اکرام چغتائی
۱۴۔ مولوی نذیر احمد احوال و آثار	ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی
۱۵۔ لکچروں کا مجموعہ (مرتبہ)	محمد نذیر حسین
۱۶۔ نذیر احمد	نور الحسن نقوی
۱۷۔ فکر و نظر (ڈپٹی نذیر احمد نمبر) علی گڑھ	
۱۸۔ خواجہ حسن نظامی: شخصیت اور ادبی خدمات	نثار احمد فاروقی
۱۹۔ خواجہ حسن نظامی کی نثر	ڈاکٹر مولا بخش
۲۰۔ خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری	سید محمد نیر رضوی
۲۱۔ خواجہ حسن نظامی کتاب نما	خصوصی شمارہ

سبق 13 تدریس متن ''جنون لطیفہ'' مشتاق احمد یوسفی

ساخت

13.0 اغراض ومقاصد

13.1 تعارف

13.2 مشتاق احمد یوسفی کی مختصر حالات زندگی

13.2.1 انشائیہ ''جنون لطیفہ'' کا متن

1.3.3 ''جنون لطیفہ'' کا تجزیاتی مطالعہ

13.3.1 سرگرمی- صحیح یا غلط

13.4 عمومی جائزہ

13.5 فرہنگ

13.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

13.7 مشقی سوالات

13.8 مشقی سوالات

13.9 امدادی کتب

13.0 اغراض ومقاصد

عزیز متعلّم اس سبق کے مطالعے کے بعد اس قابل ہو جائیں گے کہ

مشتاق احمد یوسفی کی حیات وادبی خدمات سے واقف ہوسکیں گے۔

مشتاق احمد یوسفی کے انشائیہ نگاری سے واقف ہوسکیں گے۔

مشتاق احمد یوسفی کے انشائیہ ''جنون لطیفہ'' کی تفہیم وتجزیہ کرسکیں گے۔

مشتاق احمد یوسفی کی مزاح نگاری کی خصوصیات سے واقف ہوسکیں گے۔

مشتاق احمد یوسفی کے اسلوب سے بھی واقف ہوسکیں گے۔

13.1 تعارف

مشتاق احمد یوسفی اردو کے مزاح نگاروں میں منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ان کا ادبی سفر ارتقائی رہا ہے۔انہوں نے اپنی پہلی تصنیف میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور اس کے بعد کی تصانیف میں انہوں نے فکری وفنی اعتبار سے طنز ومزاح میں ایک نئی روح پھونک دی اور اپنے معاصرین میں سبقت لے گئے۔مشتاق احمد یوسفی نے چار کتابیں قلم بند کر کے اردو طنز ومزاح کے میدان میں اپنی منفرد شناخت قائم کی۔ان کی تصانیف میں چراغ تلے، خاکم بدہن، زرگزشت اور آب گم ہیں۔ چراغ تلے اور خاکم بدہن ان کے انشائیوں کے مجموعے ہیں۔مشتاق یوسفی کے انشائیوں کے مطالعہ سے عیاں ہوتا ہے کہ اس میں سماج اور معاشرے کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔مصنف نے چراغ تلے کے انشائیوں میں قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھا ہے۔مشتاق یوسفی نے جو مقدمہ ''پہلا پتھر'' کے نام سے قلم بند کیا ہے اس میں انشائیے کی خوبی موجود ہے۔انہوں نے اس انشائیے میں اپنی بیوی کا تعارف کرنے کے ساتھ قاری کو مرزا عبداللہ بیگ کی شخصیت کا تعارف کرایا ہے اور یادش بخیر میں ناسٹلجیائی کیفیت سے دوچار لوگوں کو مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے۔ان کے مضامین میں طنز ومزاح کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔مقدمہ ''پہلا پتھر'' ان مصنّفین کے لیے ہے جو مقدمہ لکھتے نہیں لکھواتے ہیں، گویا دونوں کی حرکتوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ان کا ایک اہم انشائیہ ''جنون لطیفہ'' ہے جسکے تجزیے سے طلبا مستفیض ہوسکیں گے۔

13.2 مشتاق احمد یوسفی کی مختصر حالات زندگی

مشتاق احمد یوسفی کی پیدائش 4 ستمبر 1923 راجستھان میں ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں ہوئی۔آپ کے والد کا نام عبدالکریم خان یوسفی تھا اور وہ جے پور میں قانون ساز اسمبلی کے اسپیکر بھی مقرر ہوئے تھے۔مشتاق یوسفی جب اتنے معزز اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوئے اس مناسبت سے ان کی ابتدائی تعلیم بھی بہت اچھے طریقے سے ہوئی تھی۔وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے آگرہ کے بہت اہم کالج سینٹ جانس کالج سے فلسفہ میں ایم

اے کی ڈگری حاصل کی اور بعدۂ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور انہوں نے ہندوستان ہی میں پبلک سرویز کا امتحان بھی پاس کیا۔ 1950 میں مسلم کمرشیل بینک سے وابستہ ہوئے اور ڈپٹی جنرل منیجر کا عہدہ بھی سنبھالا۔ ہندوستان کی تاریخ میں تقسیم ہند کا سانحہ سب سے بڑا المیہ تھا جس نے ہندوستان کی عوام وخواص سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ یہ تقسیم دوقومی نظریے کے بنیاد پر ہوئی اور تقسیم سے سب سے زیادہ نقصان ہندوستان و پاکستان کے مہاجرین کو ہوا۔ مشتاق یوسفی بھی اس ہجرت کے المیے سے دوچار ہوئے وہ ہندوستان میں 1950 تک مقیم رہے لیکن انہوں نے بعد میں پاکستان منتقل ہونے کا فیصلہ کیا اور وہ پاکستان میں جا کر کراچی میں سکونت اختیار کی۔ لیکن وہ پاکستان میں بھی اپنا ذریعہ معاش کے لیے بینک ہی میں ملازمت کرنا پسند کیا۔ وہ پاکستان میں بھی متعدد اہم عہدوں پر فائز ہوئے۔ مینیجنگ ڈائرکٹر کا عہدہ بھی سنبھالا۔ 1975 میں یونائیٹیڈ بینک کے صدر اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ پاکستان بینکنگ کونسل صدر نشیں منتخب ہوئے تھے۔ اور تقریباً گیارہ برس وہ لندن میں بھی اپنی خدمات انجام دی ہیں۔ ان تمام ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے ساتھ وہ اردو کے ایک بہت اہم ادیب تھے۔ اردو ادب سے ان کو گہرا لگاؤ تھا۔ اور انہوں نے طنز ومزاح میں بہت شہرت حاصل کی۔ اردو کا مزاحیہ ادب آپ کے ذکر کے بغیر ادھورا رہے گا۔ ان کی تخلیقات اردو ادب کے لیے ایک گراں قدر سرمایہ ہیں۔ ان کی اولین کتاب ''چراغ تلے'' 1961 میں شائع ہوئی اور ان کی دیگر تخلیقات میں ''خاکم بدہن'' 1949، ''زرگزشت'' 1974، ''آب گم'' 1990، آخری کتاب ''شام شہر یاراں'' 2014 قابل ذکر ہیں۔ مشتاق یوسفی کا ادبی سفر ارتقائی رہا ہے۔ ان کی تمام تصانیف فکری وفنی اعتبار سے غیر معمولی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کی شخصیت کی طرح ان کی تصانیف بھی اعلیٰ پائے کی ہیں۔ مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو ادب میں وہ ایک گہری چھاپ چھوڑ کر 20 جون 2018 کو 94 برس کی عمر میں اس دور فانی سے رحلت کر گئے۔

13.2.1 انشائیہ ''جنون لطیفہ'' کا متن

بڑا مبارک ہوتا ہے وہ دن، جب کوئی نیا خانساماں گھر میں آئے اور اس سے بھی زیادہ مبارک وہ دن جب وہ چلا جائے! چونکہ ایسے مبارک دن سال میں کئی بار آتے ہیں اور تلخی کام ودہن کی آزمائش کر کے گزر جاتے ہیں۔ اس لیے اطمینان کا سانس لینا، بقول شاعر، صرف دو ہی موقعوں پر نصیب ہوتا ہے:

اک ترے آنے سے پہلے اک ترے جانے کے بعد

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بدذائقہ کھانا پکانے کا ہنر صرف تعلیم یافتہ بیگمات کو آتا ہے لیکن ہم اعداد وشمار سے ثابت کر سکتے ہیں کہ پیشہ

ورخانساماں اس فن میں کسی سے پیچھے نہیں۔اصل بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ اسے ہنسنا اور کھانا آتا ہے۔اسی وجہ سے پچھلے سو برس سے یہ فن کوئی ترقی نہیں کر سکے۔ایک دن ہم نے اپنے دوست مرزا عبدالودود بیگ سے شکایتاً کہا کہ اب وہ خانساماں جو ستر قسم کے پلاو پکا سکتے تھے، من حیث الجماعت رفتہ رفتہ ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔جواب میں انھوں نے بالکل الٹی بات کہی۔

کہنے لگے ''خانساماں وانساماں غائب نہیں ہو رہے بلکہ غائب ہو رہا ہے وہ ستر قسم کے پلاو کھانے والا طبقہ جو بٹلر اور خانساماں رکھتا تھا اور اڑد کی دال بھی ڈنر جیکٹ پہن کر کھاتا تھا۔اب اس وضعدار طبقے کے افراد باورچی نوکر رکھنے کے بجائے نکاح ثانی کر لیتے ہیں۔اس لیے کہ گیا گزرا باورچی بھی روٹی کپڑا اور تنخواہ مانگتا ہے۔جبکہ منکوحہ فقط روٹی کپڑے پر ہی راضی ہو جاتی ہے۔بلکہ اکثر و بیشتر کھانے اور پکانے کے برتن بھی ساتھ لاتی ہے۔''

مرزا اکثر کہتے ہیں کہ خود کام کرنا بہت آسان ہے مگر دوسروں سے کام لینا نہایت دشوار۔بالکل اسی طرح جیسے خود مرنے کے لیے کسی خاص قابلیت کی ضرورت نہیں پڑتی۔لیکن دوسروں کو مرنے پر آمادہ کرنا بڑا مشکل کام ہے۔معمولی سپاہی اور جرنیل میں یہی فرق ہے۔اب اسے ہماری سخت گیری کہیے یا نااہلی یا کچھ اور، کوئی خانساماں ایک ہفتے سے زیادہ نہیں ٹکتا۔ایسا بھی ہوا ہے کہ ہنڈیا اگر شبراتی نے چڑھائی تو بگھار رمضانی نے دیا اور دال بلاقی خاں نے بانٹی۔ممکن ہے مذکور الصدر حضرات اپنی صفائی میں یہ کہیں کہ،

ہم وفادار نہیں تُو بھی تو دل دار نہیں!

لہٰذا ہم تفصیلات سے احتراز کریں گے۔حالانکہ دل ضرور چاہتا ہے کہ ذرا تفصیل کے ساتھ من جملہ دیگر مشکلات کے اس سراسیمگی کو بیان کریں جو اس وقت محسوس ہوتی ہے جب ہم سے ازروئے حساب یہ دریافت کرنے کو کہا جائے کہ اگر نوکر کی 13 دن کی تنخواہ 30 روپے اور کھانا ہے، تو 9 گھنٹے کی تنخواہ بغیر کھانے کے کیا ہوگی؟ ایسے نازک مواقع پر ہم نے سوال کو آسان کرنے کی نیت سے اکثر یہ معقول تجویز پیش کی کہ اس کو پہلے کھانا کھلا دیا جائے۔لیکن اول تو وہ اس پر کسی طرح رضامند نہیں ہوتا۔دوم کھانا تیار ہونے میں ابھی پورا سوا گھنٹہ باقی ہے اور اس سے آپ کو اصولاً اتفاق ہوگا کہ 9 گھنٹے کی اجرت کا حساب 10-1/4 گھنٹے کے مقابلے میں پھر بھی آسان ہے۔

ہم داد کے خواہاں ہیں نہ انصاف کے طالب ___ کچھ تو اس اندیشے سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جن سے خستگی کی داد پانے کی توقع ہے وہ ہم سے زیادہ خستہ تیغ ستم نکلیں۔اور کچھ اس ڈر سے کہ:

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

مقصد سر دست ان خانساماؤں کا تعارف کرانا ہے جن کی دامے درمے خدمت کرنے کا شرف ہمیں حاصل ہو چکا ہے۔ اگر ہمارے لہجے میں کہیں تلخی کی جھلک آئے تو اسے تلخی کام و دہن پر محمول کرتے ہوئے، خانساماؤں کو معاف فرمائیں۔ خانساماں سے عہد وفا استوار کرنے اور اسے ہمیشہ کے لیے اپنا غلام بنانے کا ڈھنگ کوئی مرزا عبدالودود بیگ سے سیکھے۔ یوں تو ان کی صورت ہی ایسی ہے کہ ہر کس و ناکس کا بے اختیار نصیحت کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن ایک دن ہم نے دیکھا کہ ان کا دیرینہ باورچی بھی ان سے ادب تہذیب کر کے باتیں کر رہا ہے۔ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی، کیوں کہ شرفا میں انداز گفتگو محض مخلص دوستوں کی ساتھ روا ہے۔ جہلا سے ہمیشہ سنجیدہ گفتگو کی جاتی ہے۔ ہم نے مرزا کی توجہ اس امر کی طرف دلائی تو انھوں نے جواب دیا کہ میں نے جان بوجھ کر اس کو اتنا منہ زور اور بدتمیز کر دیا ہے کہ اب میرے گھر کے سوا اس کی کہیں اور گزر نہیں ہو سکتی۔

کچھ دن ہوئے ایک مڈل فیل خانساماں ملازمت کی تلاش میں آ نکلا اور آتے ہی ہمارا نام اور پیشہ پوچھا۔ پھر سابق خانساماوں کے پتے دریافت کیے۔ نیز یہ کہ آخری خانساماں نے ملازمت کیوں چھوڑی؟ باتوں باتوں میں انھوں نے یہ عندیہ بھی لینے کی کوشش کی کہ ہم ہفتے میں کتنی دفعہ باہر مدعو ہوتے ہیں اور باورچی خانے میں چینی کے برتنوں کے ٹوٹنے کی آواز سے ہمارے اعصاب اور اخلاق پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے۔ ایک شرط انھوں نے یہ بھی لگائی کہ اگر آپ گرمیوں کی چھٹیوں میں پہاڑ پر جائیں گے تو پہلے ''عوضی مالک'' پیش کرنا پڑے گا۔

کافی ردوکد کے بعد ہمیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ ہم میں وہی خوبیاں تلاش کر رہے ہیں جو ہم ان میں ڈھونڈ رہے تھے۔ یہ آنکھ مچولی ختم ہوئی اور کام کے اوقات کا سوال آیا تو ہم نے کہا کہ اصولاً ہمیں محنتی آدمی پسند ہیں۔ خود بیگم صاحبہ صبح پانچ بجے سے رات کے دس بجے تک گھر کے کام کاج میں جٹی رہتی ہیں۔ کہنے لگے، ''صاحب! ان کی بات چھوڑیئے۔ وہ گھر کی مالک ہیں۔ میں تو نوکر ہوں!'' ساتھ ہی ساتھ انھوں نے یہ وضاحت بھی کر دی کہ برتن نہیں مانجھوں گا۔ جھاڑو نہیں دوں گا۔ ایش ٹرے صاف نہیں کروں گا۔ میز نہیں لگاؤں گا۔ دعوتوں میں ہاتھ نہیں دھلاؤں گا۔

ہم نے گھبرا کر پوچھا ''پھر کیا کرو گے؟''

''یہ تو آپ بتایئے۔ کام آپ کو لینا ہے۔ میں تو تابع دار ہوں۔''

جب سب باتیں حسب منشاء ضرورت (ضرورت ہماری، منشا ان کی) طے ہو گئیں تو ہم نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ بھئی سودا سلف لانے کے لیے فی الحال کوئی علیحدہ نوکر نہیں ہے۔ اس لیے کچھ دن تمیں سودا بھی لانا پڑے گا۔ تنخواہ طے کر لو۔

فرمایا، ''جناب! تنخواہ کی فکر نہ کیجئے۔ پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ کم تنخواہ میں بھی خوش رہوں گا۔''

''پھر بھی؟''

کہنے لگے،''پچھتر روپے ماہوار ہوگی۔لیکن اگر سودا بھی مجھی کو لانا پڑا تو چالیس روپے ہوگی!''

ان کے بعد ایک ڈھنگ کا خانساماں آیا مگر بے حد دماغ دار معلوم ہوتا تھا۔ہم نے اس کا پانی اتارنے کی غرض سے پوچھا،''مغلئی اور انگریزی کھانے آتے ہیں؟''

''ہر قسم کا کھانا پکا سکتا ہوں۔حضور کا کس علاقے سے تعلق تھا؟''

ہم نے صحیح صحیح بتا دیا۔جھوم ہی تو گئے۔کہنے لگے،''میں بھی ایک سال ادھر کاٹ چکا ہوں۔وہاں کے باجرے کی کھچڑی کی تو دور دور دھوم ہے۔''مزید جرح کی ہم میں تاب نہ تھی۔لہٰذا انھوں نے اپنے آپ کو ہمارے ہاں ملازم رکھ لیا۔دوسرے دن پڈنگ بناتے ہوئے انھوں نے یہ انکشاف کیا کہ میں نے بارہ سال انگریزوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں،اس لیے بیٹھ کر چولہا نہیں جھونکوں گا۔مجبوراً کھڑے ہو کر پکانے کا چولہا بنوایا۔ان کے بعد جو خانساماں آیا،اس نے کہا کہ میں چپاتیاں بیٹھ کر پکاوں گا۔مگر برادے کی انگیٹھی پر۔چنانچہ لوہے کی انگیٹھی بنوائی۔تیسرے کے لیے چکنی مٹی کا چولھا بنوانا پڑا۔چوتھے کے مطالبے پر مٹی کے تیل سے جلنے والا چولھا خریدا۔اور پانچواں خانساماں اتنے سارے چولھے دیکھ کر ہی بھاگ گیا۔

اس ظالم کا نام یاد نہیں آ رہا۔البتہ صورت اور خدوخال اب تک یاد ہیں۔ابتدائے ملازمت سے ہم دیکھ رہے تھے کہ وہ اپنے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہیں کھاتا،بلکہ پابندی سے ملاگری ہوٹل میں اکڑوں بیٹھ کر دو پیسے کی چٹ پٹی دال اور ایک آنے کی تنوری روٹی کھاتا ہے۔آخر ایک دن ہم سے نہ رہا گیا اور ہم نے ذرا سختی سے ٹوکا کہ،''گھر کا کھانا کیوں نہیں کھاتے؟''

تنک کر بولا،''صاحب!ہاتھ بیچا ہے،زبان نہیں بیچی!''

اس نے نہایت مختصر مگر غیر مبہم الفاظ میں یہ واضح کر دیا کہ اگر اسے اپنے ہاتھ کا پکا کھانا کھانے پر مجبور کیا گیا تو وہ فوراً استعفیٰ دے دے گا۔اس کے رویے سے ہمیں بھی شبہ ہونے لگا کہ وہ واقعی خراب کھانا پکاتا ہے۔نیز ہم اس منطقی نتیجے پر پہنچے کہ دوزخ میں گنہگار عورتوں کو ان کے اپنے پکائے ہوئے سالن زبردستی کھلائے جائیں گے۔اسی طرح ریڈیو والوں کو فرشتے آتشیں گرز مار مار کر بار بار ان ہی کے نشر کیے ہوئے پروگراموں کے ریکارڈ سنائیں گے۔

ہم کھانے کے شوقین ہیں،خوشامد کے بھوکے نہیں (گو کہ اس سے انکار نہیں کہ اپنی تعریف سن کر ہمیں بھی اپنا بنیان تنگ معلوم ہونے

لگتا ہے)۔ہم نے کبھی یہ توقع نہیں کی کہ باورچی کھانا پکانے کے بجائے ہمارے گن گاتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ چوبیس گھنٹے اپنے مرحوم اور سابق آقاؤں کا کلمہ پڑھتا رہے۔ جب کہ اس توصیف کا اصل مقصد ہمیں جلانا اور ان خوبیوں کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے جو ہم میں نہیں ہیں۔ اکثر اوقات بے تحاشا جی چاہتا ہے کہ کاش ہم بھی مرحوم ہوتے تاکہ ہمارا ذکر بھی اتنے ہی پیار سے ہوتا۔ بعض نہایت قابل خانساماں کو محض اس دوراندیشی کی بنا پر علیٰحدہ کرنا پڑا کہ آئندہ وہ کسی اور کا نمک کھا کر ہمارے حق میں پروپیگنڈہ کرتے رہیں۔ جو شخص بھی آتا ہے یہی دعوی کرتا ہے کہ اس کے سابق آقا نے اسے سیاہ وسفید کا مالک بنا رکھا تھا (یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ اصولی طور پر ہم خود بھی ہمیشہ دوسروں پر بھروسہ کرتے ہیں لیکن ریزگاری ضرور گن لیتے ہیں)۔ایک خانساماں نے ہمیں مطلع کیا کہ اس کا پچھلا ''صاب'' اس قدر شریف آدمی تھا کہ ٹھیک سے گالی تک نہیں دے سکتا تھا۔

ہم نے جل کر کہا، ''پھر تم نے نوکری کیوں چھوڑی؟''

تڑپ کر بولے، ''کون کہتا ہے کہ خدا بخش نے نوکری چھوڑی؟ قصہ دراصل یہ ہے کہ میری پانچ مہینے کی تنخواہ چڑھ گئی تھی اور اب آپ سے کیا پردہ؟ سچ تو یہ کہ ان کے گھر کا خرچ بھی میں ردی اخبار اور بیئر کی خالی بوتلیں بیچ کر چلا رہا تھا۔ انھوں نے کبھی حساب نہیں مانگا۔ پھر انھوں نے ایک دن میری صورت دیکھ کر کہا کہ 'خدا بخش! تم بہت تھک گئے ہو۔ دو دن کی چھٹی کرو اور اپنی صحت بناؤ۔' دو دن بعد جب میں صحت بنا کر لوٹا تو گھر خالی پایا۔ پڑوسیوں نے بتایا کہ ''تمھارا صاب تو پرسوں ہی سارا سامان باندھ کر کہیں اور چلا گیا۔'' یہ قصہ سنانے کے بعد اس نمک حلال نے ہم سے پیشگی تنخواہ مانگی تاکہ اپنے سابق آقا کے مکان کا کرایہ ادا کر سکے۔ گزشتہ سال ہمارے حال پر رحم کھا کر ایک کرم فرما نے ایک تجربہ کار خانساماں بھیجا۔ جو ہر علاقے کے کھانے پکانا جانتا تھا۔ ہم نے کہا، ''بھئی اور تو سب ٹھیک ہے مگر تم سات مہینے میں دس ملازمتیں چھوڑ چکے ہو۔ یہ کیا بات ہے؟''

کہنے لگے، ''صاب! آج کل وفادار مالک کہاں ملتا ہے؟''

اس ستم ایجاد کی بدولت برصغیر کے ہر خطے بلکہ ہر تحصیل کے کھانے کی خوبیاں اس ہیچمداں پنبہ دہاں کے دسترخوان پر سمٹ کر آ گئیں۔ مثلاً دوپہر کے کھانے پر دیکھا کہ شوربے میں مسلم کیری ہچکولے لے رہی ہے اور سالن اس قدر ترش ہے کہ آنکھیں بند ہو جائیں اور اگر بند ہوں تو پٹ سے کھل جائیں۔ پوچھا تو انھوں نے آگاہی بخشی کہ دکن میں روسا کھٹا سالن کھاتے ہیں۔ اور ہم یہ سوچتے ہی رہ گئے کہ اللہ جانے بقیہ لوگ کیا کھاتے ہوں گے۔

اسی دن شام کو ہم نے گھبرا کر پوچھا کہ دال میں پرانے جوتوں کی بو کیوں آ رہی ہے؟ جواب میں انھوں نے ایک دھواں دھار تقریر کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ مارواڑی سیٹھوں کے پھلنے پھولنے اور پھیلنے کا راز ہینگ میں مضمر ہے۔ اور دوسرے دن جب ہم نے دریافت کیا کہ بندہ خدا یہ چپاتی ہے یا دسترخوان؟ تو ہنس کر بولے کہ وطن مالوف میں روٹی کے حدود اربعہ یہی ہوتے ہیں۔

آخر کئی فاقوں کے بعد ایک دن ہم نے بہ نظر حوصلہ افزائی کہا،

''آج تم نے چاولوں کا اچار بہت اچھا بنایا ہے۔''

دہکتے ہوئے توے سے بیڑی سلگاتے ہوئے بولے، ''بندہ پروری ہے! کاٹھیاواڑی پلاو میں قورمے کے مسالے پڑتے ہیں!''

''خوب! مگر یہ قورمے کا مزہ تو نہیں!''

''وہاں قورمے میں اچار کا مسالہ ڈالتے ہیں!''

پھر ایک دن شام کے کھانے پر مرزا نے ناک سکیڑ کر کہا، ''میاں! کیا کھیر میں کھٹملوں کا بگھار دیا ہے؟''

سفید دیوار پر کوئلے سے سودے کا حساب لکھتے ہوئے حقارت سے بولے، ''آپ کو معلوم نہیں؟ شاہان اودھ لگی ہوئی فیرنی کھاتے تھے؟''

''مگر تم نے دیکھا کیا انجام ہوا اودھ کی سلطنت کا؟''

مختصر یہ کہ ڈیڑھ مہینے تک وہ صبح و شام ہمارے ناپختہ ذوق و ذائقہ کو سنوارتا اور مشروبات و ماکولات سے وسیع المشربی کا درس دیتا رہا۔ آخر آخر میں مرزا کو شبہ ہو چلا تھا کہ وہ غیر ملکی ایجنٹ ہے جو سالن کے ذریعے صوبائی غلط فہمیاں پھیلا رہا ہے۔ اگر آپ کو کوئی کھانا بے حد مرغوب ہے جو چھڑائے نہیں چھوٹتا تو تازہ واردان بساط خانساماں اس مشکل کو فوراً آسان کر دیں گے۔ اشیائے خوردنی اور انسانی معدے کے ساتھ بھرپور تجربے کرنے کی جو آزادی باورچیوں کو حاصل ہے وہ نت نئی کیمیاوی ایجادات کی ضامن ہے۔ مثال کے طور پر ہمیں بھنڈی بہت پسند ہے لیکن دس گھنٹے قبل یہ منکشف ہوا کہ اس نبات تازہ کو ایک خاص درجہ حرارت پر پانی کی مقررہ مقدار میں (جس کا علم صرف ہمارے خانساماں کو ہے) میٹھی آنچ پر پکایا جائے تو اس مرکب سے دفتروں میں لفافے اور بدلگام افسروں کے منہ ہمیشہ کے لیے بند کیے جا سکتے ہیں۔

انہی حضرت نے گزشتہ جمعرات کو سارا گھر سر پر اٹھا رکھا تھا۔ ہم نے بچی کو بھیجا کہ اس سے کہو کہ مہمان بیٹھے ہیں۔ اس وقت سل کھوٹنے کی ضرورت نہیں۔ اس نے کہلا بھیجا کہ ہم ان ہی مہمانوں کی تواضع کے لیے سل پر کبابوں کا قیمہ پیس رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے کباب منہ میں رکھا تو محسوس ہوا گویا چٹ پٹا ریگ مال کھا رہے ہیں اور ہمیں رہ رہ کر میر صاحب پر رشک آنے لگا کہ وہ مصنوعی بتیسی لگائے بے خبر بیٹھے

کھا رہے تھے اور ہماری طرح کرکرا محسوس کر کے لال پیلے نہیں ہوئے۔ صبح تک سب کو پیچش ہوگئی۔ صرف ہمیں نہیں ہوئی۔ اور ہمیں اس لیے نہیں ہوئی کہ ہم پہلے ہی اس میں مبتلا تھے۔

یہ بات نہیں کہ خدانخواستہ ہم بیماری اور موت سے ڈرتے ہیں۔ ہم تو پرانی چال کے آدمی ہیں۔ اس لیے نئی زندگی سے زیادہ خوف کھاتے ہیں۔ موت برحق ہے اور ایک نہ ایک دن ضرور آئے گی۔ بات صرف اتنی ہے کہ بلانے کے لیے ہم اپنی نیک کمائی میں سے پچاس ساٹھ روپے ماہوار خرچ نہیں کرنا چاہتے۔ ہمیں کسی مرض ناشناس حکیم کے ہاتھوں مرنے پر بھی چنداں اعتراض نہ ہوگا۔ لیکن ہم کسی صورت خانساماں کو بالاقساط روح قبض کرنے کا اختیار نہیں دینے چاہتے کہ یہ صرف حکیم ڈاکٹروں کا حق ہے۔

بیماری کا ذکر چل نکلا تو اس قوی ہیکل خانساماں کا قصہ بھی سن لیجئے جس کو ہم سب آغا کہا کرتے تھے (آغا اس لیے کہا کرتے تھے کہ وہ سچ مچ آغا تھے۔) ان کا خیال آتے ہی معدے میں مہتابیاں سی جل اٹھتی ہیں۔ تادم وداع ان کے کھانا پکانے، اور کھلانے کا انداز وہی رہا جو ملازمت سے پہلے ہینگ بیچنے کا ہوتا تھا۔ یعنی ڈرا دھمکا کر اس کی خوبیاں منوا لیتے تھے۔ بالعموم صبح ناشتے کے بعد سو کر اٹھتے تھے۔ کچھ دن ہم نے صبح تڑکے جگانے کی کوشش کی لیکن جب انھوں نے نیند کی آڑ میں ہاتھا پائی کرنے کی کوشش کی تو ہم نے بھی ان کی اصلاح کا خیال ترک کر دیا۔ اس سے قطع نظر، وہ کافی تابعدار تھے۔ تابعدار سے ہماری مراد یہ ہے کہ کبھی وہ پوچھتے کہ 'چائے لاؤں؟'، اور ہم تکلفاً کہتے کہ 'جی چاہے تو لے آو ورنہ نہیں۔' تو کبھی واقعی لے آتے اور کبھی نہیں بھی لاتے تھے۔ جس دن سے انھوں نے باورچی خانہ سنبھالا گھر میں حکیم ڈاکٹروں کی ریل پیل ہونے لگی۔ یوں بھی ان کا پکایا ہوا کھانا دیکھ کر سر (اپنا) پیٹنے کو جی چاہتا تھا۔ ''اپنا'' اس لیے کہ حالانکہ ہم سب ہی ان کے کھانوں سے عاجز تھے، لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان کو کیوں کر پرامن طریق سے رخصت کیا جائے۔ ان کو نوکر رکھنا ایسا ہی ثابت ہوا جیسے کہ شیر ببر پر سوار ہو تو جائے لیکن اترنے کی ہمت نہ رکھتا ہو۔

ایک دن ہم اسی ادھیڑ بن میں لیٹے ہوئے گرم پانی کی بوتل سے پیٹ سینک رہے تھے اور دوا پی پی کر ان کو کوس رہے تھے کہ سر جھکائے آئے اور خلاف معمول ہاتھ جوڑ کر بولے، ''خو! صاب! تم روز روز بیمار اوتا اے۔ اس سے امارا قبیلہ میں بڑا رسوائی، خو، خانہ خراب اوتا اے''، (صاحب! تم بار بار بیمار ہوتے ہو۔ اس سے ہمارے قبیلے میں ہماری رسوائی ہوتی ہے اور ہمارا خانہ خراب ہوتا ہے۔) اس کے بعد انھوں نے کہا سنا معاف کرایا، اور بغیر تنخواہ لیے چل دیئے۔

ایسی ہی ایک اور دعوت کا ذکر ہے جس میں چند احباب اور افسران بالا دست مدعو تھے۔ نئے خانساماں نے جو قورمہ پکایا، اس میں

شوربے کا یہ عالم تھا کہ ناک پکڑ کے غوطے لگائیں تو شاید کوئی بوٹی ہاتھ آ جائے۔ اکا دکا کہیں نظر آ بھی جاتی تو کچھ اس طرح کہ،

صاف چھپتی بھی نہیں سامنے آتی بھی نہیں

اور بسا غنیمت تھا کیوں کہ مہمان کے منہ میں پہنچنے کے بعد، غالب کے الفاظ میں، یہ کیفیت تھی کہ،

کھینچتا ہے جس قدر اتنی ہی کھنچتی جائے ہے!

دوران ضیافت احباب نے بکمال سنجیدگی مشورہ دیا کہ ''ریفریجریٹر خرید لو۔ روز روز کی جھک جھک سے نجات مل جائی گی۔ بس ایک دن لذیذ کھانا پکوالو۔ اور ہفتے بھر ٹھاٹ سے کھاؤ اور کھلاؤ۔'' قسطوں پر ریفریجریٹر خریدنے کے بعد ہمیں واقعی بڑا فرق محسوس ہوا۔ اور وہ فرق یہ ہے کہ پہلے جو بدمزہ کھانا صرف ایک ہی وقت کھاتے تھے، اب اسے ہفتے بھر کھانا پڑتا ہے۔

ہم نے اس عذاب مسلسل کی شکایت کی تو وہی احباب تلقین فرمانے لگے کہ،

''جب خرچ کیا ہے صبر بھی کر، اس میں تو یہی کچھ ہوتا ہے۔''

کل پھر مرزا سے اپنی گوناگوں مشکلات کا ذکر کیا تو کہنے لگے:

''یہ الجھنیں آپ نے اپنے چٹور پن سے خواہ مخواہ پیدا کر رکھی ہیں۔ ورنہ سادہ غذا اور اعلیٰ خیالات سے یہ مسئلہ کبھی کا خود بخود حل ہو گیا ہوتا۔ یہی آئین قدرت ہے اور یہی آزاد تہذیب کی اساس بھی! آپ نے مولوی اسماعیل میرٹھی کا وہ پاکیزہ شعر نہیں پڑھا؟

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر

تو وہ خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر

عرض کیا، ''مجھے کسی کے آزاد رہنے پر، خواہ شاعر ہی کیوں نہ ہو، کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن اس شعر پر مجھے عرصہ سے یہ اعتراض ہے کہ اس میں آزادی سے زیادہ خشک روٹی کی تعریف کی گئی ہے۔ ممکن ہے عمدہ غذا اعلیٰ تہذیب کو جنم نہ دے سکے، لیکن اعلیٰ تہذیب کبھی خراب غذا برداشت نہیں کر سکتی''

فرمایا، ''برداشت کی ایک ہی رہی! خراب کھانا کھا کر بدمزہ نہ ہونا، یہی شرافت کی دلیل ہے۔''

گزارش کی، ''مردانگی تو یہ کہ آدمی عرصہ تک عمدہ غذا کھائے اور شرافت کے جامے سے باہر نہ ہو!''

مشتعل ہو گئے، ''بجا! لیکن یہ کہاں کی شرافت ہے کہ آدمی اٹھتے بیٹھتے کھانے کا ذکر کرتا رہے۔ برا نہ مانئے گا۔ آپ کے بعض مضامین کسی بگڑے ہوئے شاہی رکابدار کی خاندانی بیاض معلوم ہوتے ہیں۔ جبھی تو کم پڑھی لکھی عورتیں بڑے شوق سے پڑھتی ہیں۔''

ہم نے ٹوکا، ''آپ بھول رہے ہیں کہ فرانس میں کھانا کھانے اور پکانے کا شمار فنون لطیفہ میں ہوتا ہے۔''

وہ بگڑ گئے، ''مگر آپ نے تو اسے جنون لطیفہ کا درجہ دے رکھا ہے۔ اگر آپ واقعی اپنی بے قصور قوم کی اصلاح کے درپے ہیں تو کوئی کام کی بات کیجئے اور ترقی کی راہیں سجھایئے۔'' مزہ لینے کی خاطر چھیڑا، ''ایک دفعہ قوم کو اچھا پہننے اور کھانے کا چسکا لگ گیا تو ترقی کی راہیں خود بخود سوجھ جائیں گی۔ گاندھی جی کا قول ہے کہ جس دیس میں لاکھوں آدمیوں کو دو وقت کا کھانا نصیب نہ ہوتا ہو، وہاں بھگوان کی بھی ہمت نہیں ہوتی کہ ان داتا کے سوا کسی اور روپ میں سامنے آسکے۔ بھوکے کے لیے بھوجن ہی بھگوان کا اوتار ہے اور۔۔۔''

قطع کلامی کی معافی مانگے بغیر بولے، ''مگر وہ تو بکری کا دودھ اور کھجور کھاتے تھے اور آپ فن غذا شناسی کو فلسفہ خدا شناسی سمجھ بیٹھے ہیں۔ خود آپ کے محبوب یونانی فلسفی جو بھرپور زندگی کے قائل تھے، دماغ سے محسوس کرتے اور دل سے سوچتے تھے۔ مگر آپ تو معدے سے سوچتے ہیں اور دیکھا جائے تو آپ آج بھی وہی مشورہ دے رہے ہیں جو ملکہ میری انطونیت نے دیا تھا۔ ایک درباری نے جب اس کے گوش گزار کیا کہ روٹی نہ ملنے کے سبب ہزاروں انسان پیرس کی گلیوں میں دم توڑ رہے ہیں تو اس نے حیرت سے پوچھا کہ یہ احمق کیک کیوں نہیں کھاتے؟''

13.3 ''جنون لطیفہ'' کا تجزیاتی مطالعہ

اردو انشائیہ نگاری میں مشتاق احمد یوسفی کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے اردو ادب میں طنز و مزاح کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی چار کتابیں چراغ تلے، خاکم بدہن، زرگزشت اور آب گم کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کی اولین تصنیف ''چراغ تلے'' میں 12 انشائیے شامل ہیں اور یہ تمام انشائیے قاری کو صرف دعوت فکر نہیں دیتے بلکہ انہیں بار بار پڑھنے پر اکساتے بھی ہیں۔ اس کتاب میں شامل انشائیے پڑیے گر بیمار، کافی، یادش بخیر، موذی، سند، جنون لطیفہ، چارپائی اور کلچر، اور آنا گھر میں مرغیوں کا، کرکٹ، صنف لاغر، موسموں کا شہر اور کاغذی پیرہن متعدد موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ انشائیہ نگار نے متعدد موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور اپنے منفرد مزاحیہ اسلوب سے قاری کو زیر لب مسکرانے پر مجبور بھی کیا ہے۔ ''چراغ تلے'' میں شامل انشائیہ ''جنون لطیفہ'' بہت ہی اہم انشائیہ ہے۔ اس کے موضوعات ہماری زندگی میں روزمرہ پیش آنے والے واقعات سے ہیں۔ یوسفی نے خانساماؤں یعنی گھر میں کھانے پکانے والے کو موضوع بنایا ہے اور اس انشائیہ میں گھر میں کھانا پکانے والے خانساماؤں کے حرکات و سکنات نیز ان کے رویے اور اخلاق پر بے باکی سے اظہار کیا گیا ہے اور گھر کے مالک کا اپنے خانساماؤں کے تعلق سے جو رویہ ہے اسے مشفقانہ دکھانے کی سعی کی گئی ہے اور کھانسماؤں کا بدمزہ کھانا پکانا اور خود نہ کھانا اس امر

کی طرف بلیغ اشارہ ہے کہ وہ اپنے کام کے تئیں ایماندار نہیں ہیں۔انشائیہ کا آغاز ہی دلچسپ پیرائے میں کیا گیا ہے:

''بڑا مبارک ہوتا ہے وہ دن، جب کوئی نیا خانساماں گھر میں آئے اور اس سے بھی زیادہ مبارک وہ دن جب وہ چلا جائے! چونکہ ایسے مبارک دن سال میں کئی بار آتے ہیں اور تلخی کام ودہن کی آزمائش کر کے گزر جاتے ہیں۔اس لیے اطمینان کا سانس لینا، بقول شاعر، صرف دو ہی موقعوں پر نصیب ہوتا ہے:

اک ترے آنے سے پہلے اک ترے جانے کے بعد

مندرجہ بالا اقتباس سے یوسفی صاحب اس انشائیہ کا آغاز کرتے ہیں اور آغاز ہی میں قاری کو یہ احساس دلانے میں کامیاب نظر آتے ہیں کہ کوئی بھی خانساماں اپنا فرض منصبی ادا نہیں کرتا ہے۔مصنف نے اپنے تجربے کی بنیاد پر اس تلخ حقیقت کو بیان کیا ہے کہ جب کوئی نیا خانساماں آتا ہے تو دل سے ان کو بڑی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں لیکن چند دنوں کے بعد اس کے چلے جانے سے مزید مسرت حاصل ہوتی ہے۔مشتاق یوسفی جنون لطیفہ کے آغاز ہی سے قاری کی توجہ کو نہ صرف مبذول کرتے ہیں بلکہ اس کو اپنا مطمح نظر واضح کر دیتے ہیں۔ان کا یہ مزاحیہ طریقہ اچھا تو ہے لیکن قاری کو آغاز ہی میں انشائیہ کی تھیم واضح ہو جاتی ہے جو ایک اچھے انشائیہ نگار کی خوبی نہیں ہے۔اچھا انشائیہ نگار ابتدا سے آخر تک قاری کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔اس انشائیہ کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ انشائیہ نگار نے خانساماؤں کے پکائے گئے بدمزہ کھانے کو اس کی بدمزگی کا اظہار ظریفانہ اسلوب میں مختلف پیرائے میں کیا ہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

''خانساماؤں نے جو قورمہ پکایا، اس میں شوربے کا یہ عالم تھا کہ ناک پکڑ کر غوطے لگائیں تو شاید کوئی بوٹی ہاتھ آجائے۔اکا دکا کہیں نظر آ بھی جاتی تو کچھ اس طرح کہ، صاف چھپتی بھی نہیں سامنے آتی بھی نہیں''

جنون لطیفہ کی خوبی یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے قاری کو زبان اور کھانے کے چٹخارے دونوں کا لطف آتا ہے اور قاری کو احساس ہوتا ہے کہ کھانا بدمزہ سہی لیکن انشائیہ نگار کی بیانیہ قابل تعریف ہے۔کھانا بدمزہ ہونے کے باوجود قاری کے لیے ذائقہ دار ہے۔اس انشائیہ میں مشتاق یوسفی نے مرزا عبدالودود کے کردار کو شامل کرتے ہوئے اسے مزید دلچسپ بنا دیا ہے اور مرزا عبدالودود بیگ کا نظریہ مصنف کے نظریے سے قدرے مختلف ہے۔وہ اپنے وقار کا خیال انتقاماً نہیں کرتا ہے۔وہ خانساماؤں کے نازیبا حرکات کا بدلہ اپنی خاموشی سے لیتا ہے۔مشتاق یوسفی کو کردار نگاری میں کمال حاصل ہے۔انہوں نے اس انشائیے میں مزاح پیدا کرنے کے لیے ایک کردار آغا کو بھی گڑھ لیا ہے اور آغا کی کردار نگاری کے بیان میں طنز وظرافت کی حدیں پار کرتے نظر آتے ہیں۔انہوں نے لکھا ہے کہ:

''بیماری کا ذکر چل نکلا تو اس قوی ہیکل خانساماں کا قصہ بھی سن لیجئے جس کو ہم سب آغا کہا کرتے تھے (آغا اس لیے کہا کرتے تھے کہ وہ سچ مچ آغا تھے۔) ان کا خیال آتے ہی معدے میں مہتابیاں سی جل اٹھتی ہیں۔ تادم وداع ان کے کھانا پکانے، اور کھلانے کا انداز وہی رہا جو ملازمت سے پہلے ہینگ بیچنے کا ہوتا تھا۔ یعنی ڈرا دھمکا کر اس کی خوبیاں منوا لیتے تھے۔''

مشتاق یوسفی نے جنون لطیفہ میں جس موضوع کا انتخاب کیا ہے وہ بہت دلچسپ بھی ہے اور قاری کو اپیل بھی کرتا ہے۔ اس میں موضوعات کا تنوع بھی ہے۔ بات صرف خانساماؤں تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کی وساطت سے انہوں نے کھانے بنانے کے عادت واطوار اور ان کے رہن سہن مزید براں اس انشائیہ میں اس حقیقت کا بھی انکشاف ہے کہ خانساماؤں کا طرہ امتیاز کیا ہوتا ہے اور یہ انشائیہ ان کو زیادہ پسند آتا ہے جو خانساماؤں کے رکھنے کے تجربے حاصل کر چکے ہیں۔ اور یہ عام سی بات ہے لیکن انشائیہ نگار نے اس انشائیہ میں سکے کے ایک ہی پہلو کو پیش کر کے قاری کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔ یوسفی نے طنز ومزاح کا سہارا لے کر اس انشائیہ کو معنویت بخشی ہے اور یہ انشائیہ عصری مسائل کا عکاس ہے اور جنون لطیفہ طنز ومزاح کی ایک اعلیٰ مثال ہے اور اس کی وساطت سے یوسفی نے باورچی رکھنے کے تجربے کو بیان کیا ہے اور اس انشائیہ کے مطالعہ سے مصنف نے ریفریجریٹر رکھنے کے بعد یہ فرق محسوس کیا کہ وہ بدمزہ کھانا ایک وقت کھاتا تھا اب اسے ایک ہفتے کھانے پڑتے ہیں۔ یوسفی کی بالغ نظری نے ایک چھوٹے موضوع میں بلا کا تنوع پیدا کیا ہے اور بات سے بات نکالنے کا ہنر انہیں آتا ہے۔ انہوں نے اس انشائیہ میں مرزا عبدالودود کا کردار خلق کر کے اس کو مزید دلچسپ بنادیا۔ مرزا صاحب کو طنز کا نشانہ بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خانساماں سے عہد وفا استوار کرنے اور اسے ہمیشہ کے لیے اپنا غلام بنانے کا ڈھنگ کوئی مرزا عبدالودود سے پوچھے۔''

اس انشائیہ میں مشتاق یوسفی نے اشعار کے انتخاب سے مزاح میں روح پھونک دی ہے برجستہ اشعار کا استعمال مشتاق یوسفی کو آتا ہے۔ یوسفی کے اس انشائیے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں فلسفے کی آمیزش نہیں ہے اس کے باوجود موضوع کو خشک ہونے نہیں دیا ہے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور اس انشائیے میں بہت سے جملے فصیح وبلیغ اور پرمغز ہیں۔ اس میں ادراک وعرفان، سچائی ودانائی کی باتیں ہیں۔ جنون لطیفہ کا تجزیہ کرتے ہوئے جن اقتباسات کو پیش کیا گیا ہے اس سے ان کے فکری وفنی محاسن کا پتا چلتا ہے۔ مزید براں ان کے اسلوب کے نمایاں جلوہ گری ان کے اس انشائیہ میں موجود ہے اور یہ ہی مشتاق یوسفی کی مزاح نگاری کی اہم پہچان ہے۔

13.3.1 سرگرمی ۔آؤاپنی پیش رفت جانچیں

عزیز طلبا وطالبات آیئے ایک لمحے کے لیے رکیں اب جبکہ آپ نے مشتاق یوسفی کے سوانحی کوائف اوران کا انشائیہ ''جنون لطیفہ'' اوراس کے تجزیے کا مطالعہ کرلیا تو نیچے دی گئی مشق کو حل کرنے کی کوشش کیجئے اور صحیح یا غلط کا نشان لگایئے۔

1۔ جنون لطیفہ میں یوسفی نے مرزا عبدالودود بیگ کا کردار بھی قلم بند کیا ہے۔ ( )

2۔ جنون لطیفہ میں ایک خانساماں کا نام ''آغا'' بھی ہے۔ ( )

3۔ جنون لطیفہ کا موضوع تقسیم ہند ہے۔ ( )

4۔ جنون لطیفہ کنہیالال کپور کا انشائیہ ہے۔ ( )

5۔ جنون لطیفہ انشائیوں کے مجموعہ ''چراغ تلے'' میں شامل ہے۔ ( )

13.4 عمومی جائزہ

مشتاق یوسفی کی اردو انشائیہ نگاری ان کے معاصرین سے قدر مختلف بھی ہے اور دلچسپ بھی ہے۔ان کے یہاں موضوعات کا صرف تنوع نہیں پایا جاتا ہے بلکہ اسلوب کے اعتبار سے بھی ان کی جداگانہ اہمیت ہے۔انشائیہ ''جنون لطیفہ'' اوران کی اولین تصنیف ''چراغ تلے'' میں شامل ہے۔اس مجموعے میں 12 انشائیے ہیں لیکن ''جنون لطیفہ'' اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس میں مصنف نے گھریلو زندگی کے احوال کو خانساماں کی وساطت سے بیان کیا ہے اور کھانا پکانا مڈل کلاس میں معیوب مانا جاتا ہے اس لیے باورچی کی ضرورت ہوتی ہے اور باورچی اور مالک سے عام طور پر رشتے اچھے ہی ہوتے ہیں۔یوسفی نے ہمارے خیال میں اپنے تلخ تجربے کو ''جنون لطیفہ'' کے حوالے سے پیش کیا ہے اور جس گھر میں خانساماں نہیں ہوتا ہو اس میں صرف خانساماں کی غلطی نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کا ذمہ دار کسی حد تک مالک بھی ہوتا ہے۔یوسفی کی خوبی یہ ہے کہ وہ سکے کے ایک رخ کو اتنی چابکدستی سے بیان کیا ہے کہ عام قاری کو یہ احساس ہی نہیں ہوتا ہے کہ اس میں راوی کی بھی ذمہ داری ہے۔ بہرحال یہ انشائیہ ہے اس میں یوسفی نے خانساماں کے پکائے گئے کھانے کی بدمزگی کو اس طرح پیش کیا ہے کہ اس انشائیہ کا قاری اسے چٹخارے لیکر پڑھتا ہے۔

زبان و بیان اور اسلوب کے اعتبار سے ''جنون لطیفہ'' بہت ہی اہم انشائیہ ہے۔ یوسفی کی مزاح کی خوبی یہ ہے کہ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے اس میں اپنی انفرادیت قائم کرتے ہیں اور قاری کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ اس انشائیہ کے مطالعہ سے ہمارے طلبا و طالبات یوسفی کی مزاح نگاری کی خصوصیات اور ان کے اسلوب بیان اور لفظیات سے واقف ہو سکیں گے۔

13.5 فرہنگ

خانساماں	:	کھانا پکانے والا، خدمت گار
تلخی	:	کڑواہٹ، شدت
بدذائقہ	:	بدمزہ
احتراز	:	پرہیز کرنا، بچنا
خستگی	:	شکستگی، شکستہ جان
تابع	:	ماتحت، پابند
انگیٹھی	:	آگ رکھ کر کھانا پکانے والا ایک ظرف ہے
ظالم	:	ظلم کرنے والا
مبہم	:	غیر واضح، مشکوک
خوش الحان	:	اچھی آواز والا
برصغیر	:	کسی براعظم کے بڑے ٹکڑے کا مجموعہ جس میں یکسانیت پائی جاتی ہو۔
وطن مالوف	:	وہ جگہ جس سے الفت ہو، پیارا وطن
مرغوب	:	پسندیدہ، مزیدار، لذیذ
مصنوعی	:	غیر حقیقی، مشین کا تیار کردہ
ہیکل	:	شکل و صورت، نقشہ، ڈھانچہ

شناس	:	جاننے والا، پہچاننے والا
جنون	:	دیوانہ پن، دیوانگی

13.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

طویل سوالات

1۔ مشتاق احمد یوسفی کے سوانحی کوائف پر اظہار خیال کیجئے۔

2۔ مشتاق احمد یوسفی کی انشائیہ نگاری سے بحث کیجئے۔

3۔ مشتاق احمد یوسفی کے انشائیہ ''جنون لطیفہ'' کا تجزیہ پیش کیجئے۔

4۔ اردو انشائیوں میں ''جنون لطیفہ'' کی معنویت بیان کیجئے۔

مختصر سوالات

1۔ انشائیہ ''جنون لطیفہ'' کا خلاصہ پیش کیجئے۔

2۔ ''جنون لطیفہ'' کے دو کرداروں سے بحث کیجئے۔

3۔ ''جنون لطیفہ'' کے زبان و بیان اور اسلوب سے بحث کیجئے۔

4۔ ''جنون لطیفہ'' کے حوالے سے مشتاق احمد یوسفی کی انشائیہ نگاری کی معنویت بیان کیجئے۔

13.7 مشقی سوالات

1۔ ''جنون لطیفہ'' مشتاق احمد یوسفی کی کس کتاب میں شامل ہے۔ اس میں کل کتنے انشائیے ہیں۔ پانچ انشائیوں کے نام لکھئے۔

2۔ ''جنون لطیفہ'' کا موضوع کیا ہے؟ اظہار خیال کیجئے۔

3۔ ''جنون لطیفہ'' کے دو اہم کرداروں کے نام لکھئے اور خانساماؤں کے تعلق سے ایک اقتباس پیش کریں۔

13.8 مشقی سوالات کے جوابات

1۔ ''جنون لطیفہ'' مشتاق احمد یوسفی کی تصنیف ''چراغ تلے'' میں شامل ہے۔اس میں کل تیرہ انشائیے شامل ہیں۔ پانچ انشائیوں کے نام یہ ہیں: موسموں کا شہر، کاغذی ہے پیرہن، کرکٹ، یادش بخیر یا اور پڑیے گر بیمار۔

2۔ ''جنون لطیفہ'' کا موضوع ایک مڈل کلاس انسان کی خانساماؤں کے رکھنے کے تجربے کو بیان کرتا ہے جس میں خانساماں بدمزہ کھانے بناتے ہیں اور کھانا اتنا بدمزہ ہوتا ہے کہ وہ خود اس کو کھانا پسند نہیں کرتے ہیں اور مالک کو اسی طرح کا کھانا پکا کے کھلاتے ہیں اور اکثر خانساماں کی آمد پر مالک خوش ہوتا ہے لیکن کچھ دنوں کے بعد اس کے جانے کی خوشی کا اظہار بھی کرتا ہے۔

3۔ ''جنون لطیفہ'' میں مختلف کردار ہیں جن میں دو اہم کردار آغا اور مرزا عبدالودود بیگ کا ہے۔خانساماؤں کے تعلق سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

ان کے بعد جو خانساماں آیا، اس نے کہا کہ میں چپاتیاں بیٹھ کر پکاوں گا۔مگر برادے کی انگیٹھی پر۔ چنانچہ لوہے کی انگیٹھی بنوائی۔ تیسرے کے لیے چکنی مٹی کا چولھا بنوانا پڑا۔ چوتھے کے مطالبے پر مٹی کے تیل سے جلنے والا چولھا خریدا۔اور پانچواں خانساماں اتنے سارے چولھے دیکھ کر ہی بھاگ گیا۔اس ظالم کا نام یاد نہیں آرہا۔البتہ صورت اور خدوخال اب تک یاد ہیں۔ابتدائے ملازمت سے ہم دیکھ رہے تھے کہ وہ اپنے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہیں کھاتا، بلکہ پابندی سے ملاگری ہوٹل میں اکڑوں بیٹھ کر دو پیسے کی چٹ پٹی دال اور ایک آنے کی تنوری روٹی کھاتا ہے۔ آخر ایک دن ہم سے نہ رہا گیا اور ہم نے ذرا سختی سے ٹوکا کہ ''گھر کا کھانا کیوں نہیں کھاتے؟''

تنک کر بولا ''صاحب! ہاتھ بیچا ہے، زبان نہیں بیچی!''

13.9 امدادی کتب Books Prescribe

امدادی کُتب Books Prescribed.

۱۔ انتخاب اُردو نثر) ۱۹۲۰ء ۱۸۷۵ء ایجوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ۔

۲۔ انتخاب اُردو نثر ۱۹۲۰ء کے بعد ای جوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ

Books Recommended.

۱۔ مختصر تاریخ ادب اُردو۔ڈاکٹر سید اعجاز حسین ترجمہ واضافے ڈاکٹر سید محمد عقیل

۲۔	اُردو ادب میں طنز و مزاح۔	ڈاکٹر وزیر آغا
۳۔	اُردو ادب میں طنز و مزاح۔	غلام احمد فرقت کاکوروی
۴۔	رشید احمد صدیقی۔ شخصیت اور فن۔	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
۵۔	اُردو انشائیہ۔	وزیر آغا
۶۔	انشائیہ کے فنی سروکار۔	ڈاکٹر احمد امتیاز
۷۔	انشائیہ کی بنیاد۔	ڈاکٹر سلیم اختر
۸۔	فنِ انشائیہ اور انشائیے۔	ڈاکٹر فرحت شمیم
۹۔	انشائیہ کے خدوخال	وزیر آغا
۱۰۔	انشائیہ کی بنیاد	ڈاکٹر سلیم اختر
۱۱۔	انشائیہ اردو ادب میں	ڈاکٹر انور سدید
۱۲۔	انشائیہ	ڈاکٹر آدم شیخ
۱۳۔	ڈپٹی نذیر احمد احوال و آثار	محمد اکرام چغتائی
۱۴۔	مولوی نذیر احمد احوال و آثار	ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی
۱۵۔	لکچروں کا مجموعہ (مرتبہ)	محمد نذیر حسین
۱۶۔	نذیر احمد	نور الحسن نقوی
۱۷۔	فکر و نظر (ڈپٹی نذیر احمد نمبر) علی گڑھ	
۱۸۔	خواجہ حسن نظامی: شخصیت اور ادبی خدمات	نثار احمد فاروقی
۱۹۔	خواجہ حسن نظامی کی نثر	ڈاکٹر مولا بخش
۲۰۔	خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری	سید محمد نیر رضوی
۲۱۔	خواجہ حسن نظامی کتاب نما	خصوصی شمارہ

سبق نمبر 14 تدریس متن ''اردو کا آخری قاری'' - مجتبیٰ حسین

ساخت

14.0 اغراض ومقاصد

14.1 تعارف

14.2 مجتبیٰ حسین کی مختصر حالات زندگی

14.2.1 انشائیہ ''اردو کا آخری قاری'' کا متن

14.3 ''اردو کا آخری قاری'' کا تجزیاتی مطالعہ

14.3.1 سرگرمی- صحیح یا غلط

14.4 عمومی جائزہ

14.5 فرہنگ

14.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

14.7 مشقی سوالات

14.8 مشقی سوالات کے جوابات

14.9 امدادی کتب

14.1 اغراض ومقاصد

عزیز متعلّم اس سبق کے مطالعے کے بعد اس قابل ہو جائیں گے کہ

مجتبیٰ حسین کی حیات وادبی خدمات سے واقف ہوسکیں گے۔

مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری سے واقف ہوسکیں گے۔

مجتبیٰ حسین کی انشائیہ نگاری کی خصوصیات سے واقف ہوسکیں گے۔

مجتبیٰ حسین کے انشائیہ ''اردو کا آخری قاری'' کی تفہیم وتجزیہ کرسکیں گے۔

اردو مزاح نگاری میں مجتبیٰ حسین کا مقام کیا ہے اس سے بھی واقف ہوسکیں گے۔

14.2 تعارف

مجتبیٰ حسین نے طنز ومزاح کی دنیا میں اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے۔مجتبیٰ حسین اردو انشائیہ نگاری کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔اردو مزاح نگاری میں ان کے کارناموں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔مجتبیٰ حسین مزاح کے فن سے اچھی طرح واقف تھے۔وہ ایک اچھے کالم نویس بھی تھے اور اچھے سفرنامہ نگار بھی تھے اور اچھے خاکہ نگار بھی تھے۔انہوں نے اپنی تحریروں میں طنز ومزاح کے عناصر کو شامل کرکے اسے مزید دلچسپ بنادیا ہے۔مجتبیٰ حسین کی تخلیقات ان کی انشا پردازی کا بین ثبوت ہیں۔انہوں نے اسی موضوع پر قلم اٹھایا جو وقت کا تقاضا تھا۔اور ان کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ موضوع ان ہی کے اسلوب کا متقاضی ہے۔مجتبیٰ حسین کو زبان وبیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ان کے بیان میں جو ڈرامائیت ہے ان کے اسلوب کا خاصہ ہے۔ان کے مزاحیہ مضامین قاری کو بار بار پڑھنے پر اکساتے ہیں۔مجتبیٰ حسین اپنے عہد کے مزاح نگاروں میں الگ پہچان رکھتے ہیں۔اس سبق میں مجتبیٰ حسین کے انشائیہ ''اردو کا آخری قاری'' پر سیر حاصل گفتگو کرنے کی کوشش کی جائے گی تاکہ طلبہ وطالبات کو مجتبیٰ حسین کے فکر وفن کی گہری واقفیت ہوسکے۔

14.2.1 مجتبیٰ حسین کی مختصر حالات زندگی

مجتبیٰ حسین کا وطن عزیز گلبرگہ تھا اور ان کے آبا واجداد عثمان آباد کے تھے۔ان کے والد کا نام احمد حسن تھا۔آپ کی ولادت 15 جولائی 1936 میں ہوئی لیکن کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ ان کی سرٹیفیکٹ کے مطابق 15 جولائی 1933 ہے۔ابتدائی تعلیم اپنے والد کے زیر نگرانی پوری کی اور اس کے بعد چوتھی جماعت میں گلبرگہ کے مدرسہ تحمامتیہ آصف گنج میں داخلہ ملا۔اس کے علاوہ عثمان آباد میں بھی کچھ عرصہ زیر تعلیم رہے۔انہوں نے انٹرمیڈیٹ گلبرگہ کے ایک کالج سے 1953 میں اور گریجویشن عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد سے 1956 میں پورا کیا۔ان کے آٹھ بھائی تھے، محمد حسین

جگر، عابد حسین، ابراہیم جلیس، یوسف حسین، اقبال حسین، محمود حسین، خورشید حسین، سرتاج حسین۔ آپ کی شادی 11 نومبر 1956 خاتون ناصرہ ایک صاحبہ سے ہوئی جو رشتے میں چچازاد بہن تھیں۔ مجتبیٰ حسین نے ملازمت کا آغاز روزنامہ ''سیاست'' سے کیا۔ اس کے بعد وہ 1962 سے لیکر 1972 تک محکمہ اطلاعات وتعلقات سے وابستہ رہے۔ علاوہ بریں شعبۂ ریسرچ گجرال کمیٹی دہلی سے بھی منسلک رہے۔ NCERT سے 1973 سے 1991 تک وابستہ رہے اور جب ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو وہ ''سیاست'' میں مستقل طور پر لکھنے لگے۔

مجتبیٰ حسین کو ادبی خدمات کے اعتراف میں متعدد انعامات واعزازات سے نوازا بھی گیا جن اعزازات میں سے ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ، نشان امتیاز (بزم ساز وادب، دہلی)، غالب ایوارڈ، کل ہند مخدوم ادبی ایوارڈ، میر تقی میر ایوارڈ (امریکی فیڈریشن آف مسلمس آف انڈیا آریجن)، پدم شری (حکومت ہند)، ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری (گلبرگہ یونیورسٹی) علاوہ بریں بہت سے اعزازات وانعامات سے نوازا گیا۔ عمر کے آخری پڑاؤ تک وہ ''سیاست'' حیدرآباد میں اپنا کالم تحریر کرتے رہے۔ اور انہوں نے تقریباً 83 سال کی عمر میں اردو ادب میں گراں قدر سرمایہ چھوڑ کر مئی 2020 کو اس دار فانی سے کوچ کیا۔

14.2.1 انشائیہ ''اردو کا آخری قاری'' کا متن

پھر یوں ہوا کہ 2000 عیسوی گزر گئی تو لوگوں نے بیسویں صدی سے صاف بچ کر نکل جانے اور اکیسویں صدی میں داخل ہونے کی خوشی بہت دھوم دھام سے منائی۔ اردو کے شاعر اور ادیب بھلا اس خوشی میں کیسے شریک نہ ہوتے، وہ تو خوشی منانے کے معاملہ میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ دوسرے کی بھی شادی ہو تو ایک عدد سہرا لکھ کر اس کی خوشی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ہم نے اردو زبان کے سوائے کسی اور زبان کے شاعر کو دوسرے کی شادی پر اس قدر والہانہ انداز میں خوش ہوتے نہیں دیکھا۔ ہمارا ایمان ہے کہ شادیوں میں اتنی آمد نہیں ہوتی جتنی کہ سہروں میں ہوتی ہے۔ شادیاں اتنی فی البدیہہ نہیں ہوتیں جتنے کہ سہرے فی البدیہہ ہوتے ہیں۔ شادی تو خیر پھر بھی شادی ہے، آدمی میں ظرف ہو تو وہ دوسرے کی شادی پر بھی خوش سکتا ہے مگر ہم نے بعض باکمال شاعروں کو دوسروں کے بچوں کی بسم اللہ پر شعر وسخن کے دریا بہاتے دیکھا ہے۔ ادب کا ایسا بے جا مصرف کسی اور زبان میں دیکھنے کو نہیں ملا۔ غرض اردو کے شاعروں اور ادیبوں نے بھی اکیسویں صدی کے خیر مقدم کے لیے بے پناہ نظمیں کہیں اور ایک دوسرے کو لہک لہک کر سنائیں۔ مگر ایک منچلے شاعر نے اردو ادیبوں اور شاعروں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اکیسویں صدی کی آمد کی خوشی ہمیں اپنے قارئین کے سامنے منانی چاہیے۔ بات معقول تھی مگر نہایت نامعقول وقت پر کہی گئی تھی اردو کے شاعر اور ادیب پہلے تو بغلیں جھانکنے لگے

کیونکہ اردو محاورے کے مطابق جھانکنے کے لیے بغل سے زیادہ کوئی موزوں جگہ نہیں ہوتی، بغلوں میں قاری نہ ملا تو بولے ''یہ کون سی بڑی بات ہے، ہم جب اردو میں ادب عالیہ کی تخلیق کر رہے ہیں تو ہمارا کوئی قاری بھی ہوگا، کہیں نہ کہیں کوئی ہمارا کلام بھی پڑھتا ہوگا، ہم اپنے قاری کو جلد ہی تلاش کر لیں گے۔''

پھر ہر ادیب و شاعر نے اپنے اپنے علاقے میں قاری کی تلاش شروع کر دی۔

ایک راہ گیر سے پوچھا: ''کیوں بھئی! کیا آپ اردو کے قاری ہیں؟''

راہ گیر بولا: ''یہ قاری کیا چیز ہوتی ہے جی؟''

''بھئی پاٹھک، پاٹھک کو قاری کہتے ہیں یعنی پڑھنے والا۔''

راہ گیر بولا ''اوہ، آئی سی۔ آپ کون سی صدی کی بات کر رہے ہیں، سنتے ہیں کہ بیسویں صدی میں اردو نام کی کوئی زبان بھی تھی، میرے دادا اُس زبان کے شاعر تھے۔ اپنا غیر مطبوعہ کلام میرے والد کو سونپ گئے تھے کہ بیٹا اس کلام کو محفوظ رکھنا، میں نے اس میں اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے، یہ کلیجہ پچھلے برس تک میرے پاس تھا، پھر میری بیوی نے اسے ردی والے کے ہاتھوں فروخت کر دیا اور اس طرح میرے دادا جان مرحوم کے کلام کی رائلٹی حاصل کر لی، چند دن اور گزر جاتے تو اُسے دیمک چاٹ جاتی اور یہ رائلٹی بھی نہ ملتی۔''

پھر ایک چور سے پوچھا ''کیوں بھئی! کیا تم اردو پڑھتے ہو؟''

چور بولا ''اردو شریفوں کی زبان رہی ہے۔ اس سے ہمارا کیا تعلق۔ یوں بھی اردو کے ذریعہ تالے توڑے جا سکتے ہیں اور نہ ہی نقب لگایا جا سکتا ہے۔''

ایک تاجر سے پوچھا: ''لالہ جی کیا آپ اردو پڑھتے ہیں؟''

تاجر بولا: ''دیکھو جی! ہم بزنس میں ہیں، کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتے، ہم تو صرف منافع کی زبان جانتے ہیں۔ اردو پڑھنے سے اگر ہمیں چار پیسے کا منافع بھی ہوتا تو ہم اسے ضرور پڑھتے۔''

ایک اور شخص سے پوچھا: ''کیوں جناب! کیا آپ اردو جانتے ہیں؟''

وہ بولا ''میں تو نہیں جانتا البتہ میرے گھر میں ایک طوطا ہے جو بہت اچھی اردو جانتا ہے۔ آپ میرے گھر آئیں تو کہے گا''۔ مہربانی، آداب عرض ہے، تشریف لائیے، زہے نصیب۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

''اچھا تو آپ کا طوطا سخن فہم بھی ہے، کیا یہ شعر اسے آپ نے سکھایا ہے؟''

وہ شخص بولا: ''میں کیا جانوں کہ شعر کیا ہوتا ہے۔ اصل میں میرے دادا کے پاس ایک طوطا تھا جسے مذکورہ بالا اردو آتی تھی۔ اس کے بعد ہمارے گھر میں جتنے طوطے آئے وہ اردو سیکھتے گئے، طوطوں کے پاس یہ اردو نسلاً بعد نسل آئی ہے۔''

''آپ نے اردو کیوں نہیں سیکھی؟''

''میں پرندوں کی بولیاں سیکھنے کو ضروری نہیں سمجھتا۔''

ایک اور شخص سے پوچھا ''کیا آپ اردو جانتے ہیں؟''

وہ بولا ''میں اردو سیکھنا تو چاہتا تھا مگر مجھے معلوم ہوا کہ اردو بڑی میٹھی زبان ہے اور مجھے شوگر کی بیماری ہے۔ ڈاکٹروں نے میٹھی چیزوں سے پرہیز بتایا ہے، اس لیے اردو سے دور رہتا ہوں۔''

عام لوگوں سے مایوس ہو کر اردو کے شاعر اور ادیب اردو کے ایک مرحوم نقاد کے بیٹے کے پاس گئے اور کہنے گئے:

''بھئی تمہارے والد بزرگوار تو اردو کے پروفیسر اور نقاد تھے۔ وہ اردو کی بقا کے لیے ایک انجمن بھی چلاتے تھے، تم اردو ضرور جانتے ہو گے۔''

نقاد کے بیٹے نے کہا، ''بھیا! کیوں میرے والد کی روح کو تکلیف پہنچاتے ہو وہ اردو کے نقاد تھے ضرور مگر صرف اس لیے اردو کے نقاد تھے کہ انہیں کوئی دوسری زبان نہیں آتی تھی ورنہ کون اس زبان میں تنقید لکھتا۔ رہی اردو کی بقا کے لئے انجمن چلانے کی بات تو بھیا پیٹ بڑا بدکار ہے، شرافت کی زندگی گزارنے کے لیے آدمی کو بہت سے دھندے کرنے پڑتے ہیں۔ میرے والد نے صرف انجمن چلائی تھی کسی کی جیب تو نہیں کاٹی تھی۔ اگر وہ انجمن نہ چلاتے تو میری تین بہنوں کی شادیاں اس قدر دھوم دھام سے کون کرتا۔''

نقاد کے بیٹے سے پوچھا گیا ''کیا تمہارے والد مرحوم نے تمہیں اردو نہیں سکھائی تھی۔؟''

جواب ملا ''میرے والد دوسروں کے لڑکوں کو اردو ضرور پڑھایا کرتے تھے لیکن ذرا سوچیے وہ خود اپنی اولاد کے ساتھ ایسی زیادتی کیونکر کر سکتے تھے۔ اسی اردو سے بچنے کے لیے تو انہوں نے مجھے انگلینڈ بھیجا تھا۔ میرے والد بڑے دور اندیش آدمی تھے اردو کی خدمت اس ڈھنگ سے کرتے تھے کہ بھلے ہی اردو تباہ ہو جائے لیکن خاندان پر کوئی آنچ نہ آئے۔ نتیجہ میں آج ہمارا خاندان دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے، اور

اردو کا حشر دیکھیے کیا ہو چکا ہے۔''

چراغ تلے اندھیرے کو دیکھ کر ادیب پریشان ہو گئے۔ انہوں نے فوراً ایک میٹنگ بلائی تا کہ اس نازک صورت حال پر غور کیا جائے۔ جلسے کے صدر نے گلوگیر آواز میں کہا:

''بھائیو! آج ہم ایک عجیب وغریب صورت حال سے دوچار ہیں، ہمارے پاس ساز تو ہے پر آواز نہیں، آگ تو ہے مگر دھواں نہیں، پھول تو ہے مگر خوشبو نہیں، ہوا تو ہے مگر طوفان نہیں، سمندر تو ہے مگر قطرہ نہیں، دل تو ہے مگر دھڑکن نہیں، غم تو ہے مگر آہ نہیں.....''

اس پر کسی نے پکار کر کہا ''قبلہ، یہ شاعری تو ہے مگر تقریر نہیں، صاف صاف بتائیے کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

صدرِ جلسہ نے کہا ''بھائیو! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم برسوں سے شعر کہہ رہے ہیں اور آج ہمیں پتہ چل رہا ہے کہ ہمارے کلام بلاغت نظام کو پڑھنے والا کوئی نہیں، ہم برسوں سے ایک دوسرے کو کلام سنا کر خوش ہو رہے ہیں، ہمیں وہ قاری چاہیے جو خود شاعر یا ادیب نہ ہو، ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی زبانوں کے پاس قاری موجود ہیں لیکن قاری نہیں ہے تو صرف اردو کے پاس، ہمیں فوراً اپنے قاری کو تلاش کرنا چاہیے۔''

اس پر ایک ادیب نے تجویز پیش کی ''ہمیں فوراً حکومت سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ ہمارے شعر وافسانے پڑھنے کے لئے چند اردو قاریوں کا تقرر کر دے، ان قاریوں پر یہ ذمہ داری عاید کی جائے کہ وہ روزانہ پابندی سے دفتر آئیں اور آٹھ گھنٹے ہماری شاعری اور افسانوں کا مطالعہ کریں۔ یوں بھی ادھر کئی برسوں سے ہم اردو کے معاملہ میں حکومت کی طرف دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں، اردو اکیڈیمیوں کی امداد سے ہم کتابیں چھاپتے رہے ہیں۔ ان کتابوں پر انعام لیتے رہے ہیں۔ جب حکومت نے ان کتابوں کی اشاعت کا بندوبست کا ہی ہے تو حکومت کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ان کتابوں کو پڑھنے کے لیے قاریوں کا انتظام بھی کرے۔ اگر حکومت ہمارے مطالبہ کو تسلیم نہیں کرتی تو ہم اس کے خلاف نظمیں کہیں گے، افسانے لکھیں گے اور حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔''

ایک شاعر نے کہا: ''بھائیو! اب ہماری اینٹ صرف محاورے میں ہی بچ سکتی ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنے طور پر قاری کو تلاش کرنا چاہیئے۔ سرکاری قاری ہمارے ادب کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے گا۔ وہ ہمارے ادب کو بھی دفتر کی فائل بنا دے گا۔''

بہت غور وفکر کے بعد یہ طے ہوا کہ اردو قاری کی تلاش کے لئے ہندی اور انگریزی اخباروں میں اشتہار دیئے جائیں۔ اردو جریدوں میں اشتہار دینے کا سوال اس لیے پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ان کو صرف شاعر اور ادیب ہی پڑھتے تھے۔ چنانچہ دوسرے دن ہی اخباروں میں اشتہار چھپا:

''اردو کے قاری تم کہاں ہو؟''

ہم اردو کے شاعر اور ادیب اس بات سے بہت دکھی ہیں کہ تم ہم سے روٹھ کر چلے گئے ہو، اگر چہ ہمیں پتہ نہیں کہ تم کب روٹھ کر چلے گئے، ہم شعر وشاعری میں اس قدر مصروف رہے کہ تمہارے جانے کا احساس بھی نہیں ہوا۔ بھلے آدمی کوئی اس طرح روٹھ کر چلا جاتا ہے، جانے سے پہلے بتا تو دیا ہوتا، یوں چوروں کی طرح جانے کی کیا ضرورت تھی۔ چاہے کچھ بھی ہو ہم تمہارے جانے سے بہت دکھی ہیں۔ کھانا تو ہم پہلے بھی نہیں کھاتے تھے تمہارے غم میں ادھر ایک ہفتہ سے کسی شاعر نے ایک شعر بھی نہیں کہا ہے۔ تم اس اشتہار کو دیکھتے ہی فوراً چلے آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے۔ تمہیں کچھ بھی نہیں کہا جائے گا۔ اگر واپسی کا کرایہ نہ ہو تو ہمیں لکھ بھیجو، ہم اردو اکیڈمی کی طرف سے تمہارے لئے واپسی کا کرایہ بھیج دیں گے، پیسے کی فکر نہ کرو۔ اکیڈیمی کے بجٹ کی بڑی رقم ہر سال لیپس (Lapse) ہو جاتی ہے۔ تم اردو ادب کی آبرو ہو، تم اردو کی آخری شمع ہو، تم اردو کی مانگ کا سیندور ہو۔

نوٹ: اگر کوئی شخص اردو قاری کا پتہ بتائے تو اسے اردو اکیڈیمی کی طرف سے منہ مانگا انعام دیا جائے گا اور اردو ادب کی اس عظیم خدمت کے صلے میں اس کا نام اردو ادب کی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ یوں بھی اردو ادب کی تاریخ لکھنے کے لیے ہمارے پاس سنہری روشنائی کا ہی استعمال کیا جاتا ہے۔''

اشتہار چھپنے کے بعد کئی دنوں تک نہ قاری آیا اور نہ ہی کوئی اطلاع آئی، البتہ ۱۵ دن بعد ایک منجر کا خط انڈمان سے آیا کہ اردو کا ایک قاری یہاں موجود ہے، خبردار کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے، اس بات کو راز میں رکھا جائے۔ اگر اسے پہلے سے معلوم ہو جائے کہ آپ حضرات اسے لینے کے لیے آرہے ہیں تو وہ بھاگ جائے گا۔ اب وہ بڑی خوشحال زندگی گزار رہا ہے۔ کیونکہ اب وہ اردو نہیں پڑھتا، میں اس پر نظر رکھتا ہوں اور ہاں آتے ہوئے میرا وہ انعام بھی لیتے آیئے جو آپ کے اشتہار کے مطابق منہ مانگا ہوگا پہلے آپ اپنے قاری کو دیکھ لیں اور اس کے بعد مجھے انعام دیں۔''

اس اطلاع کا ملنا تھا کہ اردو ادیبوں اور شاعروں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، خوشی کی لہر کیسے نہ دوڑتی، آخر انہیں ان کا قاری جو مل گیا تھا۔ شاعروں نے اپنی غزلوں کو مانجھنا اور افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کو چمکانا شروع کر دیا۔

طے یہ کیا گیا کہ اردو شاعروں اور ادیبوں کا ایک وفد چپکے سے انڈمان جائے اور اپنے قاری کو سمجھا بجھا کر لے آئے۔ چنانچہ ایک رات اردو کے کچھ ادیب وشاعر اپنی پیٹھوں پر اردو کے عصری ادب کو لادے جزیرۂ انڈمان کی دھرتی پر اُتر گئے۔ منجر پہلے سے ان کا انتظار کر رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں وفد کے ارکان دبے پاؤں اردو کے آخری قاری کے گھر پہنچے۔ وہ اپنے گھر میں میٹھی نیند سو رہا تھا۔

منجر نے کہا: ''بھائیو! اس مکان کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لو آپ کا قاری اور میرا انعام بچ کر نہ جانے پائے۔''

شاعروں اور ادیبوں نے قاری کے گھر کے دروازے کے آگے عصری ادب کو اس طرح رکھ دیا کہ قاری اپنے گھر سے باہر نہ نکلنے پائے۔ صبح ہوئی تو قاری نے دیکھا کہ وہ اردو ادیبوں اور اردو ادب کے نرغے میں آچکا ہے۔

اس نے اندر سے پکار کر کہا ''تم لوگ کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟''

وفد کے لیڈر نے کہا ''اے اردو کے آخری قاری! ہم اردو کے ادیب اور شاعر ہیں۔ ہم بڑی دور سے تمہاری چوکھٹ پر آئے ہیں۔''

قاری نے پکار کر کہا: ''اردو کے شاعرو اور ادیبو! مجھے معلوم تھا کہ ایک دن تم میرے پاس ضرور آؤ گے مگر پہلے میرے دروازے کے سامنے سے اردو ادب کو تو ہٹاؤ تا کہ میں باہر آسکوں۔''

اردو ادب کو ہٹایا گیا تو قاری دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ اس کے آنے کی دیر تھی کہ ایک شاعر نے لپک کر سلام عرض کیا اور کہا ''حضور توجہ چاہتا ہوں، مطلع عرض کیا ہے.....

قاری پھر گھر کے اندر بھاگ گیا اور بولا ''بھائیو! میں ادب کے اس اچانک حملے کو برداشت نہیں کر سکوں گا۔ عرصہ ہوا کہ اردو شعر سننے کی پریکٹس چھوٹ چکی ہے۔ زبان کو مکرر اور سبحان اللہ کہنے کی عادت نہیں رہی۔''

اس پر وفد کے لیڈر نے کہا ''پیارے قاری! ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تمہیں غفلت میں شعر نہیں سنائیں گے۔ ہم تم سے ملنا چاہتے ہیں۔''

قاری ڈرتا اور سہمتا ہوا پھر باہر آ گیا۔ وفد کے لیڈر نے اسے سینے سے لگا کر کہا: ''پیارے قاری تم ہم سے روٹھ کر کیوں چلے آئے۔ تمہیں کیا پتہ کہ ہم تمہارے لیے کتنے بے چین ہیں، تمہیں ہمارے ساتھ واپس چلنا ہوگا، ہم تمہیں آرام سے رکھیں گے۔ ہم جنوں کی حکایت لکھتے رہیں گے تم اسے پڑھتے رہو۔''

قاری بولا ''بھائیو! میں برسوں تمہارے جنوں کی حکایت پڑھتا رہا مگر بعد میں اس حکایت سے شکایت ہونے لگی کہ یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے دو ایک شاعروں سے شکایت بھی کی کہ تمہاری حکایت اب اتنی خونچکاں ہو چکی ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ اب ادب میں ذات کے کرب کا اظہار ضروری ہو گیا ہے۔ میں نے شعر پڑھنا چاہا تو مجھے عجیب و غریب علامتیں دی گئیں۔ میں نے افسانہ پڑھنا چاہا تو نفسیات میرے آگے بڑھا دی گئی۔ نظم پڑھنی چاہی تو تنہائی کا زہر میری ذات میں گھولا جانے لگا۔ ادب میں اتنے تجربے کیے گئے کہ ادب لیبارٹری میں تبدیل ہو گیا۔ ہر ادیب نے ادب کو ایک نیا موڑ دینا چاہا۔ چنانچہ ہمارا ادب اتنا مُڑا تڑا ہو گیا کہ اسے دیکھتا تو احساس ہوتا کہ

برسوں بعد کسی گھڑے میں سے نکالی ہوئی شیروانی کو دیکھ رہا ہوں۔ جب افسانے میں سے کہانی اور غزل میں سے شاعری غائب ہونے لگی تو میں نے دبی زبان میں آپ حضرات سے پھر شکایت کی۔ آپ نے فرمایا کہ اب ہم اپنے لیے شعر کہتے ہیں قاری کے لیے نہیں کہتے۔ سو پندرہ سال پہلے ایک دن میں چپ چاپ اردو شعر وادب کو چھوڑ کر یہاں چلا آیا۔ اب میں دوسری زبانیں سیکھ گیا ہوں۔ خدا کے فضل سے اچھا ہوں۔ آپ لوگوں کی آمد سے پتہ چلا کہ ہندوستان میں اب بھی اردو شعر کہے جا رہے ہیں اور افسانے لکھے جا رہے ہیں، بڑے بے شرم لوگ ہیں آپ بھی۔''

وفد کے لیڈر نے آہ بھر کر کہا کہ ''پیارے قاری، شعر اور افسانے لکھے تو جا رہے ہیں مگر انہیں پڑھنے والا کوئی نہیں جبھی تو ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ چلو اور اردو ادب پڑھو جو ہم نے پچھلے پندرہ بیس برس میں لکھا ہے۔''

ایک افسانہ نگار نے کہا: ''پہلے میرے افسانے پڑھو، صرف چھ مجموعے ہیں۔

ایک شاعر نے کہا: ''نہیں پہلے میرا کلام پڑھو، صرف دس مجموعے ہیں۔

اس پر دوسرے شاعر نے کہا: ''پہلے میری نظمیں پڑھو کیونکہ یہ اب تک نہیں چھپی ہیں۔''

پہلے شاعر نے کہا: ''نہیں تمہیں پہلے میرا کلام پڑھنا ہوگا۔''

دونوں شاعروں میں اس پر ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی۔ اس افراتفری سے فائدہ اٹھا کر اردو کا آخری قاری بھاگ کھڑا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ پھر پتہ نہ چلا کہ اردو کا یہ آخری قاری کہاں چلا گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ مر گیا۔ ضرور مر گیا ہوگا۔ جب زبانیں مر جاتی ہیں تو قاری کیوں نہیں مر سکتا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ مرا نہیں زندہ ہے اور سبھاش چندر بوس کے ساتھ ایک دن پھر ہمارے درمیان آئے گا۔ اردو کے شاعر اور ادیب اب بھی اس کی واپسی کا آس لگائے بیٹھے ہیں اور شعر کہے چلے جا رہے ہیں۔

14.3 ''اردو کا آخری قاری'' کا تجزیاتی مطالعہ

اردو مزاح نگاری میں مجتبیٰ حسین کا منفرد مقام ہے۔ مجتبیٰ حسین کی ادبی شخصیت کی مختلف جہتیں ہیں۔ انہوں نے اردو انشائیہ نگاری میں منفرد شناخت قائم کی ہے۔ آزادی کے بعد اردو مزاح نگاری میں آپ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کے انشائیے قاری کو غور و فکر کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں کا ایک مجموعہ ''بالآخر'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کی اشاعت سے متعلق مجتبیٰ حسین رقمطراز ہیں:

'' ''بالآخر'' میرے مزاحیہ مضامین کا پانچواں مجموعہ ہے جو میرے مزاحیہ مضامین کے چوتھے مجموعے ''بہرحال'' کی

اشاعت کے سات سال بعد شائع ہو رہا ہے۔ میں نے پچھلے سات برسوں میں بہت لکھا اور جو کچھ لکھا اسے چھپوایا بھی لیکن پچھلے سات برسوں میں زندگی کی روش کچھ ایسی رہی کہ ان مضامین کو محفوظ نہ رکھ سکا۔''

(مجتبیٰ حسین ''بالآخر''، سامی بک ڈپو، مچھلی کمان حیدرآباد، دیباچہ)

''بالآخر'' میں سترہ مضامین ہیں جو مجتبیٰ حسین کی انشا پردازی کی روشن مثال ہیں۔ ان کے مجموعے میں شامل انشائیے اردو کا آخری قاری، برف کی الماری، ڈائرکٹر کا کتا، سورج گرہن کی یادیں، کالونی میں رہنا، لوٹ پیچھے کی طرف، میرے پتے سے لوگوں کو کیلنڈر جمع کرنے والے، خدا کی قدرت، ایک مشاعرہ کی امنگ کا ٹڈی، قصہ آرام کرسی کا، جشن منانا، داد کی بیداد، کچھ اردو پبلشنگ کے بارے میں، بلراج ورمانے تناظر نکالا، جانا ہمارا کٹک اور پان خطاب یا سیہ رتن وہ اردو ادب میں مزاح نگاری کے فروغ میں غیر معمولی کردار ادا کرتے ہیں۔ اس مجموعے کا اولین انشائیہ ''اردو کا آخری قاری'' بہت عمدہ بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ اس میں ان کا طنز و مزاح عروج پر نظر آتا ہے اور مجتبیٰ حسین نے اردو زبان سے محبت کرنے والے ادبا کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ یہ عنوان ہی قاری کو یہ احساس دلاتا ہے کہ اردو زبان کی صورت حال اکیسویں صدی میں کیا ہے اور اس کی زبوں حالی کو مجتبیٰ حسین طنز کے پیرائے میں پیش کیا ہے اور یہ انشائیہ اس امر کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ اردو ادب تحریر کرنے والے بہت ادبا و شعرا ہیں لیکن ادب کے گرتے معیار کے پیش نظر اب اس کے قاری نہیں ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اب جو ادب لکھا جا رہا ہے وہ ادبی معنویت کھو چکا ہے اور ادیب اب صرف اپنی شہرت کی خاطر ادب میں اپنے ذاتی کرب، اور علامت نگاری کا استعمال زیادہ کرتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''قاری نے پکار کر کہا: ''اردو کے شاعرو اور ادیبو! مجھے معلوم تھا کہ ایک دن تم میرے پاس ضرور آؤ گے مگر پہلے میرے دروازے کے سامنے سے اردو ادب کو تو ہٹاؤ تا کہ میں باہر آ سکوں۔''

اردو ادب کو ہٹایا گیا تو قاری دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ اس کے آنے کی دیر تھی کہ ایک شاعر نے لپک کر سلام عرض کیا اور کہا ''حضور توجہ چاہتا ہوں، مطلع عرض کیا ہے.....

قاری پھر گھر کے اندر بھاگ گیا اور بولا ''بھائیو! میں ادب کے اس اچانک حملے کو برداشت نہیں کر سکوں گا۔ عرصہ ہوا کہ اردو شعر سننے کی پریکٹس چھوٹ چکی ہے۔ زبان کو مکرر اور سبحان اللہ کہنے کی عادت نہیں رہی۔''

اس پر وفد کے لیڈر نے کہا ''پیارے قاری! ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تمہیں غفلت میں شعر نہیں سنائیں گے۔ ہم تم

سے ملنا چاہتے ہیں۔''

قاری ڈرتا اور سہمتا ہوا پھر باہر آ گیا۔ وفد کے لیڈر نے اسے سینے سے لگا کر کہا: ''پیارے قاری تم ہم سے روٹھ کر کیوں چلے آئے۔ تمہیں کیا پتہ کہ ہم تمہارے لیے کتنے بے چین ہیں، تمہیں ہمارے ساتھ واپس چلنا ہوگا، ہم تمہیں آرام سے رکھیں گے۔ ہم جنوں کی حکایت لکھتے رہیں گے۔''

اس انشائیہ کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انشائیہ نگار کو اردو زبان وادب سے کس قدر محبت تھی اور وہ اردو زبان وادب کی صورت حال سے اچھی طرف واقف تھے۔ وہ اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر ''اردو کا آخری قاری'' لکھنے پر مجبور ہوئے۔ یہ انشائیہ صرف قاری کے کرب کو نہیں بیان کرتا ہے بلکہ خود مصنف کی ذات بھی اس میں شامل ہے۔ مجتبیٰ حسین آغاز انشائیہ میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی جو ادب اکیسویں صدی میں لکھا جا رہا ہے وہ ادبی قدر و قیمت کھو چکا ہے۔ اس کا احساس مجتبیٰ حسین کو تھا۔ انہوں نے اپنے ذاتی تجربے کو عوام کے سامنے طنز و مزاح کے پیرائے میں پیش کیا اور اس انشائیے میں طنز کی وہ کاٹ ہے جو مجتبیٰ حسین کے دوسرے انشائیوں میں کم کم ملتی ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کو اردو ادب کا انبوہِ زوال پرستاں کہنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

''بیسویں صدی میں اردو نام کی کوئی زبان بھی تھی، میرے دادا اُس زبان کے شاعر تھے۔ اپنا غیر مطبوعہ کلام میرے والد کو سونپ گئے تھے کہ بیٹا اس کلام کو محفوظ رکھنا، میں نے اس میں اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے، یہ کلیجہ پچھلے برس تک میرے پاس تھا، پھر میری بیوی نے اسے ردی والے کے ہاتھوں فروخت کر دیا اور اس طرح میرے دادا جان مرحوم کے کلام کی رائلٹی حاصل کر لی، چند دن اور گزر جاتے تو اُسے دیمک چاٹ جاتی اور یہ رائلٹی بھی نہ ملتی۔''

پھر ایک چور سے پوچھا ''کیوں بھئی! کیا تم اردو پڑھتے ہو؟''

چور بولا ''اردو شریفوں کی زبان رہی ہے۔ اس سے ہمارا کیا تعلق۔ یوں بھی اردو کے ذریعہ تالے توڑے جا سکتے ہیں اور نہ ہی نقب لگایا جا سکتا ہے۔''

ایک تاجر سے پوچھا: ''لالہ جی کیا آپ اردو پڑھتے ہیں؟''

تاجر بولا: ''دیکھو جی! ہم بزنس میں ہیں، کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتے، ہم تو صرف منافع کی زبان جانتے ہیں۔ اردو پڑھنے سے اگر ہمیں چار پیسے کا منافع بھی ہوتا تو ہم اسے ضرور پڑھتے۔''

ایک اور شخص سے پوچھا: ''کیوں جناب! کیا آپ اردو جانتے ہیں؟''

وہ بولا ''میں تو نہیں جانتا البتہ میرے گھر میں ایک طوطا ہے جو بہت اچھی اردو جانتا ہے۔ آپ میرے گھر آئیں تو کہے گا''۔ مہربانی، آداب عرض ہے، تشریف لائیے، زہے نصیب

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے۔''

مجتبیٰ حسین ایک بسیار نویس تھے۔ ان کی ادبی زندگی تقریباً پانچ دہائیوں پر محیط ہے۔ انہوں نے اس انشائیے سے بے پناہ شہرت حاصل کی ہے۔ اس انشائیہ کی ایک خوبی یہ ہے کہ مجتبیٰ حسین نے جس موضوع کا انتخاب کیا وہ ایک طرح سے انشائیے کے لیے ایک اچھوتا موضوع تھا۔ عام مزاح نگاروں کی اس موضوع پر نظر نہیں پڑی تھی۔ یہ موضوع اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو اپیل بھی کرتا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے اپنے ذاتی تجربے کو عوام کا تجربہ بنا کر پیش کیا ہے۔ کیوں کہ اردو زبان کی صورت حال اکیسویں صدی میں ناگفتہ بہ ہے اور اردو کے ادیبوں کی کوئی وقعت نہیں ہے اور ''اردو کا آخری قاری'' کی مقبولیت کا راز مجتبیٰ حسین کے فن میں پوشیدہ ہے۔ انہوں نے اس انشائیہ میں شگفتہ، شائستہ انداز اختیار کیا ہے۔ ان کے لطیف مزاح میں شائستگی، شرافت، اعتدال پسندی، رمزیت، برجستگی پائی جاتی ہے اور انہوں نے اردو کا آخری قاری میں طنز کی آمیزش اور زبان کا رچاؤ تیکھے اور دلکش اسلوب میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجتبیٰ حسین نے اپنے مشاہدہ کو نہایت چابکدستی سے بیان کیا ہے۔ وہ اس انشائیہ میں واقعات کے مضحک پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ آخری قاری کی تلاش جس طرح پورے انشائیے میں ہو رہی ہے اور تمام ادیب ایک قاری کو تلاش کرنے میں اس طرح سرگرداں ہے کہ لگتا ہے کہ اگر آخری قاری نہیں ملا تو ادب ختم ہو جائے۔ اس طرح کے واقعات کو بیان کرنا اور مضحک پہلو تلاش کرنے کا ہنر مجتبیٰ حسین کو آتا ہے۔

مجتبیٰ حسین کے اس انشائیہ میں طنز کی کاٹ بہت گہری ہے لیکن عام قاری کی رسائی یہاں تک ممکن نہیں ہے۔ مجتبیٰ حسین کی طنز کی کاٹ صرف ادیبوں تک محدود نہیں بلکہ تمام سرکاری اور غیر سرکاری ادارے بھی شامل ہیں جو اردو کے نام پر قائم و دائم ہیں۔ انہوں نے لکھا کہ:

> ''اگر کوئی شخص اردو قاری کا پتہ بتائے تو اسے اردو اکیڈمی کی طرف سے منہ مانگا انعام دیا جائے گا اور اردو ادب کی اس عظیم خدمت کے صلے میں اس کا نام اردو ادب کی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ یوں بھی اردو ادب کی تاریخ لکھنے کے لیے ہمارے پاس سنہری روشنائی کا ہی استعمال کیا جاتا ہے۔''

''اردو کا آخری قاری'' میں مجتبیٰ حسین نے اس بنیادی سچائی کا احساس دلایا جو دوسرے مزاح نگار نہیں کر سکتے ہیں۔ ان کے اس انشائیہ میں ان کا داخلی آہنگ ہی ان کی پہچان ہے۔ اس انشائیے میں مصنف نے معاشرے کی سچائیوں کو اجاگر کیا ہے لیکن اس انشائیہ کے قاری کو کبھی بھی گھٹن کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ اس میں قدروں کا بالیدہ احساس، خیال کی بوقلمونی بھی ہے۔ انبساط اور فرحت و مسرت بھی ہے۔ مجتبیٰ حسین نے جب ایک طوطے کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ اردو زبان بہت شستہ بولتا ہے اس سے قاری کو فرحت و انبساط تو ہے لیکن اس میں طنز بھی پنہاں ہے جس کا احساس کم ہوتا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

''اچھا تو آپ کا طوطا سخن فہم بھی ہے، کیا یہ شعرا سے آپ نے سکھایا ہے؟''

وہ شخص بولا: ''میں کیا جانوں کہ شعر کیا ہوتا ہے۔ اصل میں میرے دادا کے پاس ایک طوطا تھا جسے مذکورہ بالا اردو آتی تھی۔ اس کے بعد ہمارے گھر میں جتنے طوطے آئے وہ اردو سیکھتے گئے، طوطوں کے پاس یہ اردو نسلاً بعد نسل آئی ہے۔''

''آپ نے اردو کیوں نہیں سیکھی؟''

''میں پرندوں کی بولیاں سیکھنے کو ضروری نہیں سمجھتا۔''

ایک اور شخص سے پوچھا ''کیا آپ اردو جانتے ہیں؟''

وہ بولا ''میں اردو سیکھنا تو چاہتا تھا مگر مجھے معلوم ہوا کہ اردو بڑی میٹھی زبان ہے اور مجھے شوگر کی بیماری ہے۔ ڈاکٹروں نے میٹھی چیزوں سے پرہیز بتایا ہے۔''

مجتبیٰ حسین کا یہ انشائیہ بہت دلچسپ بھی ہے اور دلکش بھی۔ آغاز ہی سے وہ قاری کو اپنے گرفت میں لیتا ہے۔ مجتبیٰ حسین اس انشائیہ ''اردو کا آخری قاری'' میں اردو زبان و ادب کی موجودہ صورت حال پر کھلا طنز کیا ہے لیکن ایسا طنز نہیں جو قاری پر شاق گزرے۔ انہوں نے اکیسویں صدی کی اردو زبان و ادب کی صورت حال کو اس انشائیہ کی وساطت سے بیان کیا ہے۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ ''اردو کا آخری قاری'' زبان و بیان اور اسلوب کے اعتبار سے بہت ہی اہم ہے۔ اس کے مکالمے سے جس طرح مزاح پیدا کیا گیا ہے یہ مجتبیٰ حسین کی انفرادیت کا ضامن ہے۔

14.3.1 سرگرمی آؤ اپنی معلومات جانچیں

عزیز طلبا و طالبات آیئے ایک لمحے کے لیے رکیں اب جبکہ آپ نے مجتبیٰ حسین کا انشائیہ ''اردو کا آخری قاری'' پڑھ لیا اور اس انشائیہ کا تجزیہ بھی پڑھ لیا تو نیچے دی گئی مشقیں حل کرنے کی کوشش کریں اور صحیح یا غلط کا نشان لگائیں۔

1۔ ''اردو کا آخری قاری''، مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ مضامین کے مجموعہ ''بالآخر'' میں شامل ہے۔ ( )

2۔ مجتبیٰ حسین نے ''اردو کا آخری قاری'' انشائیہ میر تقی میر کے عہد کی شاعری کے حوالے سے لکھا ہے۔ ( )

3۔ ''اردو کا آخری قاری'' میں اکیسویں صدی کے شعرا و ادبا کی تخلیقات اور اردو زبان کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ ( )

4۔ ''اردو کا آخری قاری'' مجموعہ بالآخر کا پہلا انشائیہ ہے اور اس مجموعے میں سترہ انشائیے شامل ہیں۔ ( )

5۔ مجتبیٰ حسین کا انتقال بیسویں صدی میں ہو گیا تھا۔ ( )

14.4 عمومی جائزہ

مجتبیٰ حسین اردو کے اہم انشائیہ نگار ہیں۔ ان کے انشائیے معاشرے کی صورت حال کے غماز ہیں۔ انہوں نے جتنے بھی انشائیے قلم بند کیے ان انشائیوں کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے سماجی و ادبی صورت حال کو اپنے تجربے کی بنیاد پر قلم بند کیا ہے۔ ان کا انشائیہ ''اردو کا آخری قاری'' بہت عمدہ انشائیہ ہے اور انشائیہ کے عنوان سے ہی اردو زبان کی بدحالی کا پتہ چلتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں وہی زبان زندہ رہتی ہے جس کے پڑھنے والے موجود ہوں۔ اور جس زبان سے عام قاری کا رشتہ ٹوٹ جائے وہ زبان معدوم ہو جاتی ہے۔ مجتبیٰ حسین کا کمال یہ ہے کہ انشائیہ کے عنوان سے ہی اپنے مطمح نظر کو واضح کر دیا ہے لیکن اس انشائیہ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ادبا اور شعرا جو خود اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم نہیں دیتے وہ اپنے آپ کو ادب میں زندہ رہنے کے لیے قاری کی تلاش کرتے ہیں اور اردو زبان کے بقا کی ذمہ داری عوام پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ مجتبیٰ حسین نے طنزیہ و مزاحیہ اسلوب میں اردو زبان و ادب کے تعلق سے اپنے تلخ تجربے کو پیش کر دیا ہے اور انہوں نے اکیسویں صدی کے ادبی منظر نامے پر طنز کیا ہے اور اردو زبان و ادب کے زوال، اسباب و عوامل پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ایسی گفتگو جو قاری پر شاق نہ گزرے۔ مجتبیٰ حسین کے انشائیوں میں ہماری سماجی زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ ان کے انشائیوں کی اہم خوبی ہے جو

انہیں دیگر مزاح نگاروں سے منفرد کرتی ہے۔

14.5 فرہنگ

قاری	:	پڑھنے والا
دانش مند	:	عقل مند، ہوشیار، صاحب تدبیر
فی البدیہہ	:	برمحل، بے سوچے
نامعقول	:	نامناسب، ناموافق
راہ گیر	:	راستہ چلنے والا، مسافر
سخن فہم	:	کلام کو سمجھنے والا، نکتہ شناس
نقاد	:	شعر وادب کو پرکھنے والا، پارکھ
شرافت	:	عزت، وقار، نیک کردار
گلوگیر	:	گلے یا گردن میں پھنسا ہوا
گلشن	:	چمن، باغ
اشتہار	:	شہرت، مقبولیت
فخر	:	ناز، تعلّی، افتخار
مطلع	:	طلوع ہونے کی جگہ
علامت	:	چھاپ، مہر، نشانی

14.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

طویل سوالات

1۔ مجتبیٰ حسین کی انشائیہ نگاری کا جائزہ لیجئے۔

2۔ ''اردو کا آخری قاری'' کا بھرپور جائزہ لیجئے۔

3۔ ''اردو کا آخری قاری'' کا اردو انشائیوں میں مقام متعین کیجئے۔

4۔ مجتبیٰ حسین کے انشائیہ ''اردو کا آخری قاری'' میں طنز وظرافت کی خوبیاں تلاش کیجئے۔اور اسے مع مثال واضح کیجئے۔

مختصر سوالات

1۔ مجتبیٰ حسین کے سوانحی کوائف بیان کیجئے۔

2۔ مجتبیٰ حسین کے اسلوب سے بحث کیجئے۔

3۔ مجتبیٰ حسین نے ''اردو کا آخری قاری'' انشائیہ کیوں قلم بند کیا؟ اس کی وجہ بیان کیجئے۔

4۔ اردو انشائیہ نگاری میں مجتبیٰ حسین کا مقام متعین کیجئے۔

14.7 مشقی سوالات

1۔ ''اردو کا آخری قاری''، مجتبیٰ حسین کے کس مضامین کے مجموعے میں شامل ہے اور اس مجموعے میں کل کتنے مضامین ہیں؟ صرف پانچ کے نام لکھیے۔

2۔ ''اردو کا آخری قاری''میں کس صدی کے شعرا کی شاعری کے حوالے سے گفتگو ہوئی ہے اور مصنف اردو کے آخری قاری کی تلاش کا سبب کیا ہے۔

3۔ ''اردو کا آخری قاری'' لکھنے کا مقصد کیا تھا؟

14.7 مشقی سوالات کے جوابات

1۔ ''اردو کا آخری قاری''، مجتبیٰ حسین کے مضامین کا مجموعہ ''بالآخر'' میں شامل ہے۔اس مجموعے میں کل سترہ مزاحیہ مضامین ہیں ان میں برف کی الماری، ڈائرکٹر کا کتا، خدا کی قدرت، قصہ آرام کرسی کا، جشن منانا بھی شامل ہیں۔

2۔ ''اردو کا آخری قاری'' اکیسویں صدی کی شاعری کے گرتے معیار کو مزاح کے پیرائے میں پیش کیا گیا ہے اور اردو زبان ادب کے زوال کی وجہ سے شعرا کو ان کی شاعری پڑھنے والا نہیں ملتا ہے اور اس لیے ایسے قاری کے متلاشی ہیں جو ان شعرا کی تعریف کرے۔

3۔ ''اردو کا آخری قاری'' کے لکھنے کا یہ مقصد ہے کہ اکیسویں صدی میں اردو زبان کے معیار اور زوال سے قاری کو روشناس کرانا ہے۔

1.10 امدادی کتب

۱۔ انتخاب اُردو نثر (1857 1920ء) ایجوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ۔

۲۔ انتخاب اُردو نثر 1920 کے بعد ای جوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ

Books Recommended.

۱۔ مختصر تاریخ ادب اُردو۔ڈاکٹر سید اعجاز حسین ترجمہ واضافے	ڈاکٹر سید محمد عقیل
۲۔ اُردو ادب میں طنز ومزاح۔	ڈاکٹر وزیر آغا
۳۔ اُردو ادب میں طنز ومزاح۔	غلام احمد فرقت کاکوروی
۴۔ رشید احمد صدیقی۔شخصیت اور فن۔	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
۵۔ اُردو انشائیہ۔	وزیر آغا
۶۔ انشائیہ کے فنی سروکار۔	ڈاکٹر احمد امتیاز
۷۔ انشائیہ کی بنیاد۔	ڈاکٹر سلیم اختر
۸۔ فنِ انشائیہ اور انشائیے۔	ڈاکٹر فرحت شمیم
۹۔ انشائیہ کے خدوخال	وزیر آغا
۱۰۔ انشائیہ کی بنیاد	ڈاکٹر سلیم اختر
۱۱۔ انشائیہ اردو ادب میں	ڈاکٹر انور سدید
۱۲۔ انشائیہ	ڈاکٹر آدم شیخ
۱۳۔ ڈپٹی نذیر احمد احوال وآثار	محمد اکرام چغتائی
۱۴۔ مولوی نذیر احمد احوال وآثار	ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی
۱۵۔ لکچروں کا مجموعہ (مرتبہ)	محمد نذیر حسین

۱۶۔ نذیر احمد — نورالحسن نقوی

۱۷۔ فکر و نظر (ڈپٹی نذیر احمد نمبر) علی گڑھ

۱۸۔ خواجہ حسن نظامی: شخصیت اور ادبی خدمات — نثار احمد فاروقی

۱۹۔ خواجہ حسن نظامی کی نثر — ڈاکٹر مولا بخش

۲۰۔ خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری — سید محمد نیر رضوی

۲۱۔ خواجہ حسن نظامی کتاب نما — خصوصی شمارہ

سبق نمبر۔15 اردو انشائیہ میں طنز و مزاح

ساخت

15.0 اغراض و مقاصد

15.1 تعارف

15.2 انشائیہ کی فکری و فنی خصوصیات

15.2.1 اردو انشائیہ میں طنز و مزاح کے عناصر

15.3 اردو انشائیہ میں طنز و مزاح کی روایت

15.3.1 سرگرمی- صحیح یا غلط

15.4 عمومی جائزہ

15.5 فرہنگ

15.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

15.7 مشقی سوالات

15.8 مشقی سوالات و جوابات

15.9 امدادی کتب

15.0 اغراض ومقاصد

عزیز متعلم اس سبق کے مطالعے کے بعد اس قابل ہو جائیں گے کہ

انشائیہ میں طنز ومزاح کا استعمال کس طرح ہوا ہے، سمجھ سکیں۔

اردو کے اہم انشائیہ نگاروں کی خدمات سے متعارف ہو سکیں گے۔

رشید احمد صدیقی کے انشائیہ نگاری کی خصوصیات سے واقف ہو سکیں گے۔

پطرس بخاری نے اردو انشائیہ نگاری میں کیا خدمات انجام دی ہیں اس سے بھی واقف ہو سکیں۔

کنہیالال کپور کی مزاح نگاری کے امتیازات جان سکیں گے۔

مجتبیٰ حسین اور مشتاق یوسفی کا اردو انشائیہ نگاری میں کیا مقام ہے؟ اس سے بھی واقف ہو سکیں گے۔

اردو انشائیہ کے ارتقا میں مذکورہ مزاح نگاروں نے کیا خدمات انجام دی ہیں اس سے بحسن وخوبی واقفیت حاصل کر سکیں گے۔

15.1 تعارف

اردو کی غیر افسانوی ادب میں صنف انشائیہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ نوآبادیاتی دور میں بہت سی اصناف وجود میں آئیں ان میں ایک اہم صنف انشائیہ بھی ہے۔ اس صنف ادب میں ہلکے پھلکے انداز میں شخصی تاثرات اور احساسات کا اظہار ہوتا ہے۔ اس میں مصنف اپنے ذاتی تاثرات، شگفتہ انداز اور غیر رسمی انداز میں کسی موضوع پر آزادانہ طور پر اظہار خیال کرتا ہے۔ انشائیہ میں حقائق کے بجائے شخصی ردعمل، ہلکا پھلکا طنز ومزاح اور تخلیقی اسلوب کو مرکزیت حاصل ہوتی ہے۔ انشائیہ میں موضوع کی قید نہیں ہوتی ہے، کسی بھی معمولی موضوع پر انشائیہ لکھا جا سکتا ہے۔ انشائیہ کی اہم خصوصیت شگفتگی ولطافت ہے اور شگفتگی اور لطافت کو انشائیہ کی روح تسلیم کیا جاتا ہے۔ انشائیہ میں انشائیہ نگار اپنی شخصیت اور تجربات کو بھی بے نقاب کرتا ہے۔ انشائیہ کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ انشائیہ کسی خاص نتیجے پر ختم نہیں ہوتا ہے نتیجہ قاری پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور انشائیہ میں طنز ومزاح کی روایت قدیم بھی ہے اور مستحکم بھی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اردو انشائیوں میں طنز ومزاح کے اسلوب کو برتنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ ظاہر ہے ہنسنا، ہنسانا، شوخی وظرافت فطرت انسانی میں داخل ہے۔ اردو ادب میں اس کی اہمیت ہر دور میں رہی ہے۔ اردو شعر وادب میں طنز ومزاح کو صنف کا درجہ حاصل نہیں ہے اور یہ کسی ایک صنف کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ مزاحیہ ادب افراد کے خیالات، جذبات، احساسات

اور رجحانات میں نفاست اور پاکیزگی عطا کرتا ہے۔اردو ادب میں طنز ومزاح کی تاریخ بہت قدیم ہے۔داستانوں میں طنز ومزاح کے عناصر ملتے ہیں۔طنز ومزاح نے نظم ونثر دونوں میں ارتقا کی منزلیں طے کی ہیں۔آزادی کے بعد شاعری کی بہ نسبت نثر میں طنز ومزاح کو زیادہ فروغ حاصل ہوا اس دور میں اردو انشائیوں میں طنز ومزاح پیدا کرنے کا رواج زیادہ مستحکم ہوا اور ان انشائیوں میں طنز ومزاح کے عناصر کو شامل کرنے کا مقصد صرف ہنسنا ہنسانا نہیں تھا اس کا محور ومرکز فکر انگیزی بھی تھا۔اس دور کے انشائیوں میں طنز ومزاح کے ذریعہ فکر کی دعوت دی گئی ہے۔رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، کنہیالال کپور، مجتبیٰ حسین، مشتاق یوسفی اپنے انشائیوں میں طنز ومزاح کے گل بوٹے سجائے ہیں۔ان کے انشائیوں کے مطالعہ سے قاری فرحت وانبساط محسوس کرتا ہے۔ان کا طنز ومزاح قاری کو بوجھل نہیں کرتا ہے اس کے مطالعہ سے قاری کے فکر میں وسعت وگہرائی پیدا ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان مزاح نگاروں کے انشائیے اردو ادب میں اہم مقام رکھتے ہیں۔

15.2 انشائیہ کی فکری وفنی خصوصیات

''انشائیہ'' انگریزی زبان کے لفظ Essay یا "Light Essay" کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔انشائیہ کی صنف اردو میں مغرب کی رہین منت ہے اور اکثر لوگوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ صنف اردو میں مغرب سے آئی۔انشائیہ کو بطور صنف قبول کرنے میں کچھ لوگوں نے اعتراض کیا ہے۔پروفیسر سید احتشام حسین نے لکھا ہے کہ:

> ''انشائیہ محض ذاتی تاثر ہے یا فلسفیانہ خیال آرائی محض انشائیہ پروازی کا طلسم ہے یا معنی خیز اظہار خیال محض سرسری اور سادہ اظہار تاثر ہے یا رنگین یا فکر خیز ادبی تخلیق۔اس طرح سے بہت سی نازک بحثیں اٹھائی گئی ہیں اور اب تک کوئی آخری بات اس سلسلے میں نہیں کہی گئی ہے اگر کسی نے بحث مباحثہ کے بعد کوئی نتیجہ نکال بھی لیا ہے تو اس پر پورے ہونے والے صرف چند مضامین ملے ہیں۔جنہیں اس نے اپنے نقطہ نظر والے انشائیوں کی فہرست میں شریک کرنا مناسب سمجھا اور باقی سب ذاتی پسند کی ہو کر رہ گئی۔''
>
> (پروفیسر سید محمد حسنین، انشائیہ اور انشائیے، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ساتواں ایڈیشن، 2014، ص 14)

اس اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انشائیہ کی کوئی حد بندی نہیں ہونی چاہئے اس لیے انشائیہ کو ''ذہنی ترنگ'' بھی کہا گیا ہے اور انشائیہ نثری ادب کا ایک اسلوب ہے اسے صنف کہنا ہمارے خیال میں درست نہیں ہے۔سوال یہ ہے کہ کیا انشائیہ مضمون کی ایک شکل ہے یا دونوں میں

فرق بھی ہے ظاہر ہے لفظ "Essay" مضمون کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ پروفیسر سید محمد حسنین نے لکھا ہے کہ:

''انشائیہ مضمون کی ایک قسم ہے بظاہر یہ خیال درست ہے پر وہ مضمون نہیں جس میں مراسلہ کی خبر و خیریت ملتی ہے یا مقالہ کی معلوماتی اور فکر انگیز روشنی جس میں کیفیہ کی رقت خیزی ہو یا سوانح حیات کے تاریخ دار کارنامے جس میں خاکہ کے رخ روشن کی تابانی نظر آئے یا رپورتاژ کی تاثراتی تفصیلات.....مراسلہ، مقالہ، کیفیہ، سوانح حیات، روئداد، خاکہ اور رپورتاژ مضمون کی مختلف شکلیں ہیں ایسی مخصوص شکلیں جنہیں ہم ''اصناف'' (GENRES) کا مرتبہ دیتے ہیں ان مضمون نما شکلوں میں انشائیہ بھی تحریر کی ایک مختلف صورت ہے اور نثری ادب میں اس کا صنفی مقام ہے انشائیہ کو اس لیے مضمون خیال کرنا درست نہ ہوگا۔'' (ایضاً، ص21)

پروفیسر محمد حسنین نے بجا طور پر انشائیہ اور مضمون میں فرق واضح کیا ہے لیکن انہوں نے انشائیہ کو کبھی صنف کا درجہ دیا ہے تو کبھی اسلوب کا اور انہوں نے انشائیے کے فن پر گفتگو کرتے وقت اسے مزید پیچیدہ بنا دیا ہے۔ ایک جگہ انشائیہ کی خصوصیات اس طرح بیان کرتے ہیں:

''انشائیہ سیرت نگاری کا بھی مرقع نہیں۔ تعمیر شخصیت یا مرقع سازی انشائیہ نگار کا عمل نہیں ہے یہ خاکہ نگار کا کام ہے اس صنف میں شخصیت و سیرت کی جلوہ گری یا انفرادیت کی مصوری ممکن ہے مگر یہ ذیلی عمل ہوگا۔ اس عمل میں احتیاط کی بے حد ضرورت ہے۔'' (ایضاً، ص37)

انور سدید نے انشائیہ کے فکر و فن پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ انہوں نے انشائیہ کو دور اندیشی اور عافیت اندیشی کی ایک قابل تعریف سعی قرار دیا ہے اور انہوں نے انشائیہ کو مخصوص صنف کا درجہ دینے میں بھی تامل نہیں کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:۔

''فنی اعتبار سے انشائیہ موضوعی اور داخلی صنف ہے، انشائیہ اشیاء اور مظاہر کی خارجی سطح کو مس کرنے کے بجائے ان کے بطون کو کھنگالتا ہے اور جذبہ کو برانگیختہ کرنے کے بجائے اس کی تکذیب کرتا ہے۔'' (ایضاً، ص58)

ناقدین ادب کا کہنا ہے کہ انشائیہ کے داخلی نظام میں موضوع کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہے جیسی مضمون یا مقالہ میں ہوتی ہے۔

انشائیہ کی اہم خصوصیات یہ ہیں:۔

۱۔ انشائیہ میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہے انشائیہ نگار کا مقصد قاری کو معلومات فراہم کرنا نہیں ہوتا ہے بلکہ قاری کو ذہنی تفریح اور تازگی بخشنا ہوتا ہے انشائیہ ایک عام سے موضوع پر بھی لکھا جا سکتا ہے۔

۲۔ انشائیہ میں عالمانہ اور خشک انداز کے بجائے بے تکلف اور دوستانہ لہجہ بھی اختیار کیا جاتا ہے اور انشائیہ نگار کے اس فکری تکنیک سے ایسا محسوس ہے کہ مصنف اور قاری آمنے سامنے گفتگو کرتے ہیں۔

۳۔ عام طور پر انشائیہ مختصر اور جامع ہوتا ہے اور ایک نشست میں پڑھنے کا متقاضی ہوتا ہے اس میں بات سے بات پیدا کی جاتی ہے لیکن اس کو اتنا طول نہیں دیا جاتا ہے کہ قاری کو شاق گزرے اور عموماً انشائیہ ایک ہی نشست میں پڑھا جاتا ہے۔

۴۔ اکثر انشائیوں میں طنز و مزاح کا رنگ نمایاں ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ طنز اور شگفتہ مزاح سے قاری کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیرتا اور قاری اس کا مطالعہ دلجمعی سے کرتا ہے ایک پل کے لیے انشائیہ سے نگاہ کو ہٹانا گوارا نہیں کرتا ہے۔

۵۔ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ انشائیہ کسی خاص فلسفیانہ نقطہ نظر نہیں پیش کرتا ہے اور اس کا اختتام بھی کسی منطقی نتیجے پر نہیں ہوتا ہے۔ اس میں مصنف اپنی بات کو تو مکمل کرتا ہے اور قاری کے سوچنے کے در کو وا کرتا ہے۔

۶۔ کسی بھی تخلیق کی اہمیت اس کے زبان و بیان سے ہوتی ہے اور زبان و بیان سے اسلوب میں شگفتگی آتی ہے۔ انشائیہ میں زبان و بیان اور اسلوب ہی اس کی ادبی شناخت ہے انشائیہ کی زبان عام فہم کے ساتھ پر اثر بھی ہوتی ہے اور اس میں شاعرانہ اسلوب استعاروں اور تشبیہات کو کثرت سے استعمال بھی کیا جاتا ہے۔

15.2.1 اردو انشائیہ میں طنز و مزاح کے عناصر

اردو میں طنز کا لفظ انگریزی لفظ (Satire) کے مترادف ہے اور Irony کے لیے بھی بسا اوقات طنز یا طنز ملیح کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے اور مزاح و ظرافت کے لیے HUMOUR کا لفظ مترادف کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ پروفیسر سید احتشام حسین کے مطابق ظرافت کا مقصد تفریح طبع ہے اور طنز کا مقصد انسانی زندگی میں افراط و تفریط کی اصطلاح ہے۔ وزیر آغا نے طنز و مزاح کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

> ''طنز زندگی اور ماحول سے برہمی کا نتیجہ ہے اس میں غالب عنصر نشتریت کا ہوتا ہے طنز نگار جس چیز پر ہنستا ہے اس سے نفرت کرتا اور اسے تبدیل کر دینے کا خواہاں ہوتا ہے اس کے برعکس مزاح زندگی اور ماحول سے انس اور مفاہمت کی پیداوار ہے مزاح نگار جس چیز پر ہنستا ہے اس سے محبت کرتا اور اسے اپنے سینے سے چمٹا لیتا ہے اور طنز نگار توڑتا ہے اور توڑنے کے دوران میں ایک فاتحانہ قہقہہ لگاتا ہے چنانچہ طنز میں جذبہ افتخار کسی نہ کسی صورت میں

ضرور موجود ہوتا ہے۔''

(وزیر آغا، اردو ادب میں طنز و مزاح، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2019، ص 49-48)

انشائیہ میں مزاح کے گل بوٹے سجائے جاتے ہیں ناقدین ادب کا ماننا ہے کہ انشائیہ میں مزاح میں دو قسمیں استعمال کی جاتی ہیں۔ ظرافت اور ہجو ہے پروفیسر سید محمد حسنین نے لکھا ہے کہ:

''میں نے کہا کہ مزاح انشائیہ کا جوہر اعظم ہے پر یہ نہ بھولیے کہ اعلیٰ اور معیاری مزاح نا مطابق خیالات کی آویزش سے ابھرتا ہے اور یہ نا مطابق واقعات کے اجتماع سے پیدا نہیں کیا جاتا، انشائیہ لمحے بھر کے لیے ہمیں حیوان بنا دیتا ہے یہ صحیح ہے لیکن سینگ لگا کر لاتیں چلانا قابل ستائش نہیں بلکہ سینگوں کے بغیر بیل بن جانا یا بنا دینا قابل تعریف ہے۔'' (پروفیسر محمد حسینی، انشائیہ اور انشائیے، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2014، ص 39)

پروفیسر سید محمد حسنین نے طنز و مزاح کو انشائیہ کے لیے بہت اہم قرار دیا ہے اور انشائیہ نگار کی خوش گفتاری کا خمیر طنز و مزاح سے ہی پیدا ہوتا ہے ان کا ماننا ہے انشائیہ میں مزاح کی دو قسمیں زیادہ استعمال ہوتی ہیں، ظرافت اور ہجو۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''معیاری انشائیہ سے اصلی اور کھسیانی دونوں ہنسی میسر ہوتی ہے اور ظرافت اور ہجو سے انشائیہ پر رونق ہو جاتا ہے اس میں ایسی تازگی اور طراوت آجاتی ہے کہ بار بار اسے مطالعہ کرنے کا جی چاہتا ہے۔'' (ایضاً، ص 39)

اس حقیقت کا بھی اظہار ضروری ہے کہ انشائیہ نگار اکثر اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا ہے بلکہ دوسروں کے کاندھے پر بندوق رکھ کر بندوق چلاتا ہے اور انشائیہ نگار طبعاً ظریف ہوتا ہے اور طنز و مزاح کی وساطت سے انشائیہ مزید دلچسپ بنا رہتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا مزاح نگاری اور انشائیہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ طنز و مزاح اور ظرافت ایک ایسا آلہ ہے جس کی وساطت سے ہنستے ہنستے سماج یا افراد کی برائیوں کی نشان دہی کی جاتی ہے اور اس کی خوبی یہ ہے کہ ان تحریروں کی تفہیم باوقار اور حساس قاری کر پاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ طنز میں جو باتیں کی جاتی ہیں تو وہ ذہن میں خلش پیدا کرتی ہیں لیکن ایک اہم انشائیہ نگار باشعور قاری تک اس کی بھنک پہنچانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ ڈاکٹر احمد حسین آزاد نے انشائیہ اور طنز و مزاح کی رشتے کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

''انشائیہ ادب کی ایک خاص صنف اور تحریر کی ایک مخصوص صورت ہے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ انشائیہ کی وحشت میں غم ناکی کی بجائے طربناکی ہوتی ہے اور مزاح انشائیہ نگار کی سیرت کا خمیر۔ انشائیہ کی شگفتہ بیانی طنز و ظرافت کی

سرحدوں پر لے جاتی ہے لیکن طنز وظرافت کی کثرت کے باوجود انشائیہ میں ذہن کی آزاد ترنگ کا وصف باقی رہتا ہے جو اس کو خالص مزاحیہ یا ظریفانہ یا طنزیہ تحریر نہیں بننے دیتا۔ ایک انشائیہ نگار، مزاح نگار، طنز نگار اور ظرافت نگار ہوسکتا ہے لیکن ہر مزاح نگار یا طنز نگار، یا ظرافت نگار انشائیہ نگار نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ مزاح، طنز اور ظرافت کی نوعیت توصیفی ہے صنفی نہیں ہے۔''

(ڈاکٹر احمد امتیاز (مرتب)، انشائیہ کے فنی سروکار، ایم۔ آر پبلی کیشنز، نئی دہلی، سن اشاعت 2012، ص 98-297)

انشائیہ کی خوبی یہ ہے کہ اس میں زندگی کے ہر شعبے کو اپنے گرفت میں لے سکتا ہے اور انشائیہ نگار طنز ومزاح کے وسیلے سے قاری پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ انشائیہ نگار کے بارے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ اس کے آئینہ گفتار میں ناکردہ گناہوں کی حسرت اور کردہ گناہوں کی خفت نظر آئے۔ قاری کو ایسا شعور شادمانی نصیب ہو کہ وہ انا میں ریا اور ہنر میں فکر کی تمیز کر سکے۔

15.3 اردو انشائیہ میں طنز ومزاح کی روایت

طنز ومزاح انسانی اظہار کی ایسی خصوصیت ہے جس کے لئے نظم ونثر کی کوئی قید نہیں ہے ظاہر ہے اردو نثر میں طنز ومزاح کی تاریخ زیادہ قدیم نہیں ہے اس کے اولین اور واضح نقوش غالب کی نثر میں دکھائی دیتے ہیں اور غالب کی نثر میں پہلی بار باضابطہ طور پر عقل، جذبہ اور طرز اظہار کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ غالب کے ظریفانہ کمال کی داد دیتے ہوئے کلیم الدین احمد نے اردو کے انشا پردازوں کو یہ مشورہ دیا ہے۔ اس ضمن میں ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''اگر اردو انشاء پرداز یہ چاہتے ہیں کہ وہ میدان ظرافت میں آگے بڑھیں۔ اگر ان کی خواہش ہے کہ وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ہنستی بولتی تصویر مرتب کر سکیں اگر ان کی تمنا ہے کہ وہ ظرافت کے ایسے نمونے پیش کریں جنہیں فنا نہ ہو تو یہ پھر وہ اپنی راتیں اور اپنے دن غالب کے مطالعہ میں صرف کریں۔''

(خالد محمود (مرتب)، اردو ادب میں طنز ومزاح کی روایت، اردو اکادمی، دہلی، 2005، ص 96)

اردو نثر میں طنز ومزاح کی روایت کو آگے بڑھانے میں اودھ پنچ سے وابستہ طنز ومزاح نگاروں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ عبدالحلیم شرر، منشی سجاد حسین، مچھو بیگ ستم ظریف، احمد علی شوق، منشی احمد علی کسمنڈوی، نواب سید محمد آزاد، تربھون ناتھ ہجر، عبدالغفور شہباز، جوالا پرساد برق، سید ممتاز

حسین کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اودھ پنچ نے اردو نثر میں طنز و مزاح کی ایسی بنیاد رکھ دی جس نے آگے بڑھ کر بہت ترقی کی۔ اودھ پنچ کے بعد طنز و مزاح نے نئی بلندیاں طے کیں۔ اردو انشائیہ میں طنز و مزاح کا فروغ بیسویں صدی کے نصف اول میں زیادہ ہوا۔ سید محفوظ علی بدایونی، مہدی افادی، خواجہ حسن نظامی، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، قاضی عبدالغفار، شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی، مرزا فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری، ابوالکلام آزاد، رشید احمد صدیقی کے تخلیقی کارنامے کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے ان ادبا نے اردو انشائیہ میں طنز و مزاح کے عناصر کو بروئے کار لا کر اسے ایک نئی سمت عطا کی۔ اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ آزادی سے قبل کے دو اہم انشائیہ نگار پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی کے ذکر کے بغیر انشائیہ کی تاریخ ادھوری رہے گی۔ ان انشاء پردازوں کے یہاں صرف لفظی بازی گری نہیں ہے بلکہ فکری بالیدگی ہے۔ پطرس کی مزاحیہ تحریروں کا سرمایہ مختصر ہونے کے باوجود اردو نثر کا بیش قیمتی سرمایہ ہے۔ ان کے یہاں تخیل کی ندرت اور فکر کی بالیدگی پائی جاتی ہے جو دوسرے مزاح نگاروں کے یہاں کم کم پائی جاتی ہے۔

آزادی کے بعد سرگرم مزاح نگاروں میں فکر تونسوی کا نام بھی آتا ہے اور مشفق خواجہ کے انشائیے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ حسن نظامی کے انشائیے میں زبان کی شگفتگی اور فلسفیانہ رنگ حاوی ہے۔ حسن نظامی کے انشائیوں میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کی۔ ان کے بہترین انشائیے کے مجموعے میں سیاہی، سی پارۂ دل، مکھی، دیا سلائی، لالٹین وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اردو انشائیہ میں مزاح کا حسن پیدا کرنے میں پطرس بخاری کا نام سرفہرست ہے۔ تازگی اور شگفتگی پطرس کے انداز بیان کا حسن ہے۔ ''کتے'' اس کی روشن مثال ہے۔ رشید احمد صدیقی کے انشائیوں میں متنوع موضوعات پائے جاتے ہیں جو قاری کو فرحت و انبساط عطا کرتے ہیں۔ چارپائی، دھوبی، ارہر کا کھیت، مرشد، ڈاکٹر دیہاتی کا شمار بہترین انشائیوں میں ہوتا ہے۔ کنہیا لال کپور نے طنز و مزاح میں انشائیہ کے خدوخال کی تلاش کی ہے علاوہ بریں بہت سے انشائیہ نگار ہیں جن کے انشائیوں میں طنز و مزاح کے گل بوٹے سجائے گئے ہیں، وزیر آغا، مشتاق یوسفی، احمد جمال پاشا، کا نام قابل ذکر ہے۔ مشتاق یوسفی کے انشائیوں کی فضا، مزاحیہ اور طنزیہ ہے۔ ان کے انشائیوں میں پڑیے گر بیمار اور جنون لطیفہ اچھے انشائیے ہیں۔ علاوہ بریں بہت سے انشائیہ نگار ہیں اور ان انشائیہ نگاروں کی تخلیقات میں طنز و مزاح کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ وزیر آغا کے انشائیوں میں الفاظ کے رکھ رکھاؤ بھی ہے اور طنز و مزاح کی چاشنی بھی ہے۔ پگڈنڈی، دیوار، میری چالیسواں سال گرہ کا ذکر بہترین انشائیوں میں ہوتا ہے۔ مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے اردو انشائیہ میں طنز و مزاح اور ظرافت کی حلاوت نے اس صنف کو مزید دلکش بنا دیا ہے اسی لیے انشائیوں کے قارئین کی تعداد دوسری اصناف نثر کے بالمقابل زیادہ ہے۔

15.3.1 سرگرمی آؤ اپنی پیش رفت جانچیں۔

عزیز طلبا و طالبات! آپ ایک لمحے کے لیے رکیں اب جبکہ آپ نے انشائیہ کی خصوصیات، اردو انشائیہ میں طنز و مزاح کے عناصر، اور انشائیہ میں طنز و مزاح کی روایت پڑھ لیا ہے تو نیچے دی گئی مشق کو حل کرنے کی کوشش کریں اور صحیح یا غلط کا نشان لگائیں۔

1۔ انشائیہ کی اہم خصوصیات شگفتگی اور لطافت ہے۔ ( )

2۔ انشائیہ میں طنز و مزاح کے عناصر نہیں پائے جاتے ہیں۔ ( )

3۔ جنون لطیفہ مشتاق یوسفی کا انشائیہ ہے۔ ( )

4۔ انشائیہ انگریزی زبان کے Essay یا Light Essay کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ( )

5۔ ''کتے'' رشید احمد صدیقی کا انشائیہ ہے۔ ( )

15.4 عمومی جائزہ

اردو کی غیر افسانوی نثر میں انشائیہ کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ انشائیہ میں جب طنز و مزاح اور ظرافت کی آمیزش ہو جاتی ہے تو انشائیہ کا قاری انشائیہ میں صرف فکری بالیدگی کا متمنی نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ انشائیہ پڑھ کر فرحت و انبساط محسوس کرتا ہے اور کبھی کبھی یہ طنز اصلاح معاشرہ کی دعوت دیتا ہے اور انشائیہ نگار سماجی و اخلاقی خامیوں پر تنقید بھی کرتا ہے اور انشائیہ میں طنز و مزاح کے اہم عناصر ہیں۔ طنز و مزاح کے بغیر انشائیہ میں شگفتگی اور بے ساختگی کا پایا جانا مشکل ہے اور طنز و مزاح کی وساطت سے مصنف کو یہ آزادی حاصل ہوتی کہ وہ اصلاح معاشرہ کی خاطر سماج کی اخلاقی کمزوریوں کو نشانہ بنائے۔ انشائیہ کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں مصنف اپنی ذات کا اظہار اور اپنے تجربات کا اظہار بے باکی سے کرتا ہے۔ کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ مضمون اور انشائیہ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ انشائیہ میں ذاتی مشاہدات و تجربات کا دخل ہوتا ہے اور اس کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور جب وہ اپنی ذاتی خامیوں اور روزمرہ کے حالات مزاحیہ پیرائے میں پیش کرتا ہے۔ انشائیہ میں زبان و بیان اور اسلوب کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ زبان و بیان کی شیرینی و لطافت ہی قاری کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرتی ہے۔ اس لیے اچھا انشائیہ نگار زبان و بیان اور اسلوب پر اچھی قدرت رکھتا ہے اور اپنی فکری بالیدگی سے انشائیہ کو گنجینۂ معنی کا طلسم قرار دیتا ہے اور اچھے انشائیہ نگار کے مطمح

نظر کو ایک باذوق اور دور اندیش قاری ہی بھانپ سکتا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے بجا فرمایا ہے:

''انشائیہ تو بڑی ذہنی پختگی اور تہذیب کے رچاؤ کا طلب گار ہے موضوعین سے یہ صنف شروع ہوئی، اور اس کی نکتہ رسی اور ذہن کی پختگی میں کلام نہیں.....انشائیہ نگار مزاح سے کام لیتا ہے مگر ضروری نہیں کہ وہ مزاح نگار بھی ہو۔''

(پروفیسر محمد حسنین، انشائیہ اور انشائیے، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2014، ص12)

مختصر طور پر یہ کہہ سکتے ہیں انشائیہ نثری ادب کی وہ صنف ہے جس پر طبع آزمائی کرنا بہت آسان کام نہیں ہے۔ اردو میں انشائیہ کے ابتدائی نقوش انیسویں صدی میں تلاش کیے جاتے ہیں لیکن انشائیہ نے اپنا ارتقائی سفر بیسویں صدی میں قائم کیا ہے۔ رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، مشتاق یوسفی، مشفق خواجہ وغیرہ نے اس میں مزاح کا عنصر شامل کر کے اسے بام عروج پر پہنچایا۔

15.5 فرہنگ

1۔ انشائیہ	:	انگریزی لفظ ایسے کا مترادف، مضمون
2۔ ظرافت	:	دل لگی، خوش طبعی، تمسخر
3۔ طنز	:	طعنہ، چوٹ آوازہ
4۔ طرب	:	خوشی، انبساط
5۔ مزاج	:	طبیعت، سرشت، خمیر
6۔ مزاح	:	ظرافت، مذاق، ہنسی
7۔ قاری	:	پڑھنے والا
8۔ ارتقا	:	سلسلے وار ترقی
9۔ تنوع	:	طرح طرح قسم قسم ہونا
10۔ انفرادیت	:	ذاتی خصوصیت میں دوسروں سے الگ ہونا
11۔ تکمیل	:	مکمل ہونا

12۔ اساس : جڑ، بنیاد

13۔ طلسم : جادو

14۔ عنصر : جز، حصہ

15۔ نبرد آزما ہونا : مقابلہ، بحث، سامنا

16۔ چابکدستی : تیز دستی

17۔ تسلسل : روانی

18۔ باضابطہ : حسب دستور

15.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

طویل سوالات

1۔ انشائیہ کی تعریف اور اس کی خصوصیات بیان کیجئے۔

2۔ اردو انشائیے میں طنز و مزاح کی روایت کا جائزہ لیجئے۔

3۔ اردو انشائیہ میں طنز و مزاح کے عناصر سے بحث کیجئے۔

4۔ اردو کے کسی ایک نمائندہ انشائیہ نگار کی خدمات کا جائزہ لیجئے۔

مختصر سوالات

1۔ انشائیہ کا مفہوم واضح کیجئے۔

2۔ ظرافت کا مفہوم واضح کیجئے۔

3۔ طنز و مزاح میں فرق واضح کیجئے۔

4۔ اردو انشائیہ پر طنز و مزاح کے اثرات کا جائزہ لیجئے۔

15.7 مشقی سوالات

1۔ انشائیہ کی مختصر تعریف کیجئے؟

2۔ حسن نظامی نے کن موضوعات پر انشائیے لکھے؟

3۔ طنز و مزاح کا لغوی و اصطلاحی معنی بیان کیجئے۔

15.7 مشقی سوالات کے جوابات

1۔ انشائیہ انگریزی زبان کے لفظ "Essay" یا "Light Essay" کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ انشائیہ کو ذہنی ترنگ بھی کہا جاتا ہے۔ فنی اعتبار سے انشائیہ موضوعی اور داخلی صنف ہے۔ انشائیہ میں اشیاء اور مظاہر کی خارجی سطح کو پیش کرنے کے بجائے اس کے بطون کو کھنگالنا ہوتا ہے۔

2۔ حسن نظامی کے انشائیے میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔ ان کے انشائیوں میں شگفتگی اور فلسفیانہ رنگ بھی ہے۔ انہوں نے متعدد موضوعات پر خامہ فرسائی کی اور انہوں نے بہت سے چھوٹے چھوٹے موضوعات کو اپنے انشائیوں کا موضوع بنایا۔ مثال کے طور پر مکھی، دیا سلائی، لالٹین وغیرہ۔

3۔ طنز انگریزی لفظ "Satire" کے مترادف ہے اور Irony کے لیے بھی بسا اوقات طنز یا طنز ملیح کی اصطلاح ہوتی ہے اور مزاح کے لیے Humour کا لفظ مترادف کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ طنز کا مقصد انسانی زندگی کی افراط و تفریط ہے جبکہ مزاح کا مقصد تفریح طبع ہے۔

15.9 امدادی کُتب Books Prescribe

۱۔ انتخاب اُردو نثر (1857 1920ء) ایجوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ۔

۲۔ انتخاب اُردو نثر 1920 کے بعد ای جوکیشن بک ہ ہاؤس علی گڑھ

Books Recommended.

۱۔ مختصر تاریخ ادب اُردو۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین ترجمہ و اضافے ڈاکٹر سید محمد عقیل

۲۔	اُردو ادب میں طنز و مزاح۔	ڈاکٹر وزیر آغا
۳۔	اُردو ادب میں طنز و مزاح۔	غلام احمد فرقت کاکوروی
۴۔	رشید احمد صدیقی۔ شخصیت اور فن۔	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
۵۔	اُردو انشائیہ۔	وزیر آغا
۶۔	انشائیہ کے فنی سروکار۔	ڈاکٹر احمد امتیاز
۷۔	انشائیہ کی بنیاد۔	ڈاکٹر سلیم اختر
۸۔	فنِ انشائیہ اور انشائیے۔	ڈاکٹر فرحت شمیم
۹۔	انشائیہ کے خدوخال	وزیر آغا
۱۰۔	انشائیہ کی بنیاد	ڈاکٹر سلیم اختر
۱۱۔	انشائیہ اردو ادب میں	ڈاکٹر انور سدید
۱۲۔	انشائیہ	ڈاکٹر آدم شیخ
۱۳۔	ڈپٹی نذیر احمد احوال و آثار	محمد اکرام چغتائی
۱۴۔	مولوی نذیر احمد احوال و آثار	ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی
۱۵۔	لکچروں کا مجموعہ (مرتبہ)	محمد نذیر حسین
۱۶۔	نذیر احمد	نور الحسن نقوی
۱۷۔	فکر و نظر (ڈپٹی نذیر احمد نمبر) علی گڑھ	
۱۸۔	خواجہ حسن نظامی: شخصیت اور ادبی خدمات	نثار احمد فاروقی
۱۹۔	خواجہ حسن نظامی کی نثر	ڈاکٹر مولا بخش
۲۰۔	خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری	سید محمد نیر رضوی
۲۱۔	خواجہ حسن نظامی کتاب نما	خصوصی شمارہ

سبق نمبر۔16 اردو انشائیہ کے ارتقا میں رشید احمد صدیقی کی خدمات

ساخت

16.0 اغراض ومقاصد

16.1 تعارف

16.2 رشید احمد صدیقی کی سوانحی کوائف

16.2.1 رشید احمد صدیقی کی مزاح نگاری

16.3 رشید احمد صدیقی کا اسلوب

16.3.1 سرگرمی آؤ اپنی معلومات جانچیں۔

16.4 عمومی جائزہ

16.5 فرہنگ

16.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

16.7 مشقی سوالات وجوابات

16.8 مشقی سوالات وجوابات

16.9 امدادی کتب

16.0 اغراض ومقاصد

عزیز متعلّم اس سبق کے مطالعے کے بعد اس قابل ہو جائیں گے کہ

رشید احمد صدیقی کے حیات وادبی خدمات سے واقف ہوسکیں گے۔

رشید احمد صدیقی کی انشائیہ نگاری سے واقف ہوسکیں گے۔

رشید احمد صدیقی کی مزاح نگاری سے واقف ہوسکیں گے۔

اردو انشائیہ نگاروں میں رشید احمد صدیقی کے مقام ومرتبے کو سمجھ سکیں گے۔

رشید احمد صدیقی کی انشائیہ نگاری کی فکری وفنی خصوصیات سے واقف ہوسکیں گے۔

16.1 تعارف

ہنسنا، ہنسانا، شوخی ظرافت انسان کی جبلت میں ہے اور انسان کو یہ فطرت کہیں کہیں اس انداز تحریر میں بھی اتر جاتی ہے۔ طنز ومزاح کی معنویت بردواہی رہی ہے مزاحیہ ادب کا مقصد صرف سننا سنانا نہیں ہے اس کا محور فکر انگریزی بھی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے بجا فرمایا ہے کہ:

''مزاح کو ہمارے یہاں عام طور پر درجہ دوم کا فن اور مزاح نگاری کو درجہ دوم کی چیز سمجھا گیا۔''

فاروقی صاحب کی یہ بات درست ہے اس لیے کی اردو ادب میں مزاح نگاروں کی تحریروں کو وہ وقعت حاصل نہیں ہوئی جس کی وہ حقدار تھیں اس کے باوجود اردو کے متعدد مزاح نگار ایسے ہیں جن کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی تاریخ تشنہ رہے گی ان مزاح نگاروں میں رشید احمد صدیقی، مشتاق یوسفی، کنہیالال کپور، فرحت اللہ بیگ، خواجہ حسن نظامی، مرزا عظیم بیگ چغتائی کا نام بے حد اہم ہے۔ ان میں رشید احمد صدیقی کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ رشید احمد صدیقی نے اردو ادب میں طنز ومزاح کی روایت مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ رشید احمد صدیقی کی تحریروں کا مطالعہ کرتے وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ صرف مزاح نگار ہی نہیں بلکہ اچھے انشائیہ نگار بھی ہیں ان کا انشائیہ ''ارہر کا کھیت'' اردو انشائیوں میں اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے انشائیوں میں سماج وماحول اور واقعات کے اثرات موجود ہیں۔ ان کی تحریروں میں میانہ روی ہے وہ نہ کسی سے بے حد متاثر ہوتے ہیں اور نہ کسی سے نفرت کرتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کی صدا بہار تحریریں اردو کے طنزیہ ومزاحیہ ادب میں بیش بہا اضافہ ہیں۔ انہوں نے مزاحیہ ادب کو ایک نئے اسلوب سے ہمکنار کیا اور ان کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ ان کا اسلوب نثر قاری کو اپنا گرویدہ بنالیتا ہے۔ اس سبق میں طلبا وطالبات رشید احمد صدیقی کی مزاح نگاری کے مختلف پہلوؤں سے آشنا ہوسکیں گے اور کوشش کی جائے گی کہ رشید احمد صدیقی کے مزاحیہ تحریروں کے فکر وفن کی تمام جہات کا احاطہ ہوسکے تاکہ طلبا اس سے استفادہ کرسکیں۔

16.2 رشید احمد صدیقی کی سوانحی کوائف

رشید احمد صدیقی (1892-1977) کے جدامجد حضرت پیر ذکریا شاہ صاحب سترھویں صدی میں تبلیغ دین کی خاطر ترکستان سے ہندوستان آئے تھے۔ محققین کا ماننا ہے کہ آغاز میں انہوں نے پنجاب میں قیام کیا تھا اس کے بعد پنجاب، دہلی اور پھر الہ آباد میں سپرد خاک ہوئے۔ رشید احمد صدیقی کے والد محترم عبدالقدیر تھے۔ ان کی والدہ بھی بہت کم گو اور نیک خاتون تھیں۔ رشید احمد صدیقی کا خاندان معاشی اعتبار سے بہت مضبوط تھا اور ان کے خاندان کا شمار متوسط طبقے کے گھرانے میں ہوتا تھا اور رشید احمد صدیقی کے تین بہنیں اور تین بھائی تھے۔ ان کے بڑے بھائی کا انتقال 1960 میں ہوا۔ رشید احمد صدیقی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کو اپنے بھائیوں میں عبدالصمد سے زیادہ محبت تھی اور یہ بھی کہا جاتا ہے رشید احمد صدیقی کے والد کے انتقال کے بعد عبدالصمد صاحب نے ان کی کفالت کی اور تعلیم کی اہمیت کے پیش نظر ان کو مزید تعلیم جاری رکھنے پر مضرر ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے اس تناظر میں ایک خط میں لکھا ہے کہ:

> ''آپ نے جس محبت اور عقیدت سے میرے اور اپنے مرحوم بڑے بھائیوں کو یاد فرمایا ہے اس سے جب ہم دونوں کو اتنی تسکین ملی تو ظاہر ہے خدا نے ان کی روحوں کو اپنی بخشش سے کس کس طرح نہیں نوازہ ہوگا۔''
>
> (بحوالہ: سلیمان اطہر جاوید، رشید احمد صدیق: شخصیت اور فن، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدرآباد، جون 1976، ص66)

رشید احمد صدیقی کا ایک مشترکہ خاندان تھا گھر کے تمام افراد مل جل کر رہتے تھے۔ رشید احمد صدیقی اپنے بھائیوں میں دوسرے نمبر پر تھے اور ان سے دو بھائی چھوٹے تھے جو چھوٹے تھے ان کا نام نیاز احمد تھا جو محمد حسن کالج جونپور کے پرنسپل تھے اور سب سے چھوٹا بھائی نذیر احمد کا انتقال دس بارہ برس کی عمر میں ہوگیا تھا۔ رشید احمد صدیقی 25 دسمبر 1894 کو بلیا میں پیدا ہوئے اور اکثر محققین کا ماننا ہے کہ ان کی تاریخ پیدائش 25 دسمبر 1894 ہے۔ رشید احمد صدیقی کا گھرانہ بھی مشرقی ذہنیت کا حامل تھا۔ رشید احمد صدیقی کی ابتدائی تعلیم جونپور اور اعظم گڑھ میں ہوئی۔ انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔اے، ایل۔ایل۔بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اور اسی یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ ہوگئے اور اردو ادب میں انہوں نے ایک منفرد شناخت قائم کی۔ مزید برآں بہت سی کتابیں تحریر کیں اور متعدد تنقیدی و تحقیقی مضامین سے اردو دنیا میں طنز و مزاح کے میدان میں اپنا لوہا منوایا۔ رشید احمد صدیقی کی تخلیقی و تنقیدی نگارشات بہت ہیں۔ ان کے بہت سے طنز و مزاح کے مضامین کے مجموعے ہیں جس سے ان کو شہرت دوام حاصل ہوا۔ ان کی اہم کتابوں میں طنزیات و مضحکات، خنداں، مضامین رشید، گنج ہائے گراں مایہ، آپ بیتی، اردو ادب میں اہم

مقام رکھتی ہے۔رشید احمد صدیقی کے بارے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ انہوں نے مزاح کے وقار و معیار کو اس قدر بلند کیا کہ وہ اس کے موجد اور خاتم خود ہی ہو گئے۔ یہ بات تو ان کی ادبی خدمات کے عزت واحترام میں کہی گئی تھی لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اردو میں ظرافت کو ادب عالیہ تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہر انسان کو اپنی زمین اپنے وطن اور اپنے مادر علمی سے بے پناہ محبت ہوتی ہے۔ رشید احمد کے یہاں یہ تصور کچھ زیادہ ہی پایا جاتا ہے ان کی تحریروں کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے رشید احمد صدیقی کے لیے علی گڑھ بالخصوص علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہے اور وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرستار تھے۔رشید احمد صدیقی علی گڑھ کی روشن ادبی روایت سے تاحیات منسلک رہے۔اپنے زمانے کے حالات، واقعات اور شخصیات کا ان کے مزاج پر گہرا اثر ہوا اس لیے ان کے مضامین ان کے مزاج اور رکھ رکھاؤ کے چغلی کھاتے ہیں۔ پروفیسر محمد حسن لکھتے ہیں:

''رشید احمد صدیقی اب ہم میں نہیں ہیں مگر ان کی تحریریں آج بھی ان کی یاد دلانے کے لیے کافی ہیں یہ تحریریں نصف صدی کا قصہ سناتی ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت کا اور اس دوران جو کچھ تہذیب و تاریخ پر گزری ہے یا تہذیب و تاریخ جو ہم پر گزاری ہے اس کا احوال جستہ جستہ بیان کرتی ہیں اس اعتبار سے فیض کے لفظوں میں ان کی نوعیت کچھ اس طرح کی ہے:

جو ہم پر گزری سو گزری پر اے شبِ ہجراں
ہمارے اشک تیری عاقبت سنوار چلے''

(پروفیسر عبدالحق (مرتب)، رشید احمد صدیقی افکار و اسالیب، ثمر آفسیٹ پریس، دہلی، جنوری 1998، ص 18)

رشید احمد صدیقی کو متعدد اعزازات وانعامات سے بھی نوازا گیا اور انہیں 1971 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔مختصر طور پر کہہ سکتے ہیں کہ رشید احمد صدیقی کی صدا بہار تحریر اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں بیش بہا سرمایہ ہیں۔انہوں نے مزاحیہ ادب کو ایک نئے اسلوب سے ہمکنار کیا۔ پروفیسر عبدالحق نے بجا فرمایا ہے:

''رشید احمد صدیقی نے جتنے خاکے لکھے ہیں ان میں مختلف زاویوں سے اس کے اوصاف تلاش کرتے ہیں جس میں فرد کا اشرف المخلوقات ہونا ثابت ہوتا ہے۔'' (ایضاً، ص 78)

اردو خاکہ نگاری میں رشید احمد صدیقی نے اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے۔ان کے خاکوں کی سب سے نمایاں خصوصیات طنز و مزاح ہے۔

اسی ظرافت کی وجہ سے وہ دوسرے معاصرین خاکہ نگاروں سے سبقت لے جاتے ہیں۔اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ انہوں نے اپنے خاکوں میں حقیقت پسندی اور غیر جانبداری سے کام لیا ہے اور جن کرداروں کا انتخاب کیا ہے ان کی خوبیوں اور خامیوں کو چابکدستی سے پیش کیا ہے ان کو زبان و بیان پر عالمانہ قدرت حاصل ہے۔ وہ زبان و بیان اور منفرد اسلوب سے قاری کو اپنا گرویدہ بناتے ہیں اسی لیے آپ کا نام غیر افسانوی نثر بالخصوص طنز و مزاح کے میدان میں روز روشن کی طرح عیاں ہے اور اردو ادب کی تاریخ آپ کی علمی و ادبی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی ہے۔

16.2.1 رشید احمد صدیقی کی مزاح نگاری

اردو ادب میں طنز و مزاح کے ابتدائی نقوش جعفر زٹلی (1713) کے مزاحیہ اشعار میں ملتے ہیں اکثر محققین کا خیال یہ بھی ہے کہ جعفر زٹلی سے قبل امیر خسرو کے یہاں بھی طنز و مزاح کے نمونے ملتے ہیں اور اٹھارہویں صدی میں درجنوں شہر آشوب لکھے گئے جس میں طنز و مزاح کی وساطت سے اس دور کی ریشہ دوانیوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ رشید احمد صدیقی کا خیال یہ ہے کہ با قاعدہ طور پر اردو ادب میں طنز و مزاح کی داغ بیل غالب نے ڈالی اور اردو نثر میں غالب کے مکاتیب اس کی روشن مثال ہیں اردو نثر میں طنز و مزاح کی بنیاد کو مستحکم کرنے میں غالب نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اودھ پنچ کی تحریروں اور فسانہ آزاد سے طنز و مزاح کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ فسانہ آزاد کا ''خوجی'' اس کا بین ثبوت ہے۔ علاوہ بریں اردو ادب میں کچھ مزاح نگار ایسے ہیں جن ادبا نے طنز و مزاح کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنایا ہے ان مزاح نگاروں میں سب سے اہم نام رشید احمد صدیقی کا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے بارے میں یہ بات بہت وثوق سے کہی جاتی ہے کہ علی گڑھ نے ان کی مزاح کو مواد فراہم کیا جس کی وساطت سے انہوں نے اپنے فن کا جوہر دکھایا۔ رشید احمد صدیقی تا حیات علی گڑھ کو دنیا کی سب سے اچھی جگہ تسلیم کیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں علی گڑھ کی تہذیب و معاشرت سے گہرا لگاؤ تھا۔ اور ان کی تحریروں میں علی گڑھ کی چھاپ کا در آنا ہمارے خیال سے کوئی معیوب نہیں ہے اور ان کی تحریریں علی گڑھ کی سرحدوں تک محدود ہونے کے باوجود ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی عکاس ہیں۔ خواجہ محمد اکرام الدین نے ان کے اسلوب کے تشکیلی عناصر کے تعلق سے لکھا ہے کہ:

> ''(1) آبائی وطن اور جون پور کی تہذیب و معاشرت (2) رشید احمد صدیقی کا گھریلو ماحول (3) عدالتی ماحول کا اثر
> (4) علی گڑھ کی اقامتی زندگی اور درس و تدریس کی انجام دہی (5) معتقدین اور مغربی ادبا کے تحریروں کے

اثرات۔''

(خواجہ محمد اکرام الدین، رشید احمد صدیقی کے اسلوب کا تجزیاتی مطالعہ، تخلیق کار پبلیشرز، دریا گنج، دہلی 1994، ص 141)

رشید احمد صدیقی کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین ان کی پرمغز تنقیدیں اور ان کی مرقع نگاری کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اس امر کی طرف اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تخلیقات کی تفہیم آسان نہیں ہے۔ ایک تربیت یافتہ ذہن کی ضرورت ہے۔ رشید احمد صدیقی نے طنز ومزاح کے دو مجموعوں، مضامین رشید اور خنداں بہت اہم ہیں ان کے علاوہ بہت سے مضامین اور مقالات اخبارات ورسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ''مضامین رشید'' اور ''خنداں'' کے مطالعہ سے رشید احمد صدیقی کی تخلیقی صلاحیت اور شعور کی پختگی کا پتا چلتا ہے اور جب ہم خنداں کا مطالعہ کرتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ رشید احمد صدیقی کو خدا نے بے پناہ وسعت فکر عطا کیا تھا۔ ان کے ندرت فکر اور طنز ومزاح کا ٹھہراؤ اور زبان وبیان کی شیرینی اور متنوع موضوعات قاری کو احساس دلاتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے اپنے انشائیوں میں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سمیٹنے کی سعی کی ہے اور وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کی فکر کی بلندی، اور ذہنی بالیدگی اور وسعت نظر نے قاری کو حیران وپریشان کر دیا ہے اور وہ اپنے مخصوص ذہنی سطح سے کبھی مصالحت نہیں کرتے ہیں۔ نقادوں کا ماننا ہے کہ ان کے یہاں عام قاری کو تسکین ذوق کا سامان کم کم ملتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے فکر کی بلندی سے سمجھوتہ نہیں کرتے ہیں۔ پروفیسر عبدالحق اس تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''رشید احمد صدیقی کے قائم کردہ کچھ ثقافتی معیار ہیں ان کے علاوہ کسی دوسرے ادیب نے اقدار شناسی کے اتنے میزان فراہم نہیں کیے انہوں نے ایک منہاج متعین کیا ہے کہ کسی فرد کی عظمت کا مدار برگزیدہ اشخاص سے اس کے فکری رویے یا روابط سے قائم ہے اور اسی سے اس کی شناخت ہوتی ہے۔''
>
> (پروفیسر عبدالحق، رشید احمد صدیقی کا ثقافتی منظر نامہ، اصیلا پریس دریا گنج، نئی دہلی، 2010، ص 11)

رشید احمد صدیقی کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ گوشہ نشینی اختیار کیے ہوئے تھے اس کے باوجود وہ علی گڑھ کی چہار دیواری کے باہر کی سیاسی وسماجی اور تہذیبی زندگی پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو نہایت چابکدستی سے بیان کیا ہے وہ ہندوستان کی سیاسی صورت حال سے بے خبر نہ تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

> ''جس طرح ہندوستان پر حکومت کرنے کے لیے ایک قوم بنائی گئی ہے اسی طرح گواہ بننے کی صلاحیت ایک طبقہ

خاص میں پائی جاتی ہے یعنی پٹواری جس کو گاؤں کا غیر متشدد آمیز آمر (ڈکٹیٹر) کہنا بجا ہوگا۔ انگریز کیک کھاتا ہے اور غراتا ہے اور پٹواری گالی کھاتا ہے اور نذرانے لیتا ہے اور جو چاہتا ہے درج رجسٹر کرتا رہتا ہے اس کو گاؤں میں وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے جو وکیلوں کو عدالت یا کلرکوں کو دفتر میں ہوتی ہے یعنی سب جو چاہیں کر سکتے ہیں۔''

(مضامین رشید، رشید احمد صدیقی، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، 1997، ص116)

رشید احمد صدیقی کے مزاح نگاری کی مشکل پسندی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وزیر آغا نے لکھا ہے کہ:

''رشید احمد صدیقی کی طنز کو استعاروں، علامتوں اور مبہم اشاروں کے اتنے نقاب پہنا دیے ہیں کہ صرف وہی لوگ جنہیں اس ماحول کی معطر تنہائی تک رسائی حاصل ہے اس سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں پھر ان کے ذاتی مراسم سے پیدا ہونے والے تیز نکیلے نکات تو یقیناً ان کے طنز کے دائرے کو اور بھی محدود کر دیتے ہیں۔''

(وزیر آغا، اردو ادب میں طنز و مزاح، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2014، ص35-234)

رشید احمد صدیقی کی طنز و مزاح کی اپنی انفرادیت ہے انہوں نے اپنے زمانے کے قریبی مشاہدات، شخصیات اور کرداروں پر بھی توجہ صرف کی ہے۔ وزیر آغا کے بقول ان کے یہاں خیال اور کردار سے بھی طنز پیدا ہوئی ہے''

رشید احمد صدیقی کی نمایاں خوبی یہ ہے انہوں نے کچھ ایسے موضوعات قلم بند کر دیئے جس سے طنز و مزاح سے دلچسپی رکھنے والا قاری اس پر گرویدہ ہو جاتا ہے۔ وہ ماحول کی عکاسی اور لفظی بازی گری سے قاری کا دل جیت لیتے ہیں۔ اس کی مثال ''ارہر کا کھیت'' اور ''چارپائی'' میں موجود ہیں۔ مختصر طور پر کہہ سکتے ہیں رشید احمد صدیقی نے طنز و مزاح کے وساطت سے اردو نثر کے دائرے کو وسیع کیا ہے اور ان کے نثری کارناموں پر اردو کا ہر قاری فخر کر سکتا ہے۔

16.3 رشید احمد صدیقی کا اسلوب

کسی بھی زبان کے ادب کا معیار اس کی زبان و بیان اور اسلوب سے طے کیا جاتا ہے۔ یہ ایسا آلہ ہے جو ہر صنف ادب پر صادق آتا ہے۔ اسلوب کے ذریعہ مصنف کی شناخت قائم ہوتی ہے اور زبان و اسلوب کو منظّم طریقے سے پیش کر کے قاری کی توجہ مرکوز کی جا سکتی ہے۔ طنز و مزاح اور ظرافت میں اسلوب کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے اور معمولی ظرافت الفاظ کے الٹ پھیر سے پیدا کی جا سکتی ہے۔ مزاح کو پیش

کرنے کے مختلف طریقہ کار ہوتے ہیں اور یہ مزاح نگار پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کس طریقہ کار اور اسلوب کا انتخاب کرتا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ:

''معمولی ظرافت الفاظ سے پیدا کی جاتی ہے۔ اعلیٰ ظرافت کے لیے خیال کی ندرت ضروری ہے بات کرنے کے لیے تین طریقے ممکن ہیں۔ ایک بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا اسے ہلکا کر کے دکھانا دونوں طریقے مشہور مزاح نگاروں نے استعمال کیے ہیں بڑے مزاح نگاروں نے تیسرا یعنی صاف صاف بات کہنے کا طریقہ بھی بتایا ہے۔''

(بحوالہ: خواجہ اکرام الدین، رشید احمد صدیقی کے اسلوب کا تجزیاتی مطالعہ، تخلیق کار پبلشرز، دریا گنج، نئی دہلی، ص 23)

رشید احمد صدیقی نے اپنے مضامین میں مزاح پیدا کرنے کے لیے متعدد طریقے اپنائے ہیں۔ مصباح الحسن قیصر کے حوالے سے خواجہ اکرام الدین نے لکھا ہے مزاح پانچ چیزوں سے پیدا ہوتا۔

1۔ احساس برتری

2۔ ناپسندیدگی

3۔ تمسخر

4۔ دعوت غور و فکر

5۔ جذبہ ہمدردی ہے

رشید احمد صدیقی کے طنز و مزاح میں جو دلکشی ہے وہ ان کے اسلوب کی انفرادیت کی بنا پر ہے۔ نقادوں کا ماننا ہے کہ غالب اور رشید احمد صدیقی میں ذہنی ہم آہنگی کا اندازہ ان کے اسلوب نگارش سے ہوتا ہے اور رشید احمد صدیقی غالب سے بہت زیادہ متاثر تھے، رشید احمد صدیقی کے مضامین کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ رشید احمد صدیقی کی طرز نگارش میں کفایت لفظی، چھوٹے چھوٹے جملے اور فقرے نہایت روانی اور برجستگی کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کے اسلوب نثر میں تخلیقی نثر کی متعدد خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ پروفیسر سلمان اطہر جاوید نے رشید احمد صدیقی کے اسلوب بیان میں ندرت اور شگفتگی کی وکالت کی ہے ان کا ماننا ہے کہ رشید صاحب ''فعل'' کے استعمال سے اپنے اسلوب میں ندرت پیدا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''غش کھانا اور زہر کھانا میں ایک ہی ''فعل'' کے استعمال سے اپنے اسلوب میں بانکپن پیدا کر دیا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے انشائیے میں دلکشی و لطافت ان کی شگفتگی سے ہے۔ ان کے دلچسپ جملے کی ترتیب اور سلیقہ ہی ان کو بڑا مزاح نگار بناتی ہے۔

رشید احمد صدیقی اپنے مزاحیہ مضامین میں اردو اور فارسی کے اشعار برجستہ استعمال کرتے ہیں۔کبھی ایک مصرع یا کبھی شعر میں ایک ٹکڑا لے کر اپنے اسلوب کے دھار کو مزید تیز کر دیتے ہیں۔مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ رشید احمد صدیقی نے اپنے دلکش اسلوب سے اپنی جگہ مسلم کر لی ہے۔دلچسپ جملوں، معنی خیز الفاظ، اور جملوں کی بہترین ساخت و ترتیب ان کے مزاح نگاری کے اسلوب کا اٹوٹ حصہ ہے۔انہیں زبان و بیان اور اسلوب پر مکمل دسترس حاصل ہے اور جملوں کی ساخت سے اسلوب میں دلکشی پیدا کرنے کا ہنر ان کی کامیابی کا بین ثبوت ہے۔ رشید احمد صدیقی اردو مزاحیہ نثر میں اپنے اسلوب و فن کے اعتبار سے اعلیٰ مقام کے حامل ہیں۔

16.3.1 سرگرمی- صحیح یا غلط

عزیز طلبا و طالبات! آیئے ایک لمحے کے لیے رکیں اب جبکہ آپ نے رشید احمد صدیقی کی سوانحی کوائف اور رشید احمد صدیقی کے انشائیوں میں طنز و مزاح کے عناصر اور ان کے مزاحیہ اسلوب کو پڑھ لیا ہے تو نیچے دی گئی مشق کو حل کرنے کی کوشش کریں اور صحیح یا غلط کا نشان لگائیں۔

1۔ رشید احمد صدیقی کا آبائی وطن جونپور تھا۔ ( )

2۔ ''ارہر کا کھیت'' پطرس بخاری کا انشائیہ ہے۔ ( )

3۔ رشید احمد صدیقی نے اپنی زندگی میں ایک بھی خاکہ نہیں لکھا ہے۔ ( )

4۔ ''مضامین رشید'' اور ''خنداں'' کے مطالعہ سے رشید احمد صدیقی کی تخلیقی صلاحیت کا پتا چلتا ہے۔ ( )

5۔ رشید احمد صدیقی کبھی کبھی الفاظ کے الٹ پھیر سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ( )

16.4 عمومی جائزہ

رشید احمد صدیقی کی ادبی شخصیت کے مختلف جہات ہیں۔وہ محقق، مدیر، مبصر، خاکہ نگار، انشائیہ نگار کے ساتھ ایک اہم مزاح نگار بھی ہیں۔تعلیم کے میدان میں انہوں نے کارہائے نمایاں انجام دیا ہے۔وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے منسلک ہوئے اور یہاں بھی انہوں نے بڑی مستعدی اور ایمانداری سے اپنی ذمہ داریوں کو نبھایا۔''ارہر کا کھیت''، ''خنداں'' جیسی تخلیقات ان کی مزاح نگاری کا بین ثبوت ہے۔طنز و مزاح

نگاری میں ان کا اپنا منفرد اسلوب ہے۔ الفاظ اور اشعار، محاوروں کی فنی معنوی جہات سے مزاح اور طنز پیدا کیا، رشید احمد صدیقی کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ سیاست، معیشت اور کلچر کے باہمی رشتوں پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی چہار دیواری میں رہ کر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ رشید احمد صدیقی نے جس موضوع پر قلم اٹھایا قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ موضوع صرف ان ہی کے لیے تھا۔ رشید احمد صدیقی کو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی اور ان کے بیان میں جو دلکشی ہے وہ ان کے اسلوب کا خاصہ ہے ان کے مزاحیہ مضامین صرف دعوت فکر نہیں دیتے ہیں بلکہ مسرت بہم بھی پہنچاتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے مزاح کے وقار و معیار کو اس قدر بلند کیا کہ وہ اس کے موجد اور خاتم خود ہی ہو گئے اور مضامین رشید میں شامل مضامین کے حوالے سے نقادوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ مضامین کلاسیکی ادب میں شامل ہونے کے لائق ہیں۔ رشید احمد صدیقی کا اسلوب بہت دلکش ہے ان کی مطبوعات اور تصانیف میں مضامین رشید، گنج گرانمایہ، ہم نفسان رفتہ، آشفتہ بیانی میری، شیخ نیازی اور ذاکر صاحب کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے ان کے مضامین میں ارہر کا کھیت، چارپائی، مرشد، گھاگھ اور کندن کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ رشید احمد صدیقی کسی بھی مزاحیہ مضمون کا آغاز اس طرح کرتے ہیں کہ قاری پورا مضمون پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ صرف مزاح نگار نہیں ہیں بلکہ ان کے یہاں ہمدردی اور دردمندی کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ وہ صرف تماشائی نہیں ہیں انہوں نے سماج و معاشرے کے ماحول اور واقعات کے اثرات کو قبول کیا۔ رشید احمد صدیقی اپنی فکر کی بلندی، اپنے دلکش اور منفرد اسلوب کی وجہ سے اپنے معاصرین میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔

16.5 فرہنگ

1۔ ارتقا : سلسلے وار ترقی

2۔ قاری : پڑھنے والا

3۔ شارح : کھول کر بیان کرنے والا

4۔ تنوع : طرح طرح قسم قسم

5۔ ارفع : بلند

6۔ تمدن : طرز معاشرت

7۔ کلید : کنجی

8۔ دلکش : جاذب نظر

9۔ اسلوب : طریقہ کار

10۔ غیر معمولی : خلافِ دستور

16.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

طویل سوالات

1۔ رشید احمد صدیقی کی ابتدائی زندگی کے حالات بیان کیجئے۔

2۔ رشید احمد صدیقی کے انشائیوں میں طنز و مزاح کے عناصر کی نشاندہی کیجئے۔

3۔ اردو مزاح نگاروں میں رشید احمد صدیقی کا مقام متعین کیجئے۔

4۔ رشید احمد صدیقی کی مزاح نگاری کے اسلوب سے بحث کیجئے۔

مختصر سوالات

1۔ ''ارہر کا کھیت'' کا خلاصہ لکھیے۔

2۔ رشید احمد صدیقی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو سب سے بہترین جگہ کیوں کہا؟ اظہار خیال کیجئے۔

3۔ رشید احمد صدیقی کے انشائیہ ''چارپائی'' کا خلاصہ لکھیے۔

4۔ طنز و مزاح میں فرق واضح کیجئے۔

16.7 مشقی سوالات و جوابات

سوالات

1۔ رشید احمد صدیقی کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی اور کس یونیورسٹی سے وابستہ تھے؟

2۔ رشید احمد صدیقی کی چار مشہور تصانیف کے نام بتائیں؟

3۔ رشید احمد صدیقی کے اسلوب کے تشکیلی عناصر بیان کیجئے؟

16.8 مشقی سوالات کے جوابات

1۔ رشید احمد صدیقی 25 دسمبر 1894 کو بلیا (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ان کا گھرانہ بھی مشرقی ذہنیت کا حامل تھا اور وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ تھے۔

2۔ رشید احمد صدیقی کی چار مشہور تصانیف میں خنداں، گنج ہائے گرانمایہ، مضامین رشید اور آشفتہ بیانی میری شامل ہیں۔

3۔ رشید احمد صدیقی کے اسلوب کی تشکیلی عناصر مندرجہ ذیل ہیں:

(i) آبائی وطن اور جون پور کی تہذیب و معاشرت

(ii) رشید احمد صدیقی کا گھریلو ماحول

(iii) عدالتی ماحول کا اثر

(iv) علی گڑھ کی اقامتی زندگی اور درس و تدریس کی انجام دہی

(v) متقدمین اور مغربی ادبا کے تحریروں کے اثرات

16.9 امدادی کُتب Books Prescribe

۱۔ انتخاب اُردو نثر 1857 1920ء ایجوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ۔

۲۔ انتخاب اُردو نثر 1920 کے بعد ای جوکیشن بک ہ ہاؤس علی گڑھ

Books Recommended.

۱۔ مختصر تاریخ ادب اُردو۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین ترجمہ و اضافے	ڈاکٹر سید محمد عقیل
۲۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح۔	ڈاکٹر وزیر آغا
۳۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح۔	غلام احمد فرقت کاکوروی
۴۔ رشید احمد صدیقی۔ شخصیت اور فن۔	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

۵۔	اُردو انشائیہ۔	وزیر آغا
۶۔	انشائیہ کے فنی سروکار۔	ڈاکٹر احمد امتیاز
۷۔	انشائیہ کی بنیاد۔	ڈاکٹر سلیم اختر
۸۔	فنِ انشائیہ اور انشائیے۔	ڈاکٹر فرحت شمیم
۹۔	انشائیہ کے خدوخال	وزیر آغا
۱۰۔	انشائیہ کی بنیاد	ڈاکٹر سلیم اختر
۱۱۔	انشائیہ اردو ادب میں	ڈاکٹر انور سدید
۱۲۔	انشائیہ	ڈاکٹر آدم شیخ
۱۳۔	ڈپٹی نذیر احمد احوال و آثار	محمد اکرام چغتائی
۱۴۔	مولوی نذیر احمد احوال و آثار	ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی
۱۵۔	لکچروں کا مجموعہ (مرتبہ)	محمد نذیر حسین
۱۶۔	نذیر احمد	نور الحسن نقوی
۱۷۔	فکر و نظر (ڈپٹی نذیر احمد نمبر) علی گڑھ	
۱۸۔	خواجہ حسن نظامی: شخصیت اور ادبی خدمات	نثار احمد فاروقی
۱۹۔	خواجہ حسن نظامی کی نثر	ڈاکٹر مولا بخش
۲۰۔	خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری	سید محمد نیر رضوی
۲۱۔	خواجہ حسن نظامی کتاب نما	خصوصی شمارہ

سبق نمبر 17۔ پطرس بخاری کے انشائیوں میں طنز و مزاح

ساخت

17.0 اغراض و مقاصد

17.1 تعارف

17.2 پطرس بخاری کا تعارف

17.2.1 پطرس بخاری انشائیہ نگاری میں طنز و مزاح

17.3 پطرس کا اسلوب

17.3.1 سرگرمی آؤ اپنی معلومات جانچیں۔

17.4 عمومی جائزہ

17.5 فرہنگ

17.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

17.7 مشقی سوالات

17.8 مشقی سوالات کے جواب

1.10 امدادی کتب

17.0 اغراض و مقاصد

عزیز متعلم اس سبق کے مطالعے کے بعد اس قابل ہو جائیں گے کہ

پطرس بخاری کی حیات وادبی خدمات سے واقف ہوسکیں گے۔

پطرس بخاری کے انشائیہ نگاری سے واقف ہوسکیں گے۔

پطرس کے مزاحیہ اسلوب سے واقف ہوسکیں گے۔

پطرس بخاری کی مزاح نگاری کی خصوصیات سے واقف ہوسکیں گے۔

اردوانشائیہ نگاری میں پطرس بخاری کا مقام متعین کرسکیں گے۔

17.1 تعارف

اردو میں انشائیہ نگاری بہت مشکل فن ہے اور بہت دلچسپ بھی ہے۔اس صنف پر طبع آزمائی کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔انشائیہ نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے میں پطرس بخاری کا اہم نام ہے۔ان کا شمار ادب کے بہترین مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔پطرس بخاری بڑے باغ وبہار قسم کے آدمی تھے۔روشن خیالی، بے باکی اور وسیع النظری ان کے مزاح اور کردار کے خاص جوہر تھے۔پطرس بخاری کے مضامین انشا پردازی کا بین ثبوت ہیں اور طنز ومزاح نگاری میں ان کا اپنا منفرد اسلوب ہے۔پطرس بخاری نے صرف ایک کتاب ''مضامین پطرس'' تخلیق کر کے ادبی دنیا میں اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے اور طنز ومزاح کے میدان میں پطرس نے غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔پطرس کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور ان کے انشائیوں کے مطالعے سے انکشاف ہوتا ہے کہ انہوں نے بہتر مضامین استفہامیہ کے پیرائے میں لکھا ہے۔اس سبق کے مطالعہ سے طلبا وطالبات کو یہ اندازہ ہوجائے گا کہ پطرس بخاری نے اردو انشائیہ نگاری میں طنز ومزاح کے عناصر کو شامل کر کے اسے بہت دلچسپ بنا دیا ہے۔

17.2 پطرس بخاری کا تعارف

اردو کے مزاح نگاروں میں پطرس بخاری کا ایک اہم نام ہے۔پطرس نے ہمارے خیال میں سب سے کم مضامین لکھکر بہت زیادہ شہرت حاصل کی۔اردو میں مزاح نگاری کے میدان میں اتنا کم لکھنے کے بعد کسی اور تخلیق کار کو اس طرح کی شہرت نصیب نہ ہوئی۔پطرس بخاری کی ولادت یکم اکتوبر 1998 میں پشاور میں ہوئی۔آپ کا مکمل نام پیر سید احمد شاہ بخاری تھا۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پطرس لفظ ''پیر'' کو اپنے نام کے ساتھ منسلک نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن جب وہ گورنمنٹ ہائی اسکول پشاور میں وہ ''پیر'' کے نام سے جانے جانے لگے اور ان کے ہیڈ ماسٹر بھی ان کو ''پیر'' کے نام سے بلاتے تھے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پطرس کا خاندانی نام ''بخاری'' کیسے ہوا۔اس کی وجہ یہ تھی پطرس کے والد صاحب کا اسم

گرامی سید اسد اللہ شاہ بخاری تھا اس مناسبت سے ان کا نام بخاری پڑ گیا اور پطرس کے دادا کشمیر سے ہجرت کر کے پشاور گئے تھے اور پطرس کے تین بھائی تھے جن کا نام سید غالب بخاری، سید محمد شاہ رفعت بخاری اور سید ذوالفقار شاہ بخاری تھا لیکن ان کے گھریلو میہ سامنے آیا کہ ان کی والدہ کا انتقال ان کے کم سنی میں ہو گیا تھا لیکن ان کے والد نے اکیلے اپنے طور پر بچوں کی تعلیم و تربیت دینے کی سعی کی۔ پطرس بخاری اپنے بھائیوں میں زیادہ ذہین، روشن دماغ اور منکسر المزاج تھے۔ ان کی ادب سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ پطرس بخاری کی ابتدائی تعلیم اس زمانے کی روایت کے پیش نظر دی گئی لیکن ان کو ادب سے بہت دلچسپی تھی انہوں نے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ فارسی اور قواعد اور ادب کا مطالعہ گھر پر ہی کیا اور اسی مطالعہ سے ان کے علم میں مزید وسعت آئی اور انہوں نے اسکول کی تعلیم کے دوران تمام طلبا میں اپنی ایک الگ پہچان قائم کر لی تھی اور انہوں نے 1912 میں میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا اور گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔اے میں داخلہ لیا۔ یہاں بھی اور اپنے کالج کے ساتھیوں میں سب سے آگے تھے۔ پطرس کو انگریزی اور اردو زبان سے تو شغف تھا ہی اور ان دونوں زبانوں میں ید طولیٰ رکھتے تھے علاوہ بریں فارسی، پشتو اور فرانسیسی سے بھی دلچسپی تھی۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ پطرس کو سب سے زیادہ انگریزی زبان میں دسترس حاصل تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں گورنمنٹ کالج میگزین کے ''راوی'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے ان کو انگریزی کے استاد 'پیٹر وانکٹس'' سے گہری عقیدت تھی اور انہوں نے اپنا قلمی نام بھی ''پیٹر'' رکھ لیا تھا اور اسی نام سے انگریزی میں مضامین لکھتے تھے۔ پطرس نے اردو زبان اور ادب میں بھی بے پایاں خدمات انجام دی ہیں۔ اردو کے مشہور رسائل میں ان کے مضامین شائع ہوئے۔ انہوں نے طنز و مزاح، تنقید، ادب اور فنون لطیفہ پر بھی مضامین قلم بند کیا۔ پطرس کا ایک اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے لاہور میں مجلس اردو کے ذریعہ لوگوں میں ادبی ذوق پیدا کیا اور جو تخلیقات مجلس اردو میں پڑھی جاتی تھیں اس پر بحث بھی ہوتی تھی۔ 1925 میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے انگلستان کے لیے رخت سفر باندھا اور کیمبرج میں داخلہ لیا اور انگریزی ادب میں اول درجے کی سند (TRIPOS) حاصل کی۔ اور اس کے بعد وطن واپس آ گئے۔ پطرس بخاری گورنمنٹ کالج لاہور میں کئی سال تک ادبیات کے پروفیسر رہے۔ اس دوران بہت سے اہم منصب پر فائز رہے۔ پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے سکریٹری 1931 سے 1935 تک، 1937 تا 1940 ڈپٹی کنٹرولر، جنرل، علاوہ بریں 1955 میں اقوام متحدہ کے شعبہ اطلاعات و ڈپٹی سکریٹری مقرر ہوئے۔ اسی عہدے کے زمانے میں 5 دسمبر 1958 کو اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔

17.2.1 پطرس بخاری کی انشائیہ نگاری میں طنز و مزاح

اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ اردو ادب میں پطرس بخاری کی جو الگ پہچان ان کے مضامین سے ہوئی جو کتابی شکل میں ''پطرس کے مضامین'' کے نام سے شائع ہوئی۔ پطرس کا یہ ہی تخلیقی کارنامہ ان کو ادبی دنیا میں زندہ و جاوید رکھا ہے اور پطرس کے مضامین میں صرف گیارہ مضامین شامل ہیں۔ جن کے عناوین یہ ہیں: ہاسٹل میں پڑھنا، سویرے جو کل مری آنکھ کھلی، کتے، اردو کی آخری کتاب، میں ایک میاں ہوں، مرید پور کا پیر، انجام بخیر، سنیما کا عشق، ببل اور میں، مرحوم کی یاد میں، لاہور کا جغرافیہ، ان کے مضامین کی تعداد اگر چہ مختصر ہے لیکن ان کی وقعت واہمیت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ پطرس کے مضامین کے دیباچہ میں مصنف لکھتے ہیں:

> ''اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے۔ اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں۔ آپ نے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں۔''

اس کتاب میں پطرس کی دو پیروڈیاں ہیں ایک اردو کی آخری کتاب، دوسری لاہور کا جغرافیہ۔ یہ دونوں پیروڈیاں ان کے مقاصد کی ترجمان ہیں۔ پطرس کے مضامین میں شامل انشائیہ ''ہاسٹل میں پڑھنا'' ان کے دیگر مضامین سے مختلف بھی ہے اور دلچسپ انگیز بھی ہے اس میں قاری کے دل چسپی کے تمام وسائل موجود ہیں۔ انشائیہ نگار نے نہایت چابکدستی سے ہاسٹل کی زندگی اور گھر کی زندگی کا مزاحیہ انداز میں موازنہ کیا ہے جو خاص کر ان قارئین کے لیے بہت ہی اہم ہے جو ہاسٹل کی زندگی کے تجربے سے واقف ہیں۔ اور تعلیم کے لیے ہاسٹل کی زندگی کو بہتر قرار دیتے ہیں۔ پطرس کے مزاح کی ایک خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ہاسٹل میں پڑھنا، واحد متکلم کے صیغے کے ذریعہ صورت واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مصنف کا ذاتی واقعہ ہے۔ اپنے آپ پر ہنسنے اور دوسروں کو ہنسانے میں ان کو طرہ امتیاز حاصل ہے۔ پطرس کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے انشائیوں میں مزاح پیدا کر کے قاری کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ انشائیہ ''ہاسٹل میں پڑھنا'' میں باپ بیٹے کے مباحثے کو اتنی چابکدستی سے پیش کرتے ہیں کہ قاری حیران و ششدر رہ جاتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''اب کے ہم نے اسی موضوع پر لکچر دیا کہ جو شخص ہاسٹل کی زندگی سے محروم ہو اس کی شخصیت نامکمل رہ جاتی ہے۔ ہاسٹل سے باہر شخصیت پنپنے نہیں پاتی ہے..... جب ہم ڈیڑھ مہینے تک شخصیت اور ہاسٹل کی زندگی پر انحصار اور دو مضمونوں پر وقتاً فوقتاً انحصار کرتے رہے تو ایک دن والد نے پوچھا ''تمہاری شخصیت سے

آخر مطلب کیا ہے۔''

(''احمد شاہ بخاری''پطرس کے مضامین، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، 2011، ص37)

پطرس اردو انشائیہ نگاری اور طنز و مزاح کے ایک بے مثال ستون کی حیثیت رکھتے ہیں ان کے انشائیوں میں فکر کی گہرائی، شوخی و بے ساختگی اور طنز کی لطیف چاشنی کی آمیزش ہے۔ان کے یہاں عام موضوعات بھی شاہکار بن جاتے ہیں۔جس میں روزمرہ تضاد کو بھرپور انداز میں اجاگر کیا گیا ہے۔ان کے انشائیے صرف ہنسنے اور ہنسانے تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں اصلاح کا پہلو بھی غالب ہے ان کا اہم انشائیہ ہاسٹل میں پڑھنا میں یونیورسٹی کے تعلیم نظام میں جو کمیاں ہیں اس پر گہری چوٹ کی ہے۔پطرس کی خوبی یہ ہے کہ وہ جب کسی حقیقت کو قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں تو عام قاری واقعہ کے مضحکہ پہلوؤں میں گم ہو جاتا ہے صرف حساس قاری ہی ان کی تحریروں کے بین السطور کی گہرائی و گیرائی تک پہنچ سکتا ہے۔پطرس نے اپنے انشائیوں میں انسان فطرت اور ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کا ذکر کیا ہے جس پر عموماً بہت کم قاری کی نظر پڑتی ہے۔جب ہم پطرس کے انشائیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ پطرس نے دیوان غالب کی طرح اپنا ایک مختصر انشائیوں کا مجموعہ ''مضامین پطرس'' لکھ کر اس طرح شہرت حاصل کی جس طرح غالب نے اردو غزل میں ایک مختصر دیوان ''دیوان غالب'' لکھ کر حاصل کی ہے۔یہاں پطرس اور غالب کا موازنہ کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ادب میں زیادہ لکھنے سے شہرت نہیں ہوتی بلکہ اگر کوئی مختصر بھی لکھتا ہے اور وہ فن پارہ فکر و فن کے پیمانے پر پورا اترتا ہے تو باذوق قاری اس کو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔پطرس کے مضامین کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ پطرس نے معمولی اشیا کا بغور مشاہدہ کیا ہے اور اس سے مضحکہ خیز پہلوؤں کو اپنی فکری بصیرت سے اجاگر کیا ہے اور جہاں جیسا موقع ملتا ہے وہ نہایک چابکدستی سے اس کو بیان کر دیتے ہیں اس لئے ایک عام قاری آپ کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ہمارے خیال میں اردو مزاح نگاروں میں پطرس سے کم کسی نے نہیں لکھا لیکن جب اہم مزاح نگاروں کی بات آئے گی تو ان میں ایک نام پطرس بخاری کا ہوگا۔

17.3 پطرس کا اسلوب

پطرس کی مزاحیہ تحریریں قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں ان کی انشائیہ نگاری کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔انہوں نے اپنے انشائیوں میں غیر متوقع طور پر ایسی چیزیں پیش کر دی ہیں جو قاری کو حیرت زدہ کر دیتی ہیں۔''ہاسٹل میں پڑھنا'' اور ''کتے'' ان کی انشا پردازی کا بین ثبوت ہے۔طنز و مزاح نگاری میں ان کا اپنا منفرد اسلوب ہے۔الفاظ اور محاوروں میں فنی معنوی جہات دے کر مزاح اور طنز کے نئے پہلو تراشتے ہیں۔ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔پطرس بخاری نے اپنے انشائیوں میں ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کا ذکر کیا ہے جس پر عام قاری کی نظر کم کم جاتی ہے پطرس

ان معمولی اشیاء کا مشاہدہ بہت باریک بینی سے کرتے ہیں اور اس سے مضحکہ خیز پہلوؤں کو اپنی نظر میں رکھتے ہیں اور جہاں موقع ملتا ہے اس کو جڑ دیتے ہیں۔ پطرس بخاری کا مشاہدہ اور تجربہ بہت وسیع ہے۔ وہ لفظوں کے الٹ پھیر سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا انشائیہ ''ہاسٹل میں پڑھنا'' سیرت اور شخصیت سے جو مزاح پیدا کیا ہے اس طرح کی مثالیں دوسرے انشائیوں میں کم کم ملیں گیں۔ وہ قاری کو زیر لب مسکرانے پر اکساتے ہیں پطرس بظاہر سنجیدہ نظر آتے ہیں لیکن ان کا قلم بے رحم حقیقت نگاری کا آواز بن جاتا ہے۔

پطرس کے مزاح میں روانی اور شگفتگی ہے۔ ان کا طنز بہت تیکھا نہیں ہوتا ہے۔ وہ الفاظ کے الٹ پھیر سے بھی مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے ان کے یہاں شگفتگی اور شائستگی پائی جاتی ہے۔ ان کے انشائیوں کے موضوعات بلا کا تنوع ہے فکری اعتبار سے ان کا دائرہ ان کے معاصرین سے بڑا تھا۔ ان کا تجربہ بھی وسیع تھا، ان کے تجربے اور مشاہدے کی چھاپ ان کی تحریروں میں سنائی دیتی ہے۔ مختصر یہ کہ پطرس کی زبان و بیان کی شیرینی و لطافت ان کے معاصرین سے الگ کرتی ہے ان کو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ زبان و بیان کی باریکیوں، لطافتوں اور نزاکتوں سے اچھی طرح واقف تھے اور ان کے پاس الفاظ کا ذخیرہ تھا اس لیے پطرس کو اپنی مافی الضمیر کو بیان کرنے میں دشواری نہیں ہوتی ہے اور پطرس کے اسلوب کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر بات کو نہایت بے تکلفی و روانی سے خوبصورت انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اور اپنے اسی دلکش اور منفرد اسلوب کی وجہ سے اردو مزاح نگاروں میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔

17.3.1 سرگرمی آو اپنی معلومات جانچیں

عزیز طلبا و طالبات آیئے ایک لمحے کے لیے رکیں اب جبکہ آپ نے پطرس بخاری کی سوانحی کوائف، مزاح نگاری اور اسلوب کو پڑھ لیا ہے تو نیچے دی گئی مشق کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ صحیح یا غلط کا نشان لگائیں:۔

1۔ پطرس بخاری کا اصل نام سید شاہ بخاری تھا۔ ( )

2۔ پطرس بخاری کے انشائیہ کا نام ''ہاسٹل میں پڑھنا'' ہے۔ ( )

3۔ ''کتے'' کنہیالال کپور کا مزاحیہ مضمون ہے۔ ( )

4۔ ''پیروڈی'' میں پطرس بخاری کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ ( )

5۔ ارہر کا کھیت پطرس بخاری کی اہم تخلیق ہے۔ ( )

17.4 عمومی جائزہ

پطرس بخاری نے اردو طنز و مزاح میں غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ پطرس بخاری نے اردو میں معدودے چند مضامین قلم بند کیے اور جس کو مضامین پطرس کے نام سے شائع بھی کیا۔ اتنا کم لکھنے کے باوجود اردو طنز و مزاح کی روایت کو مستحکم کرنے میں اہم رول ادا کیا اور ان کے انشائیے قاری کو دعوت فکر ہی نہیں دیتے ہیں بلکہ اسے بار بار پڑھنے پر اکساتے ہیں۔ اردو کے بہت کم ادیبوں کو اتنا کم لکھنے پر شہرت حاصل ہوئی۔ پطرس بخاری غیر متوقع طور پر ایسی چیزیں اپنے انشائیوں میں پیش کرتے ہیں جس سے ذہن حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔ پطرس کے یہاں روانی و شگفتگی اعلیٰ پائے کی ہے اور ان کا طنز بہت تیکھا نہیں ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ پطرس کو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ وہ زبان کی باریکیوں، لطافتوں اور نزاکتوں سے بحسن خوبی واقف تھے۔ ان کا ذخیرۂ الفاظ بے حد وسیع تھا۔ انہیں مافی الضمیر کی ادائیگی میں کبھی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ نہایت بے تکلفی اور روانی سے ہر بات کو بحسن خوبی بیان کرتے ہیں۔ اپنی اسی دلکش اسلوب کی وجہ سے اردو مزاح نگاروں اور انشائیہ نگاروں میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔

17.5 فرہنگ

1۔ ترویج	:	رواج دینا
2۔ جڑنا	:	چسپاں ہونا، شامل ہونا
3۔ آغاز	:	شروع کرنا
4۔ مشاہدہ	:	دیکھنا، معاینہ
5۔ مافی الضمیر	:	دل کی بات، غرض، مقصد
6۔ بین السطور	:	سطروں کے درمیان
7۔ تضاد	:	مخالف
8۔ مضحکہ خیز	:	ہنسی مذاق میں ڈالنے والی بات
9۔ اجمالی	:	مبہم، سرسری
10۔ جدید	:	نئی، نیا، تازہ

17.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

طویل سوالات

1۔ پطرس بخاری کی ابتدائی زندگی کے احوال قلم بند کیجئے۔

2۔ پطرس بخاری کے انشائیوں میں طنز و مزاح کے اسلوب سے بحث کیجئے۔

3۔ پطرس بخاری کی انشائیہ نگاری کی انفرادیت واضح کیجئے۔

4 ۔ پطرس بخاری کی مزاحیہ نگاری کا جائزہ لیجئے۔

مختصر سوالات

1۔ ''ارہر کا کھیت'' کا خلاصہ لکھیے۔

2۔ پطرس بخاری کے کسی ایک انشائیہ کا خلاصہ لکھئے۔

3۔ پطرس کے مزاحیہ اسلوب سے بحث کیجئے۔

4۔ اردو انشائیہ نگاروں میں پطرس بخاری کا مقام متعین کیجئے۔

17.7 مشقی سوالات

1۔ پطرس بخاری کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

2۔ پطرس بخاری کے پانچ مشہور انشائیوں کے نام بتائیں۔

3۔ پطرس بخاری ابتدا میں کس نام سے لکھتے تھے اور کس میگزین کے ایڈیٹر تھے؟

17.8 مشقی سوالات کے جوابات

1۔ پطرس بخاری یکم اکتوبر 1898 کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ان کا پورا نام سید احمد شاہ بخاری تھا۔

2۔ پطرس بخاری کے پانچ مشہور انشائیوں میں کتے، ہاسٹل میں پڑھنا، مرید پور کا پیر، سنیما کا عشق اور اردو کا آخری قاری شامل ہیں۔

3۔ پطرس بخاری ابتدا میں ''پیٹر'' کے نام سے انگریزی مضامین لکھتے تھے اور گورنمنٹ کالج میگزین کے ''راوی'' کے ایڈیٹر تھے۔

17.9 امدادی کُتب Books Prescribe

۱۔انتخاب اُردو نثر 1857 1920ء ایجوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ۔

۲۔انتخاب اُردو نثر 1920 کے بعد ای جوکیشن بک ہ ہاؤس علی گڑھ

Recommended.Books

Books Recommended.

۱۔	مختصر تاریخ ادب اُردو۔ڈاکٹر سید اعجاز حسین ترجمہ واضافے	ڈاکٹر سید محمد عقیل
۲۔	اُردو ادب میں طنز ومزاح۔	ڈاکٹر وزیر آغا
۳۔	اُردو ادب میں طنز ومزاح۔	غلام احمد فرقت کاکوروی
۴۔	رشید احمد صدیقی۔شخصیت اور فن۔	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
۵۔	اُردو انشائیہ۔	وزیر آغا
۶۔	انشائیہ کے فنی سروکار۔	ڈاکٹر احمد امتیاز
۷۔	انشائیہ کی بنیاد۔	ڈاکٹر سلیم اختر
۸۔	فنِ انشائیہ اور انشائیے۔	ڈاکٹر فرحت شمیم
۹۔	انشائیہ کے خدوخال	وزیر آغا
۱۰۔	انشائیہ کی بنیاد	ڈاکٹر سلیم اختر
۱۱۔	انشائیہ اردو ادب میں	ڈاکٹر انور سدید
۱۲۔	انشائیہ	ڈاکٹر آدم شیخ
۱۳۔	ڈپٹی نذیر احمد احوال وآثار	محمد اکرام چغتائی

۱۴۔	مولوی نذیر احمد احوال و آثار	ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی
۱۵۔	لکچروں کا مجموعہ (مرتبہ)	محمد نذیر حسین
۱۶۔	نذیر احمد	نور الحسن نقوی
۱۷۔	فکر و نظر (ڈپٹی نذیر احمد نمبر) علی گڑھ	
۱۸۔	خواجہ حسن نظامی: شخصیت اور ادبی خدمات	نثار احمد فاروقی
۱۹۔	خواجہ حسن نظامی کی نثر	ڈاکٹر مولا بخش
۲۰۔	خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری	سید محمد نیر رضوی
۲۱۔	خواجہ حسن نظامی کتاب نما	خصوصی شمارہ

سبق-18 کنہیالال کپور کی انشائیہ نگاری میں طنز ومزاح

ساخت

1.0 اغراض ومقاصد
1.1 تعارف
1.2 کنہیالال کپور کی سوانح وشخصیت
1.3 کنہیالال کپور کے انشائیوں میں طنز ومزاح
1.4 کنہیالال کپور کا اسلوب
1.5 سرگرمی- صحیح یا غلط
1.6 عمومی جائزہ
1.7 فرہنگ
1.8 مشقی سوالات وجوابات
1.9 نمونہ برائے امتحانی سوالات
1.10 امدادی کتب

18.0 اغراض ومقاصد

عزیز متعلّم اس سبق کے مطالعے کے بعد اس قابل ہوجائیں گے کہ

کنہیالال کپور کی حیات وادبی خدمات سے واقف ہوسکیں گے۔

کنہیالال کپور کے انشائیہ نگاری سے واقف ہوسکیں گے۔

کنہیالال کپور کی مزاح نگاری کی خصوصیات سے واقف ہوسکیں گے۔

کنہیالال کپور کے اسلوب سے بھی واقف ہوسکیں گے۔

18.1 تعارف

کنہیالال کپور کی طبیعت طنز ومزاح کی طرف مائل ہوئی۔ کپور اپنے طنزیہ مزاحیہ مضامین کے باعث کافی شہرت پائی۔آپ کا اسلوب شگفتہ اور انداز بیان بہت سادہ اور دلچسپ ہے۔کنہیالال کپور کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے چھوٹے بڑے معاملات اور زندگی کے نادر واقعات بڑے ہی سلیقے سے نثری پیکر میں ڈھال دیا ہے۔کنہیالال کپور کی تخلیقات کے مطالعے سے ہم صرف ہنستے نہیں ہیں باور نہ ہی صرف عام انسانی کمزوریوں سے واقف ہوتے ہیں بلکہ اس سے طنزیہ ومزاحیہ انداز زندگی کی تلخ حقائق سے بھی آشنا ہوتے ہیں۔ان کی متعدد کتابیں شائع ہوکر شہرت دوام حاصل کرچکی ہیں۔کنہیالال کپور نے انگریزی ادب کے مزاحیہ وطنزیہ مضامین کا مطالعہ کیا تھا اور کنہیالال کپور کے لیے پیروڈی نگاری بہت سازگار ثابت ہوئی۔''بہاراں'' کے مضامین کے مطالعے سے انکشاف ہوتا ہے کہ انہوں نے بہتر مضامین استفہامیہ کے پیرائے میں لکھا ہے۔اس سبق کے مطالعہ سے طلبا وطالبات کو یہ اندازہ ہوجائے گا کہ کنہیالال کپور نے اردو انشائیہ نگاری میں طنز ومزاح کے عناصر کو شامل کرکے اسے بہت دلچسپ بنادیا ہے۔

18.2 کنہیالال کپور کی سوانح وشخصیت

کنہیالال کپور کا شمار اردو کے اہم انشا پرداز میں ہوتا ہے ان کی شخصیت کے مختلف جہات ہیں۔وہ ظرافت نگار بھی ہیں اور طنز ومزاح نگار بھی۔وہ پیروڈی نگار بھی اور ایک اچھے انشا پرداز بھی وہ اپنے رنگ وروپ میں ایک اچھے تخلیق کار وفن کار بھی ہیں۔وہ اپنی ان ہی ادبی شخصیت کی وجہ سے اردو ادب میں اہم مقام رکھتے ہیں۔آپ کی پیدائش 27 جون 1910 ضلع لائل پور موجودہ فیصل آباد پاکستان میں ہوئی۔اور ان کے والد محترم لابری رام کپور، اور دادا ناٹگ چند کپور نیز والدہ محترمہ مسز دیوی کپور بہت ہی با اخلاق فیملی تھی ان کا آبائی پیشہ تجارت تھا اور یہ لوگ ہندو کھتری تھے اور ان پر ان کو فخر حاصل تھا۔کنہیالال کپور کی ابتدائی تعلیم اس کے روایت کے حساب سے ہوئی۔اور انہوں نے تعلیم کا آغاز مقامی اسکول سے کیا۔اس کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ ضلع لائل پور، 1928 میں میٹرک پاس کیا اور اس کے بعد وہ لاہور آ گئے۔یہاں ایم اے کی

تعلیم مکمل کر کے ایک کالج میں انگریزی کے استاد مقرر ہو گئے۔ کپور ڈج کالج کے موکا ہی وائس پرنسپل اور پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ زمانہ طالب علمی میں کپور نے تصنیف و تالیف میں منہمک ہو گئے تھے۔ اور اسی زمانے میں رامپور کی اہم میگزین اراوی'' سے اپنے مضمون کی ابتدا انگریزی میں لکھ کر کی۔ اور 1932 میں کرشن چندر کے افسانے ''یرقان'' کی پیروڈی خفقان کے نام قلم بند کی۔ اور با قاعدہ مضامین لکھنے کا آغاز 1938 سے کیا۔ کنہیالال کپور نے فلمی دنیا میں بہت کام کیا۔ وہ بحیثیت ڈائیلاگ نگراں، اسکرپٹ نگراں کا کام کیا۔ کنہیالال کپور کا اردو ادب میں بیش بہا سرمایہ چھوڑا ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ ''سنگ و خشت'' (1944) شیشہ و تیشہ جنگ در باب (1944) اور 1946 میں شائع ہوا۔ کنہیالال کپور کی بنیادی پہچان پیروڈی ہی ہے اردو دنیا میں وہ پیروڈی نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ ان کی شاہ کار پیروڈی غالب جدید شعرا کی مجلس میں'' بہت مقبول و معروف ہوئی اور اکثر جامعات میں اردو کے نصاب کا حصہ ہے۔ وہ بہت سے مضامین انشائیہ کے پیرائے میں لکھے ہیں اور انشائیے اردو مزاحیہ ادب بہت مقبول بھی ہوئے اور قاری نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کنہیالال کپور نے اردو ادب کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیے ۔5 مئی 1890 کو اس دنیا کو چھوڑ کر چلے گئے۔

18.2.1 کنہیالال کپور کے انشائیوں میں طنز و مزاح

اردو میں مزاحیہ ادب کا گراں قدر سرمایہ موجود ہے اور جب اردو کے مزاح نگاروں کی تعداد خاصی طویل ہے لیکن اس فہرست میں کچھ ایسے نام ہیں جن کے ذکر کے بغیر مزاح و انشائیہ کا تصور ممکن نہیں۔ رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، کنہیالال کپور کا بہت بلند مام ہے۔ کنہیالال کپور کو انشا پردار کہا جائے یا ظرافت نگار یا پیروڈی نگار وہ ان تمام میدان میں اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے رنگ و روپ میں ایک مشاق فنکار ہیں مزاحیہ ادب یا مخصوص انشا پردازی میں کنہیالال کپور کی قدر و قیمت متعین کرنا آسان نہیں۔ انہوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کا حق ادا کر دیا۔ انہوں نے اپنے انشائیوں کا آغاز ڈرامائی انداز میں کیا ہے۔ مثال کے طور پر اپنے انشائیہ ''اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے'' کا آغاز یوں کرتے ہیں:

> ''ٹیگور، اقبال، کوہ ہمالہ، اور تاج محل کے علاوہ بہت سی ہستیاں اور اشیاء قابل ستائش ہیں مثلاً مچھر، شاعر، عشاق یہ تو وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ اپنے وطن میں مچھر زیادہ ہیں یا شاعر مگر بہر حال دونوں کافی تعداد میں ہیں۔ مچھروں اور شاعروں میں اس لیے بھی مطابقت ہے کہ دونوں شمع روشن ہونے پر بھنبھنانا شروع کرتے ہیں نیز جس طرح

مچھروں کی کئی قسمیں ہیں اسی طرح شاعروں کی بھی کئی قسمیں ہیں۔''

(انشائیہ اور انشائیے، پروفیسر محمد حسینی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2014، ص184)

کنہیالال کپور کا مطالعہ بے حد وسیع تھا وہ انگریزی ادب سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے انگریزی ادب کے مزاحیہ مضامین کا بہت مطالعہ کیا تھا اور اس سے کسی حد تک استفادہ بھی کیا۔ کنہیالال کپور کی بنیادی ادبی شناخت پیروڈی ہے اور وہ اردو دنیا میں پیروڈی کے حوالے سے زیادہ مشہور ہوئے۔ لیکن انہوں نے اپنے آپ کو پیروڈی تک محدود نہیں رکھا ان کے بیشتر مضامین انشائیہ کے پیرائے میں بھی موجود ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں انشائیہ نگاری میں مزاح کے استعمال کا فن اچھی طرح کرنا تھا۔ ان کو اردو زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی اور اردو زبان سے غیر معمولی محبت بھی کرتے تھے۔ کنہیا کو مزاح پیدا کرنے کا ہنر آتا تھا انہوں نے اپنے مشاہدے اور تجربے کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ غالباً جدید شعرا کی ایک مجلس کے مطالعہ سے عیاں ہوتا ہے کہ انہوں نے اس پیروڈی میں صرف طنز و مزاح سے کام نہیں لیا ہے بلکہ اس میں تنقیدی عناصر بھی کارفرما ہیں۔ بہرحال یہ ایک دلچسپ انشائیہ ہے جس میں جدید شاعری پر دقیق نظر ڈالی گئی ہے۔ کلاسیکی اور جدید شاعری کا ایک طرح سے موازنہ ہے۔ کنہیالال کپور کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے تصور اقبال سے غالب کی آمد پیش کر کے اسی دور کی جدید شاعری کی خوبیوں اور خامیوں پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ کپور کے اس انشائیہ کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہنسی ہنسی میں اپنے ایک عظیم مقصد کو بیان کر دیا ہے۔ کپور کا انداز بیان مزاحیہ اور شگفتہ ہے۔ وزیر آغا نے کپور کے طنزیہ انشائیے بالخصوص غالب جدید شعرا کی ایک مجلس کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''سنگ و خشت میں غالب جدید شعرا کے دربار میں کا تصور کیجئے۔ وہاں کپور اپنے عروج پر ہے۔ وہ چاروں طرف اینٹ پھینکتا ہے۔ کسی کا لحاظ نہیں کرتا، کسی سماجی لغزش اخلاقی تقاضے متاثر نہیں ہوتا۔ بس ایک دربار ہے خس و خشاک کو اپنے ساتھ لیے بہا چلا جاتا ہے۔''

(''اودھ پنچ، بارہواں شمارہ، کنہیالال کپور نمبر، تیسرا، اور تیسرا سال تیسرا شمارہ)

کنہیالال کپور کا انشائیہ ''غالب جدید شعرا کی مجلس میں'' بہت اہم ہے۔ اردو کے قارئین نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس انشائیے کی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے آغازِ انشائیہ ہی سے قاری کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کر لیا ہے۔ اس انشائیے کا آغاز کچھ اس طرح ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''دور جدید کے شعرا کی ایک مجلس میں مرزا غالبؔ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ اس مجلس میں تقریباً تمام جلیل القدر جدید

شعرا تشریف فرما ہیں۔ مثلاً م۔ن ارشدؔ، ہیرا جیؔ، ڈاکٹر قربان حسین خالصؔ، میاں رفیق احمد خوگر، راجہ عہد علی خاںؔ، پروفیسر غیظ احمد غیظؔ، بکر ماجیت ورما، عبدالحی نگاہ وغیرہ۔ یکا یک مرزا غالبؔ داخل ہوتے ہیں ان کی شکل وصورت بعینہ وہی ہے جو مولانا حالیؔ نے ''یادگار غالب'' میں بیان کی ہے۔ ان کے ہاتھ میں ''دیوان غالب'' کا ایک نسخہ ہے۔ تمام شعرا کھڑے ہوکر آداب بجالاتے ہیں۔

غالبؔ: ''حضرات! میں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے جنت میں دعوت نامہ بھیجا اور اس مجلس میں مدعو کیا۔ میری مدت سے آرزو تھی کہ دور جدید کے شعرا سے شرف نیاز حاصل کروں۔

ایک شاعر: یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے وگرنہ،

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

غالب: رہنے بھی دیجئے اس بے جا تعریف کو۔ من آنم کہ من دانم۔

کنہیا لال کپور کے انشائیے بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اسلوب بیان اور انشا پردازی سے قاری کو اپنی اس تحریر کا عاشق بنالیا ہے۔ اس میں رنگینی بھی ہے، اختصار بھی ہے، جامعیت بھی ان کے اس انشائیہ میں مزاح وزیریں لہریں موجزن ہیں زبان وبیان اور اسلوب کے اعتبار سے ان کے انشائیے غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ کنہیا لال کپور کا اہم انشائیہ کا مجموعہ ''سنگ وخشت'' ہے جس میں تقریباً پندرہ انشائیے شامل ہیں۔ اس انشائیے کے مجموعے کو کنہیا لال کپور نے اردو کے اہم مزاح نگار پطرس بخاری کے نام معنون کیا ہے۔ اس مجموعے کے انشائیوں کے اہم نام یہ ہیں: ایک آرٹسٹ، ریڈیو خریدار ہے، چینی شاعری، بڑے آدمی، انتساب، نام، رومان کی تلاش، علامہ ظہور، رہیے اب ایسی جگہ چل کر، سنانے کا مرض، اردو افسانہ نویسی کے چند نمونے، اخبار بینی، قومی لباس، غالب جدید شعرا کی مجلس میں، ٹیوٹر، اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے۔ یہ تمام انشائیے موضوع، مواد اور فن کے اعتبار سے اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں اور قاری کے لئے فرحت وانبساط مہیا کراتے ہیں۔ کنہیا لال کپور نے اس مجموعے کے انشائیوں کے قلمبند کرنے کے اسباب اس طرح بیان کیے ہیں:

''میں نے یہ مضامین کیوں لکھے؟ اس کی دو وجوہ ہیں۔ آج سے چار پانچ سال پہلے میرے چند احباب نے مجھے بنانا شروع کیا کہ آپ اردو میں مزاحیہ اور طنزیہ مضامین لکھ سکتے ہیں۔ اردو ادب کی بدقسمتی سمجھتے کہ میں ان کی باتوں میں

آ گیا۔اورلکھنا شروع کر دیا۔ یہ مجھے بنانے والے اصحاب کون تھے؟ لیجئے میں انہیں بے نقاب کئے دیتا ہوں۔کرشن چندر، مولانا صلاح الدین چودھری، نذیر احمد۔آج جبکہ یہ مضامین شائع کرر ہا ہوں محسوس کرتا ہوں کہ وہ اول درجے کے دروغ گو تھے۔''

(کنہیالال کپور، سنگ خشت، پیش لفظ، انڈین اکیڈمی، نئی دہلی، صفحہ 10)

کنہیالال کپور کو مزاح کے فن سے گہری واقفیت تھی۔انہوں نے مزاح اور طنز میں کیا فرق ہے اس کو بھی واضح کیا ہے۔طنز اور ہجو میں کس طرح تمیز کی جاسکتی ہے اس سے بھی بخوبی واقف تھے۔کنہیالال کپور کے مضامین اردو میں اعلیٰ ظریفانہ تحریروں میں شمار کرنے کے لائق ہیں۔ ''سنگ وخشت'' کا اولین انشائیہ کا عنوان ایک آرٹسٹ ہے۔اس انشائیے کا آغاز انہوں نے اپنی فکری بصیرت اور مزاحیہ اسلوب سے اس طرح کرتے ہیں کہ قاری ان کا انشائیہ پڑھنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔انشائیے کا آغاز اچانک کسی واقعے سے کردیتے ہیں۔مثال کے طور پر ''ایک آرٹسٹ'' کی ابتدا اس طرح سے ہوتی ہے:

''ایک دن میرے دوست پروفیسر بشیر احمد نے باتوں باتوں میں مجھے بتایا کہ خدا اور بیوی کے بعد اگر وہ کسی شخص سے ڈرتے ہیں تو وہ ان کا خانساماں ہے۔

میں نے کہا: بچوں کی طرح ہم سب ایک نہ ایک ہوّے سے ساری عمر ڈرتے رہتے ہیں۔کسی کا ہوّا کالج کا پرنسپل ہے اور کسی کا دفتر کا سپرنٹنڈنٹ۔ پروفیسر بشیر احمد نے پوچھا: اور تمہارا ہوّا۔

میں نے جواب دیا: ویسے تو میں متعدد چیزوں سے خائف رہتا ہوں مثلاً مالک مکان سے جو ہر صبح کرائے کا تقاضا کرتا ہے اور اپنے ڈاکٹر سے جس کا بل میں نے پچھلے چھ مہینے سے نہیں چکایا اور اپنے ہمسائے کے کتے سے جو دو دفعہ مجھے کاٹ چکا ہے مگر ان سب سے بڑھ کر میں اپنے ان احباب سے ڈرتا ہوں جو اپنے آپ کو آرٹسٹ کہتے ہیں۔

پروفیسر صاحب نے ذرا مسکرا کر کہا: یہ کیسے؟

میں نے کہا: یہ الگ بالکل عجیب واقع ہوئے ہیں۔ان کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔'' (ایضاً، صفحہ 11)

اس اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کنہیالال کپور نے قاری کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرانے کے لئے ایسے واقعات کا بیان کرتے ہیں جس کا براہ راست تعلق ہماری زندگی سے ہو اور انہوں نے طنز ومزاح پیدا کرنے کے لئے اپنی ذاتی زندگی، اپنی پسند ناپسند اور اپنے اوپر بیتے

ہوئے واقعات واقعات کواس طرح بیان کرتے ہیں جس سے قاری زیرلب مسکرانے پر مجبور ہوجاتا ہے۔اپنے آپ کونشانہ بناتے ہوئے وہ قاری کو براہ راست مسکرانے پر اکساتے ہیں۔

کنہیالال کپور نے طنز ومزاح کی دنیا میں اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے ان کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں، غالب کے دوسوال، ترقی پسند غالب، غالب کے اڑیں گے پرزے، پیرومرشد، انکم ٹیکس والے، پانچ قسم کے لیے سودہ شوہر، ایک شعر یاد آیا، دوکو ترانا، ہم نے کتا پالا، بند پرورکب تلک، بنانے کا فن، کلکتہ کا ذکر، خودکشی، شیخ سلی، حماقت، ساتیں بابا مشورہ زیب داستان کے لیے، مرزا جگنو، نیا شکنجہ، نے اردو ادب میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی ہے۔

18.3 کنہیالال کپور کا اسلوب

وزیر آغا نے کنہیالال کپور کو اردو نثر کا دوسرا اعلیٰ طنز نگار تسلیم کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے طنز ومزاح کا دائرہ کتنا وسیع اور ارفع تھا۔اوران کے طنز ومزاح میں سماج کی ناہمواریوں کی جو کاٹ ہے دوسرے مزاح نگاروں کے یہاں کم کم پائی جاتی ہے اوران کے متعدد مضامین دوسری زبانوں میں ترجمہ بھی ہوئے ہیں۔ان کا اسلوب لفظی بازگری نہیں پائی جاتی ہے۔وزیر آغا کا ماننا ہے کہ کپور کا طنز ایک سرجن عمل جراحی کی طرح ہے۔کنہیالال کپور ایک ذوق سلیم رکھتے تھے اوران کے طنزیہ کاٹ کے حوالے سے وزیر آغا نے بڑی بات کہی ہے۔انہوں نے لکھا ہے کہ:

> ''کپور کی طنز ایک سرجن کے عملی جراحی کی طرح ہے وہ ادب اور زندگی کی ناہمواریوں یا غیر ضروری جذباتیت کے مظاہر کو دیکھتے ہیں اور اپنے نشتر سے ان ناسوروں کو آہستگی سے چیر دیتے ہیں اس طور کہ جامد مادہ بہہ جاتا ہے اور زخم مندمل ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ان کے عمل جراحی میں ایک فطری نفاست اور تیزی ہے۔وہ عموماً مریض اس درجہ مبہوت کرنے کے بعد اپنے عمل جراحی کا آغاز کرتے ہیں، مریض کو نشتر کی جراحت تک محسوس نہیں ہوتی ہاں کبھی کبھی وہ مریض کو ظرافت کا کلوروفارم سنگھائے بغیر بھی عمل جراحی شروع کردیتے ہیں اور مریض شدت درد سے چیخ اٹھتا ہے۔'' (وزیر آغا، اردو ادب میں طنز ومزاح، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2019، ص 39-238)

مندرجہ بالا اقتباس سے کنہیالال کپور کے اسلوب کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ے۔ان کا اسلوب دلکش ہے اور زبان وبیان میں ثقالت نہیں ہے اوران کی بات قاری تک پہنچ جاتی ہے۔

کنہیالال کپور کا مطالعہ بہت ہی وسیع تھا۔انگریزی ادب سے مزید دلچسپی ہونے کی وجہ سے انگریزی ادب کے مزاحیہ وطنزیہ مضامین کا بغور مطالعہ کیا تھا اور اس سے کسی حد تک استفادہ بھی کیا ہے۔ان کے اسلوب پر انگریزی ادب کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ان میں جو فکر کی بالیدگی اور دور اندیشی ہے ہمارے خیال سے انگریزی ادب کے مطالعے کی وجہ سے بھی ہے۔انہوں نے انگریزی ادب سے استفادہ کرنے کے ساتھ اردو زبان وادب کا مطالعہ بھی گہرائی و گیرائی سے کیا ہے اسی لئے کنہیالال کپور کو اردو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔انہوں نے اردو زبان میں معیاری مضامین تحریر کر کے اپنے معاصرین کو چونکایا ہی نہیں ہے بلکہ اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔ان کے اسلوب میں شگفتگی وروانی پائی جاتی ہے۔پیروڈی کے استعمال میں ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا ہے۔کنہیالال کپور ایک اہم انشائیہ نگار تھے اور وہ انشائیہ کے فنی لوازمات سے بحسن وخوبی واقف تھے۔ان کو مزاح پیدا کرنے کا اچھا ہنر آتا تھا۔پیروڈی کے سہارے ان کا انشائیہ بہت دلچسپ ہوگیا ہے۔پیروڈی ان کے طنز ومزاح کا بہترین حربہ ہے اور ان کے اسلوب کی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک ساتھ کئی شکار کرتے نظر آتے ہیں۔وہ کبھی قاری کو زیر لب مسکرانے پر مجبور کرتے ہیں اور کبھی قہقہہ لگانے پر۔کپور نے طنز ومزاح کے فن کو بام عروج پر پہنچایا۔میں اسے فنی معراج کا فن تصور کرتا ہوں۔انہوں نے اپنے اسلوب بیان اور انشا پردازی سے قاری کو اپنی تحریر کا عاشق بنالیا ہے۔اس میں رنگینی بھی ہے اور دلکشی بھی۔اختصار بھی ہے اور جامعیت بھی۔ان کے انشائیے میں مزاح وزیریں لہریں موجزن ہیں۔زبان و بیان واسلوب کے اعتبار سے ان کے انشائیے غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔

18.3.1 سرگرمی آؤ اپنی پیش رفت جانچیں

عزیز طلبا وطالبات آیئے ایک لمحے کے لیے رکیں اب جبکہ آپ نے پطرس بخاری اور کنہیالال کپور کی سوانحی کوائف، مزاح نگاری اور اسلوب کو پڑھ لیا ہے تو نیچے دی گئی مشق کو حل کرنے کی کوشش کریں۔صحیح یا غلط کا نشان لگائیں:

1۔ ''سنگ وخشت'' کنہیالال کپور کا پہلا مجموعہ ہے۔ ( )

2۔ کنہیالال کپور کا انشائیہ کا نام ''ہاسٹل میں پڑھنا'' ہے۔ ( )

3۔ لاہور کا جغرافیہ، کنہیالال کپور کا مزاحیہ مضمون ہے۔ ( )

4۔ ''پیروڈی'' میں کنہیالال کپور کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ ( )

5۔ غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں پطرس بخاری کی اہم تخلیق ہے۔ ( )

18.4 عمومی جائزہ

کنہیالال کپور کے طنزیہ لہجے کی اخلاقی بحران کا نکتہ بھی چھپا ہوتا۔ان کی ظرافت شگفتگی اور زندہ دلی ہے اوران کے انشائیے مطالعہ سے ایک تخلیق کار کے ذہنی کرب کا بھی احساس ہوتا ہے۔ظاہر ہے کنہیالال کپور کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔انگریزی ادب سے پطرس کی طرح ان کو بھی بڑی دلچسپی تھی۔کنہیالال کپور کومزاح پیدا کرنے کا ہنر معلوم ہے۔انہوں نے اپنے مشاہدے اور تجربے کا بھرپور استعمال کیا ہے۔جدید اور کلاسیکی شاعری پر بھی ان کی گہری نظر تھی کپور نے اگر صرف ایک انشائیہ ''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس'' صرف تحریر کیا ہوتا تب بھی وہ اردو مزاح نگاری میں اپنی شناخت قائم کر لیتے۔اس انشائیہ کو اردو ادب میں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔کنہیالال کپور کے انشائیے زبان، بیان اسلوب کے اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔

18.5 فرہنگ

طنز	:	تنقید،طعنہ
ظرافت	:	عقل مند ہونا، دانائی
تخلیق	:	وجود میں لانا،آفرینش
شہرت	:	مشہور، نیک نامی، ناموری
گیرائی	:	گرفت، پکڑ،تسلط
استفادہ	:	فائدہ اٹھانا،نفع پانا
مبذول	:	صرف کیا ہوا،استعمال میں لایا ہوا
کرب	:	بےچینی،اضطراب
سنگ	:	پتھر
خشت	:	اینٹ
حامل	:	اٹھانے والا،کوئی چیز یا صفت رکھنے والا

جذباتیت : انسان کا فطری میلان

کوائف : احوال،تفصیلات

مبہوت : حیران، متحیر

من آنم کہ من دانم : میں وہی ہوں جو میں جانتا ہوں

18.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

طویل سوالات

1۔ کنہیالال کپور کی ابتدائی زندگی کے احوال قلم بند کیجئے۔

2۔ کنہیالال کپور کی سوانحی کوائف پر سیر حاصل گفتگو کیجئے۔

3۔ کنہیالال کپور کی انشائیہ نگاری کی انفرادیت واضح کیجئے۔

4 ۔ کنہیالال کپور کی مزاح نگاری کا جائزہ لیجئے۔

مختصر سوالات

1۔ ''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' کا خلاصہ لکھئے۔

2۔ کنہیالال کپور کے کسی ایک انشائیہ کا خلاصہ لکھئے۔

3۔ کنہیالال کپور کے مزاحیہ اسلوب سے بحث کیجئے۔

4۔ اردو انشائیہ نگاروں میں کنہیالال کپور کا مقام متعین کیجئے۔

18.7 مشقی سوالات

1۔ کنہیالال کپور کب اور کہاں پیدا ہوئے۔ان کے چار مشہور انشائیوں کے نام لکھئے۔

2۔ کنہیالال کپور کا اولین انشائیوں کا مجموعہ کونسا ہے اور یہ کتاب کس کے نام معنون کیا گیا ہے۔ پانچ انشائیوں کے نام لکھئے۔

3۔ کنہیالال کپور کا انشائیہ ''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' میں شامل تین شعرا کے نام لکھئے۔

4۔ کنہیالال کپور کے چار کتابوں کے نام لکھئے؟

18.7 مشقی سوالات کیجوابات

1۔ کنہیالال کپور 27 جون 1910 ضلع لائل پور موجودہ فیصل آباد پاکستان میں پیدا ہوئے۔کنہیالال کپور کے چار مشہور انشائیوں کے نام یہ ہیں: ایک آرٹسٹ، ریڈیو خریدار ہے، چینی شاعری اور بڑے آدمی۔

2۔ کنہیالال کپور کا اولین انشائیوں کا مجموعہ ''سنگ وخشت'' ہے۔ یہ کتاب پطرس بخاری کے نام معنون ہے۔اس میں شامل پانچ انشائیوں کے نام یہ ہیں: انتساب، نام، رومان کی تلاش، علامہ ظہور اور غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں۔

3۔ کنہیالال کپور کا انشائیہ ''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں'' میں شامل تین شعرا کے نام یہ ہیں: م۔ن ارشدؔ، ہیراجیؔ، ڈاکٹر قربان حسین خالصؔ۔

4۔ کنہیالال کپور کے چار کتابوں کے نام یہ ہیں: سنگ وخشت، نوک نشتر، نئے شگوفے، شیشہ و تیشہ

18.9 امدادی کُتب Books Prescribe

ا۔ انتخاب اُردو نثر 1857 1920ء ایجوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ۔

۲۔ انتخاب اُردو نثر 1920 کے بعد ای جوکیشن بک ہ ہاؤس علی گڑھ

Books Recommended.

ا۔ مختصر تاریخ ادب اُردو۔ڈاکٹر سید اعجاز حسین ترجمہ واضافے	ڈاکٹر سید محمد عقیل
۲۔ اُردو ادب میں طنز ومزاح۔	ڈاکٹر وزیر آغا
۳۔ اُردو ادب میں طنز ومزاح۔	غلام احمد فرقت کاکوروی
۴۔ رشید احمد صدیقی۔شخصیت اور فن۔	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
۵۔ اُردو انشائیہ۔	وزیر آغا
٦۔ انشائیہ کے فنی سروکار۔	ڈاکٹر احمد امتیاز

۷۔	انشائیہ کی بنیاد۔	ڈاکٹر سلیم اختر
۸۔	فنِ انشائیہ اور انشائیے۔	ڈاکٹر فرحت شمیم
۹۔	انشائیہ کے خدوخال	وزیر آغا
۱۰۔	انشائیہ کی بنیاد	ڈاکٹر سلیم اختر
۱۱۔	انشائیہ اردو ادب میں	ڈاکٹر انور سدید
۱۲۔	انشائیہ	ڈاکٹر آدم شیخ
۱۳۔	ڈپٹی نذیر احمد احوال و آثار	محمد اکرام چغتائی
۱۴۔	مولوی نذیر احمد احوال و آثار	ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی
۱۵۔	لکچروں کا مجموعہ (مرتبہ)	محمد نذیر حسین
۱۶۔	نذیر احمد	نور الحسن نقوی
۱۷۔	فکر و نظر (ڈپٹی نذیر احمد نمبر) علی گڑھ	
۱۸۔	خواجہ حسن نظامی: شخصیت اور ادبی خدمات	نثار احمد فاروقی
۱۹۔	خواجہ حسن نظامی کی نثر	ڈاکٹر مولا بخش
۲۰۔	خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری	سید محمد نیر رضوی
۲۱۔	خواجہ حسن نظامی کتاب نما	خصوصی شمارہ

سبق نمبر 19۔مجتبیٰ حسین کی انشائیہ نگاری میں طنز ومزاح

ساخت

19.0 اغراض ومقاصد

19.1 تعارف

19.2 مجتبیٰ حسین کی سوانح وشخصیت

19.2.1 مجتبیٰ حسین کے انشائیوں میں طنز ومزاح

19.3 مجتبیٰ حسین کا اسلوب

19.3.1 سرگرمی- صحیح یا غلط

19.4 عمومی جائزہ

19.5 فرہنگ

19.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

19.7 مشقی سوالات

19.8 مشقی سوالات وجوابات

19.9 امدادی کتب

19.0 اغراض ومقاصد

عزیز متعلّم اس سبق کے مطالعے کے بعد اس قابل ہو جائیں گے کہ

مجتبیٰ حسین کے حیات وادبی خدمات سے واقف ہوسکیں گے۔

مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری سے واقف ہوسکیں گے۔

مجتبیٰ حسین کی انشائیہ نگاری کی خصوصیات سے واقف ہوسکیں گے۔

مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ اسلوب سے واقف ہوسکیں گے۔

اردو مزاح نگاری میں مجتبیٰ حسین کا مقام کیا ہے؟ اس سے بھی واقف ہوسکیں گے۔

19.1 تعارف

مجتبیٰ حسین کا شمار اردو کے ممتاز مزاح نگاروں میں ہوتا ہے اور مشتاق یوسفی جیسے مزاح نگار نے مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کو تسلیم کیا تھا۔ یوسفی نے مجتبیٰ حسین کی تین خوبیوں کا اعتراف کیا ہے۔

(۱) قلم برداشتہ لکھتے ہیں۔

(۲) تحریروں میں تکرار کا عمل نہیں ہے۔

(۳) ان کی تحریر میں تروتازگی بھرپور پائی جاتی ہے۔

مجتبیٰ حسین نے طنز ومزاح کی دنیا میں اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے۔ مجتبیٰ حسین نے اردو خاکہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مجتبیٰ حسین نے اردو مزاح نگاری کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو مزاح نگاری میں ان کے کارناموں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مجتبیٰ حسین مزاح کے فن سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ ایک اچھے کالم نویس بھی تھے اور اچھے سفرنامہ نگار بھی تھے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں طنز ومزاح کے عناصر کو شامل کرکے اسے مزید دلچسپ بنادیا ہے۔ مجتبیٰ حسین کی تخلیقات ان کی انشاپردازی کا بین ثبوت ہیں۔ انہوں نے اسی موضوع پر قلم اٹھایا جو وقت کا تقاضا تھا۔ اور ان کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ موضوع ان ہی کے اسلوب کا متقاضی ہے۔ مجتبیٰ حسین کو زبان وبیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ ان کے بیان میں جو ڈرامائیت ہے ان کے اسلوب کا خاصہ ہے۔ ان کے مزاحیہ مضامین قاری کو بار بار پڑھنے پر اکساتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین اپنے عہد کے مزاح نگاروں میں الگ پہچان رکھتے ہیں۔ اس سبق میں مجتبیٰ حسین کی طنز ومزاح پر سیر حاصل گفتگو کرنے کی کوشش کی جائے گی تاکہ طلبہ وطالبات کو مجتبیٰ حسین کے فکر وفن سے گہری واقفیت ہوسکے۔

19.2 مجتبیٰ حسین کی سوانح و شخصیت

مجتبیٰ حسین کا وطن عزیز گلبرگہ تھا اور ان کے آبا و اجداد عثمان آباد کے تھے۔ ان کے والد کا نام احمد حسن تھا۔ آپ کی ولادت 15 جولائی 1936 میں ہوئی لیکن کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ ان کی سرٹیفیکٹ کے مطابق 15 جولائی 1933 ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد کے زیر نگرانی پوری کی اور اس کے بعد چوتھی جماعت میں گلبرگہ کے مدرسہ تحمانیہ آصف گنج میں داخلہ ملا۔ اس کے علاوہ عثمان آباد میں بھی کچھ عرصہ زیر تعلیم رہے۔ انہوں نے انٹرمیڈیٹ گلبرگہ کے ایک کالج سے 1953 میں اور گریجویشن عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے 1956 میں پورا کیا۔ ان کے آٹھ بھائی تھے، محمد حسین جگر، عابد حسین، ابراہیم جلیس، یوسف حسین، اقبال حسین، محمود حسین، خورشید حسین، سرتاج حسین۔ آپ کی شادی 11 نومبر 1956 کو خاتون ناصرہ ایک صاحبہ سے ہوئی جو رشتے میں چچازاد بہن تھیں۔ مجتبیٰ حسین نے ملازمت کا آغاز روزنامہ ''سیاست'' سے کیا۔ اس کے بعد وہ 1962 سے لیکر 1972 تک محکمہ اطلاعات وتعلقات سے وابستہ رہے۔ علاوہ بریں شعبۂ ریسرچ گجرال کمیٹی دہلی سے بھی منسلک رہے۔ NCERT سے 1973 سے 1991 تک وابستہ رہے اور جب ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو وہ ''سیاست'' میں مستقل طور پر لکھنے لگے۔

مجتبیٰ حسین کی ادبی شخصیت کے مختلف جہات ہیں۔ انہوں نے ادب کی جن اصناف پر طبع آزمائی کی ان میں اپنے لیے منفرد راستہ ڈھوند لیا ہے ان کی متعدد تصانیف ہیں۔ ان کی تصانیف میں تکلف برطرف (1968)، قطع کلام (1964)، قصہ مختصر (1972)، بہرحال (1974)، آدمی نامہ (خاکہ) 1981، بالآخر (1982)، جاپان چلو جاپان چلو (سفرنامہ) 1987، الغرض (1987)، آخرکار (1997)، ہوئے ہم دوست جس کے (خاکے) 1999، میرا کالم 1999، امریکہ گھاس کاٹ رہا ہے (سفرنامہ) اہم تصانیف ہیں۔ علاوہ بریں مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں حسن چشتی (2004) نے مرتب کی ہے۔ مجتبیٰ حسین کے سفرنامے (2003)، مجتبیٰ حسین، منتخب کالم، شیشہ و تیشہ وغیرہ بہت سی تخلیقات جو ان کے فکر و فن کے تنوع کو ظاہر کرتی ہیں۔ مجتبیٰ حسین کے سفرنامے جاپان چلو جاپان چلو کو بہت شہرت حاصل ہوئی اور اس کتاب کے مختلف زبانوں میں تراجم ہوئے۔ یہ بہت ہی دلچسپ مزاحیہ سفرنامہ ہے۔

مجتبیٰ حسین نے بہت سے بیرونی ممالک کا سفر کیا اور اپنے سفری مشاہدات کو سپرد قلم بھی کیا۔ انہوں نے جاپان، انگلستان، پیرس، امریکہ، کینیڈا، پاکستان، سعودی عرب، مسقط کی سرزمین پر وارد ہی نہیں ہوئے بلکہ اپنے سفری مشاہدات و تجربات کو قاری کے لیے رقم بھی کیا۔ ان کے مزاحیہ سفرنامے بھی قاری کو زیر لب مسکرانے پر مجبور کرتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں متعدد انعامات واعزازات سے نوازا بھی گیا جن اعزازات میں سے ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ، نشان امتیاز (بزم ساز وادب، دہلی)، غالب ایوارڈ، کل ہند مخدوم ادبی ایوارڈ، میر تقی میر ایوارڈ (امریکی فیڈریشن آف مسلمس آف انڈیا آریجن)، پدم شری (حکومت ہند)، ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری (گلبرگہ یونیورسٹی) علاوہ بریں بہت سے اعزازات وانعامات سے نوازا گیا۔ عمر کے آخری پڑاؤ تک وہ ''سیاست'' حیدرآباد میں اپنا کالم تحریر کرتے رہے اور انہوں نے تقریباً 83 سال کی عمر میں اردو ادب میں گراں قدر سرمایہ چھوڑ کر مئی 2020 کو اس دار فانی سے کوچ کیا۔

19.2.1 مجتبیٰ حسین کے انشائیوں میں طنز ومزاح

اردو مزاح نگاری میں ایک اہم نام مجتبیٰ حسین کا ہے۔ ان کے فکر وفن کے مختلف جہات ہیں۔ وہ ایک اچھے کالم نویس بھی تھے، ایک اچھے سفر نامہ نگار اور ایک اچھے انشائیہ نگار بھی۔ انہوں نے غیر افسانوی اصناف میں طنز ومزاح کے جو گل بوٹے سجائے ہیں وہ ان کی انفرادیت کا ضامن ہے۔ مجتبیٰ حسین کا اصل میدان مزاح نگاری ہے۔ مجتبیٰ حسین کے پہلے مضمون کے حوالے سے یہ بات کہی جاتی کہ ان کا پہلا مضمون ''ہم طرفدار نہیں غالب کے سخن فہم ہیں'' لکھا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مجتبیٰ حسین اپنی اولین تخلیق ہی سے حیدرآباد کے اہل قلم کی صف اول میں آ گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجتبیٰ حسین کی ادبی زندگی کا آغاز ہی کالم نویسی سے ہوا ہے اور مجتبیٰ حسین سے قبل کالم نویسی ایک فیچر سے زیادہ کوئی چیز نہ تھی اور کچھ لوگوں نے وقتی طور پر کچھ فکاہیہ کالم تحریر کیا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے روزمرہ کالم کو ہفتہ واری کالم میں اس طرح بدلا کہ ہر کالم ایک ادبی شہ پارہ بن گیا۔ اور انہوں نے متعدد کالم قلم بند کیے۔ ان کے کالموں کے تین انتخاب ''میرا کالم''، مجتبیٰ حسین کے منتخب کالم اور کالم برداشتہ کے نام سے شائع ہو کر داد وتحسین حاصل کر چکے ہیں۔ بقول انور سدید:

> ''مجتبیٰ حسین کے کالم مکمل مضمون کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ بہت معیاری رسائل ان کے کالموں کو انشائیوں کی شکل میں اپنے رسالوں میں جگہ دیتے ہیں۔''

مجتبیٰ حسین کی خوبی یہ ہے کہ وہ تازہ ترین موضوعات پر لکھتے ہیں۔ ان کے کالم کی خصوصیت یہ ہے کہ موضوع اور مضمون دونوں تر وتازہ رہتے ہیں۔ لوگوں کا یہ بھی بیان ہے کہ مجتبیٰ حسین کے کالم اتنے مشہور ہوئے کہ بہت سے ذوق سلیم رکھنے والے افراد سب سے زیادہ ان کے کالم سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے مضامین میں فکر وفن کی وسعت اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ شکیل الرحمٰن نے بجا فرمایا ہے:

''جو فنکار مزاح کی لذت سے آشنا ہیں اور ہنسنے کی لذت جانتے ہیں وہی ادب میں مزاح کا عمدہ اور نفیس معیار پیش کر سکتے ہیں۔مجتبیٰ حسین کے مضامین اس بنیادی سچائی کا احساس دیتے رہتے ہیں۔ان کے مضامین کا داخلی آہنگ، فنکار کے پہچان، احساس حس، تخلیقی آزادی اور اس کی گل افشانی گفتار کے تئیں بیدار رکھتا ہے اور شخصی عمل اور ردِعمل کی لہروں کو مختلف سطحوں پر ابھارتا ہوا مسرت اور آسودگی عطا کرتا ہے۔''

(شکیل الرحمٰن، مجتبیٰ حسین کا فن، حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد، 1987، ص5)

مجتبیٰ حسین اپنے مزاح کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

''میرے نزدیک مزاح انسان کے پیمانہ وجود کے لبریز ہو کر چھلک پڑنے کا نام ہے۔جب انسان کے وجود کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے تو وہ قہقہوں کی شکل میں چھلکنے لگتا ہے۔اس لیے کھوکھلے آدمی اول تو قہقہے نہیں لگاتے اور اگر قہقہے لگاتے بھی ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قہقہے کسی اندھے کنویں کی گہرائیوں سے ابھریں ہوں۔'' (ایضاً، ص17)

مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ مضامین اور انشائیے بہت ہی دلچسپ ہیں۔'تکلف برطرف'، 'قطع کلام'، 'قصہ مختصر'، 'بہرحال'، 'بالآخر'، 'الغرض' وغیرہ ان کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین اور انشائیوں کے اہم مجموعے ہیں جن مضامین کی ادبی دنیا میں غیر معمولی پذیرائی ہوئی۔ان کے انشائیے سب کے لیے ہیں۔ان کے یہاں بے تکلفی پائی جاتی ہے۔وہ قاری کو یہ احساس دلانے میں کامیاب ہوتے ہیں کہ اس انشائیے کے پیچھے کا مقصد کیا ہے۔ان کے انشائیوں کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے انشائیے میں مرکزی بات سے ضمنی بات نکال کر اس کا ایسا تانا بانا بنتے ہیں کی انشائیہ مزید دلچسپ ہو جائے۔مجتبیٰ حسین نے اپنے انشائیوں میں سماجی مسائل کو بحسن خوبی بیان کیا ہے۔ان کے انشائیوں میں موضوعات کی بے پناہ وسعت اور فکر کی بالیدگی پائی جاتی ہے۔ان کی انشائیوں میں جو فکر انگیزی ہے اس سے ان کے معاصرین بھی واقف تھے اور کچھ معاصرین نے ان کے اثرات کو کسی حد تک قبول بھی کیا ہے۔مجتبیٰ حسین کے تمام انشائیوں میں غیر رسمیت اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔انہوں نے اپنے انشائیوں میں مزاح پیدا کرنے کے مختلف پیرائے کا استعمال کیا ہے۔کہیں وہ ''لفظ''، ''اتفاق'' کا بار بار استعمال کر کے انشائیہ کو بہت دلچسپ بنا دیتے ہیں۔انہوں نے ایک انشائیہ مکان مالکوں کو کرایہ وصول کرنے کے طور طریقے کو جو انشائیہ میں قلم بند کیا اس سے ''اتفاق'' کا لفظ بار بار آنے سے قاری زیب لب مسکرانے پر مجبور ہوتا ہے۔

مجتبیٰ حسین کا ایک انشائیہ ''قصہ داڑھ کا درد'' بہت ہی دلچسپ اور معروف انشائیہ ہے۔اس انشائیہ میں انہوں نے دانت کے درد کے

مسائل کو بہت ہی سلیقے اور چابکدستی سے بیان کیا ہے۔ یہ انشائیہ قاری کو مصنف کا ذاتی تجربہ لگتا ہے۔ اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ انسان اپنی زندگی میں بہت سی بیماریوں سے دوچار ہوتا ہے اور درد اور تکالیف برداشت کرتا ہے لیکن دانت کا درد ایک انوکھا درد ہوتا ہے اس تکلیف کا اظہار وہی کرسکتا ہے جس کو اس کا تجربہ حاصل ہو۔ اس انوکھے موضوع کو لیکر جب مجتبیٰ حسین انشائیہ قلم بند کرتے ہیں تو اس میں مزاح کے منفرد پہلو تلاش کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ''قصہ داڑھ کا درد'' سے ایک اقتباس دیکھیے:

''جب داڑھ کا درد اپنی حدوں کو پھلانگ کر کائنات کی وسعتوں میں پھیلنے کی کوشش کرنے لگتا ہے تو آدمی اس درد کی وسعت کے آگے ایک ادنیٰ سا ذرہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ جب پہلے پہل ہمارے سیدھے جبڑے والی داڑھ کا درد حد سے سوا ہو گیا..... ڈاکٹر کے پاس بھاگے وہ ہمیں پہلے سے جانتے تھے لیکن داڑھ کے درد کے ساتھ انہوں نے ہمیں پہچاننے سے انکار کر دیا۔ ہم نے اس بات کی شکایت کی تو بولے ''بھائی صاحب داڑھ کے درد کے بعد آدمی کی پہچان بڑی مشکل ہو جاتی ہے مجھے تو اپنے سارے ہی مریض ''ہم شکل'' نظر آتے ہیں۔ کس کو کہاں تک پہچانوں۔ یوں بھی آپ کے سامنے اگر بہت ساری ڈبل روٹیاں ایک ساتھ رکھ دی جائیں تو آپ ان ڈبل روٹیوں کو کیسے پہچانیں گے۔ اور یہ ڈبل روٹی زید ہے اور وہ ڈبل روٹی بکر ہے ڈاڑھ کے درد کی خوبی یہی ہوتی ہے۔''

مجتبیٰ حسین کے انشائیہ میں طنز و مزاح کے عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ انہوں نے اپنے انشائیوں میں سماج کے مسائل بالخصوص غریبوں کے مسائل کو نہایت چابکدستی سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے ایک انشائیہ سماج کے غریب طبقہ، رکشا چلانے والے پر بھی لکھا ہے اور اس انشائیہ کا نام رکشا والے رکھا ہے۔ یہ بہت ہی دلچسپ اور عمدہ انشائیہ ہے۔ اس انشائیہ کے مطالعہ سے رکشا والے کی زندگی کے مسائل کا پتا چلتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کا ایک صفت یہ بھی ہے کہ انہوں نے طنز و مزاح کو جس بھی صنف میں برتا ہے اس میں اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے لکھا ہے کہ:

''مجتبیٰ حسین کے مزاح میں اپنائیت اور سادگی اتنی ہے کہ پڑھنے والا فوراً ہی ان کی تحریر میں شریک ہو جاتا ہے اور انہی کی نظر سے اشیا، اشخاص یا مناظر کو دیکھنے لگتا ہے۔ اس سے دو باتیں سامنے آتی ہیں ایک یہ کہ مجتبیٰ حسین کی تحریر اور ان کی شخصیت میں ہم آہنگی بہت ہے۔ چنانچہ مزاح پیدا کرنے کے لیے انہیں بالعموم کسی بیرونی سہارے کی کبھی ضرورت نہیں پڑی نہ کسی شعوری کوشش کی۔''

(سید امتیاز الدین، مجتبیٰ حسین جیسا دیکھا جیسا پایا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2013، ص80)

مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری ایک تفریحی فن نہیں ہے بلکہ اس کے پس پردہ انہوں نے زندگی کے مسائل اور سماج کی ریشہ دوانیوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ان کے مزاحیہ مضامین صرف تفریح کا ذریعہ نہیں ہیں بلکہ انہوں نے جن باتوں کا تذکرہ کیا ہے اس کو منطقی استدلال سے کہا ہے۔ ناقدین کا ماننا ہے کہ ان کے مزاح کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ کسی معمولی یا غیر معمولی واقعے کو چھیڑنے کے بعد کبھی کبھی کوئی طوفان امڈ پڑتا ہے لیکن انہوں نے توازن قائم کرنے میں مہارت حاصل کر لی ہے۔مجتبیٰ حسین نے اپنے فنکارانہ جوہر کو بذات خود ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''.....اس کے باوجود میں ہنسنے کا قائل ہوں۔یہی انسان کی شان کج کلاہی ہے اس کا طرہ امتیاز ہے کہ اس کی قسمت بھی جس دن انسان ہنسی کی تقدس اور پاکیزگی کو سمجھ لے گا اور جس پر انسان کو اس کے حصے کے قہقہے مل جائیں گے اس دن یہ دنیا جنت بن جائے گی۔''

(مجتبیٰ حسین، قطع کلام، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2011، ص10)

مختصر طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ مجتبیٰ حسین نے اپنے انشائیوں میں طنز و مزاح کا استعمال بحسن خوبی کیا ہے۔مجتبیٰ حسین انشائیہ کے فن سے اچھی طرف واقف تھے اس کا اندازہ ان کے مضامین سے ہوتا ہے۔انہوں نے طنز و مزاح کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

19.3 مجتبیٰ حسین کا اسلوب

مجتبیٰ حسین اردو کے اہم مزاح نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ان کی مزاح نگاری کی منفرد خصوصیات ہیں۔مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ تخلیقات بہت زیادہ ہیں۔انہوں نے متعدد اصناف مثلاً خاکہ، سفرنامہ، انشائیہ اور کالم کو طنز و مزاح کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے اور مزاحیہ اسلوب کی وجہ سے ہر صنف میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ان کے انشائیے بہت دلچسپ ہیں۔انہوں نے اپنے انشائیوں میں سماج کے اچھوتے موضوعات کو بھی برتا ہے اور معمولی چیز کو غیر معمولی طور پر پیش کیا ہے۔ان کی تخلیقات قطع کلام، قصہ مختصر، بہرحال اور بالآخر میں جتنے انشائیے ہیں وہ ظرافت سے خالی نہیں ہیں۔مجتبیٰ حسین کے بارے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں وہ ایک نشست میں لکھتے ہیں اور قاری انشائیہ کو ایک نشست میں پڑھتا بھی ہے۔ان کے طنز و مزاح کے حوالے سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ایک چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ان کے اسلوب میں جو شیرینی و لطافت ہے اس عہد کے دوسرے مزاح نگاروں کے یہاں کم کم دکھائی دیتی ہے۔اختر حسن نے ان کے اسلوب کے حوالے سے چند نکات اس طرح بیان کیے ہیں:

۱۔ مجتبیٰ حسین کی زبان پہلے صاف ستھری ہوتی تھی اب دھلی ہوئی ہوتی ہے۔اس پر استری بھی پھیر دیتے ہیں۔

۲۔ وہ زبان کے تمام حربوں سے کام لینا سیکھ گئے ہیں۔ اندیشہ اس بات کا پیدا ہو گیا ہے کہ اگر وہ بکثرت اس طرف راغب ہو جائیں تو بھینس کے انڈے سے روغن گل نکالنے کی طرف نہ چلے جائیں۔ لیکن مجتبیٰ حسین کی سلامت روی سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اس وادی پر پیچ سے بھی سلامت گزر جائیں گے۔

۳۔ مجتبیٰ حسین کو اردو کے محاوروں اور روزمروں پر خاص قدرت حاصل ہو گئی ہے جن کے برمحل استعمال سے وہ اپنے مزاح ''چار چاند'' اور اپنے طنز میں آٹھ ستارے تک ٹانک دیتے ہیں۔

۴۔ مجتبیٰ حسین تشبیہ، استعارہ، اشارہ، کنایہ، تلمیح، تمثیل اور تمام صنائع لفظی کے برتنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ اور اس سلیقے کی بدولت مزاح نگاری میں ان کی نبھ رہی ہے۔

۵۔ مجتبیٰ حسین کا اسلوب نگارش سادہ و پرکار ہوتا ہے بالکل خوبان غالب کے مانند۔ داستانی طرز کی نثر لکھنے میں انہیں کمال حاصل ہے۔

پروفیسر عتیق اللہ نے بھی مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ تخلیقات کے حوالے سے بڑی اہم بات کہی تھی۔ انہوں نے اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا:

''مجتبیٰ حسن کی کوئی بھی تحریر بلیغ جملوں سے خالی نہیں ہے۔''

پروفیسر شمیم حنفی صاحب نے مجتبیٰ حسین کے اسلوب بیان کے حوالے سے چند نکات کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

1۔ ان کی تحریروں میں پھکڑ پن کا شائبہ تک نہیں اور ایسی کوئی بات نہیں جس سے کسی کی دل آزاری کا پہلو نکلتا ہو۔

2۔ مجتبیٰ حسین ہمیشہ زمین سے جڑے رہتے ہیں۔

3۔ ہمیں خیالی دنیا کی سیر نہیں کراتے۔

4۔ ان کے اسلوب میں آمد ہی آمد ہے۔

5۔ مجتبیٰ حسین اپنے کو دہراتے نہیں۔

6۔ لکھتے وقت ''آدمی بنے رہتے ہیں''، بقراطیت سے دور رہتے ہیں۔

7۔ مجتبیٰ حسین کے مزاح میں غم کی ایک تہہ نشیں لہر بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

(سید امتیاز الدین متقی، مرتب، مجتبیٰ حسین جیسا دیکھا جیسا پایا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2013، ص 78)

مجتبیٰ حسین نے اپنے انشائیہ میں طنزیہ و مزاحیہ اسلوب اپنایا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجتبیٰ حسین کو زبان، بیان، محاوروں، تشبیہات

واستعارات، علم المعانی پر مکمل قدرت حاصل تھی۔ان کے انشائیوں میں کوئی ایسی عبارت نہیں ملتی ہے جس میں معنی ومفاہیم کی گہرائی وگیرائی نہ پائی جاتی ہے۔لفظوں کے انتخاب کا ہنران کو اچھی طرح آتا تھا اور بعض لفظ ایسے بار بار دہرانے سے مزاح کی ایک کیفیت پیدا ہوتی تھی۔مجتبیٰ حسین نے مزاح پیدا کرنے کے لیے واقعات کا بھی سہارا لیا ہے ظاہر ہے کہ کچھ واقعات تو ایسے ہوتے ہیں جس میں چٹخارہ پیدا کرنے کے لیے نمک مرچ لگایا جاتا ہے لیکن مجتبیٰ حسین نے اس طرح کے مزاح پیدا کرنے میں توازن سے کام لیا ہے مبادہ پھکڑ پن کی بو نہ آنے لگے۔مجتبیٰ حسین نے اپنے انشائیوں میں مزاح پیدا کرنے کے لیے تشبیہات واستعارات کا بخوبی استعمال کیا ہے۔ان کی تشبیہات میں بڑی تازگی اور انفرادیت ہوتی ہے۔ مجتبیٰ حسین منفرد عہد ساز اور نہایت اعلیٰ مقام پر فائز انشائیہ نگار ہیں۔انہوں نے انشائیہ کی صحت مند روایت کو مزید مستحکم کرنے کی سعی کی ہے۔

19.3.1 سرگرمی۔آؤ اپنی پیش رفت جانچیں۔

عزیز طلبا وطالبات آیئے ایک لمحے کے لیے رکیں اب جبکہ آپ نے مجتبیٰ حسین کی سوانحی کوائف اور مجتبیٰ حسین کے انشائیوں میں طنز ومزاح اور ان کے مزاحیہ اسلوب کو پڑھ لیا ہے تو نیچے دی گئی مشق کو حل کریں اور صحیح یا غلط کا نشان لگائیں:

1۔ مجتبیٰ حسین کا آبائی وطن جاپان تھا۔ ( )

2۔ مجتبیٰ حسین نے کبھی بھی دلی کا سفر نہیں کیا تھا۔ ( )

3۔ مجتبیٰ حسین نے جاپان کے تعلق سے ایک سفر نامہ قلم بند کیا ہے۔ ( )

4۔ ''اردو کا آخری قاری'' کے خالق مجتبیٰ حسین ہیں۔ ( )

5۔ ''قصہ داڑھ کے درد کا'' یہ یوسف ناظم کا انشائیہ ہے۔ ( )

19.4 عمومی جائزہ

مجتبیٰ حسین کی ادبی شخصیت کی مختلف جہتیں ہیں۔مجتبیٰ حسین ایک اچھے کالم نویس تھے جو تاحیات ''سیاست'' سے جڑے رہے۔ان کی شہرت کا راز بھی کالم نویسی ہے۔مجتبیٰ حسین نے غیر افسانوی نثر کی متعدد اصناف میں طبع آزمائی کی اور کسی حد تک کامیاب بھی رہے۔انہوں نے

اردو خاکہ نگاری اور سفرنامہ نگاری میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ان کا اہم سفرنامہ ''جاپان چلو جاپان چلو'' بہت مشہور ہوا۔ انہوں نے انیسویں صدی کے آغاز میں ایک دلچسپ سفرنامہ ''امریکہ گھاس کاٹ رہا ہے'' لکھ کر جرأت مندانہ تخلیق کا بین ثبوت فراہم کیا ہے۔ انہوں نے انشائیہ نگاری میں غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی شہرت کا راز ان کے طنزیہ ومزاحیہ اسلوب سے ہے۔ انہوں نے اپنے طنز ومزاح سے سفرنامہ، خاکہ، انشائیہ پر گہرے نقوش ثبت کیے۔ ان کے مزاحیہ مضامین صرف دعوت فکر نہیں دیتے ہیں بلکہ مسرت بہم بھی پہونچاتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کے بارے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ وہ مزاح نگاری کے بے تاج بادشاہ تھے۔ وہ پدم شری جیسے اعزاز سے نوازے گئے۔ ان کا مزاحیہ اسلوب سادہ اور شگفتہ ہے۔ اس میں پھکڑ پن کا شائبہ تک نہیں ہے۔ شستگی، شگفتگی اور برجستگی ان کے اسلوب کی ریڑھ کی ہڈی ہے اور وہ سادگی، سلاست اور روانی سے قاری کو اپنا گرویدہ بنا لینے پر کامیاب نظر آتے ہیں۔ زبان و بیان انتہائی نکھرا اور ستھرا ہے۔ ان کا اسلوب روزمرہ اور محاوروں کی چاشنی سے معمور ہے۔ بات بات میں مزاحیہ پہلو ڈھونڈ نکالنا ان کے مزاح کی انفرادیت بھی ہے اور خاصیت بھی۔

19.5 فرہنگ

1۔ ارتقا : سلسلے وار ترقی

2۔ دلکش : جاذب نظر، خوبصورت

3۔ کلید : کنجی

4۔ شناخت : پہچان

5۔ اعزاز : انعام

6۔ وسعت : کشادگی

7۔ سلاست : روانی، نرمی

8۔ شگفتگی : سرسبزی، فرحت، شادابی

9۔ برجستہ : برمحل

10۔ مسرت : خوشی

19.7 نمونہ برائے امتحانی سوالات

طویل سوالات

1۔ اردو انشائیہ نگاری میں مجتبیٰ حسین کا مقام متعین کیجئے۔

2۔ مجتبیٰ حسین کی سوانحی کوائف کا اجمالی جائزہ لیجئے۔

3۔ مجتبیٰ حسین کے انشائیوں میں طنز و مزاح کے عناصر سے بحث کیجئے۔

4 ۔ مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ اسلوب سے بحث کیجئے۔

مختصر سوالات

1۔ مجتبیٰ حسین کی ابتدائی زندگی کا مختصر جائزہ لیجئے۔

2۔ مجتبیٰ حسین کے کسی ایک انشائیے کا مختصر خلاصہ لکھیے۔

3۔ مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کا اجمالی جائزہ لیجئے۔

4۔ مجتبیٰ حسین کے انشائیہ ''قصہ داڑھ کا درد'' سے آپ نے کیا سمجھا، مختصر جائزہ لیجئے۔

19.7 مشقی سوالات و جوابات

سوالات

1۔ مجتبیٰ حسین کا کونسا سفرنامہ زیادہ مشہور ہوا؟ اور انہوں نے کس ملک کا سفر کیا؟

2۔ مجتبیٰ حسین کے انشائیہ کے اسلوب کی خصوصیات کیا ہیں؟

3۔ مجتبیٰ حسین کی پانچ تخلیقات کے نام لکھیے؟

19.8 مشقی سوالات کے جوابات

1۔ مجتبیٰ حسین کا سفرنامہ ''جاپان چلو جاپان چلو'' بہت مشہور ہوا اور آپ نے اس سفرنامہ میں جاپان کے سفری احوال کو قلم بند کیا ہے۔

2۔ مجتبیٰ حسین نے طنز ومزاح میں اپنی انفرادیت قائم کی ہے۔ان کا اسلوب بہت دلکش ہے۔ان کے اسلوب میں آمد ہی آمد ہے۔ان کی تحریروں میں پھکڑ پن کا شائبہ نہیں ہے۔زبان وبیان،محاوروں پر ان کو قدرت حاصل ہے۔ان کے اسلوب میں شگفتگی، شستگی اور برجستگی پائی جاتی ہے۔

3۔ مجتبیٰ حسین کی پانچ تخلیقات میں جاپان چلو جاپان چلو،امریکہ گھاس کاٹ رہا ہے،قطع کلام، بالآخر،اردو کا آخری قاری،قصہ مختصر وغیرہ ہیں۔

19.9 امدادی کُتب Books Prescribe

۱۔انتخاب اُردو نثر 1857 1920ء ایجوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ۔

۲۔انتخاب اُردو نثر 1920 کے بعد ای جوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ

Books Recommended.

۱۔	مختصر تاریخ ادب اُردو۔ڈاکٹر سید اعجاز حسین ترجمہ واضافے	ڈاکٹر سید محمد عقیل
۲۔	اُردو ادب میں طنز ومزاح۔	ڈاکٹر وزیر آغا
۳۔	اُردو ادب میں طنز ومزاح۔	غلام احمد فرقت کاکوروی
۴۔	رشید احمد صدیقی۔شخصیت اور فن۔	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
۵۔	اُردو انشائیہ۔	وزیر آغا
۶۔	انشائیہ کے فنی سروکار۔	ڈاکٹر احمد امتیاز
۷۔	انشائیہ کی بنیاد۔	ڈاکٹر سلیم اختر
۸۔	فن انشائیہ اور انشائیے۔	ڈاکٹر فرحت شمیم
۹۔	انشائیہ کے خدوخال	وزیر آغا
۱۰۔	انشائیہ کی بنیاد	ڈاکٹر سلیم اختر
۱۱۔	انشائیہ اردو ادب میں	ڈاکٹر انور سدید

۱۲۔	انشائیہ	ڈاکٹر آدم شیخ
۱۳۔	ڈپٹی نذیر احمد احوال و آثار	محمد اکرام چغتائی
۱۴۔	مولوی نذیر احمد احوال و آثار	ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی
۱۵۔	لکچروں کا مجموعہ (مرتبہ)	محمد نذیر حسین
۱۶۔	نذیر احمد	نور الحسن نقوی
۱۷۔	فکر و نظر (ڈپٹی نذیر احمد نمبر) علی گڑھ	
۱۸۔	خواجہ حسن نظامی: شخصیت اور ادبی خدمات	نثار احمد فاروقی
۱۹۔	خواجہ حسن نظامی کی نثر	ڈاکٹر مولا بخش
۲۰۔	خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری	سید محمد نیر رضوی
۲۱۔	خواجہ حسن نظامی کتاب نما	خصوصی شمارہ

سبق نمبر۔20۔مشتاق احمد یوسفی کے انشائیہ میں طنز ومزاح

ساخت

20.0 اغراض ومقاصد

20.1 تعارف

20.2 مشتاق احمد یوسفی کی سوانح وشخصیت

20.2.2 مشتاق احمد یوسفی کے انشائیہ میں طنز ومزاح

20.3 مشتاق احمد یوسفی کا اسلوب

20.3.1 سرگرمی آؤ اپنی پیش رفت جانچیں

20.4 عمومی جائزہ

20.5 فرہنگ

20.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

20.7 مشقی سوالات

20.8 مشقی سوالات کے جوابات

20.9 امدادی کتب

20.0 اغراض ومقاصد

عزیز متعلّم اس سبق کے مطالعے کے بعد اس قابل ہو جائیں گے کہ

مشتاق احمد یوسفی کی حیات وادبی خدمات سے واقف ہوسکیں گے۔

مشتاق احمد یوسفی کے انشائیہ نگاری سے واقف ہوسکیں گے۔

مشتاق احمد یوسفی کے مزاحیہ اسلوب سے واقف ہوسکیں گے۔

مشتاق احمد یوسفی کی مزاح نگاری کی خصوصیات سے واقف ہوسکیں گے۔

مشتاق احمد یوسفی کے اسلوب سے بھی واقف ہوسکیں گے۔

20.1 تعارف

ہر زبان میں طنز ومزاح کو بہت ہی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ظاہر ہے کہ طنز ومزاح کا ادبی سرمایہ اس زبان کی تہذیبی اور فکری رجحان کا آئینہ دار ہوتا ہے۔اس حقیقت سے سب واقف ہیں کہ طنزیہ ومزاحیہ ادب بہت فکر انگیز اور بالیدہ ہوتا ہے۔مشتاق یوسفی اردو مزاحیہ ادب میں ایک اہم نام ہے۔وہ اپنی فکر اور تدابیر کے پیش نظر بلاشبہ اپنے معاصرین میں الگ شناخت رکھتے ہیں۔ان کی تخلیقات کے مطالعہ سے ہماری تہذیبی ترقی اور فکر ونظر کی بالیدگی کا پتا چلتا ہے۔پروفیسر قاضی افضال رقمطراز ہیں:

''یوسفی کی تحریروں پر مغربی ادب کے اثرات ان کے شخصی حوالے، ذخیرے الفاظ، تہذیبی پس منظر ادبی تلمیحات اور ان کی غنائیت بجا طور پر ایسے پہلو ہیں جن کی مدد سے یوسفی کی فنکاری کو کسی حد تک سمجھا جا سکتا ہے۔''

(ڈاکٹر محمد طاہر، مشتاق یوسفی کی ادبی خدمات، شعبۂ اردو، شبلی پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڑھ، 2003)

مشتاق یوسفی اردو کے مزاح نگاروں میں منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ان کا ادبی سفر ارتقائی رہا ہے۔انہوں نے اپنی پہلی تصنیف میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور اسکے بعد کی تصانیف میں انہوں نے فکری وفنی اعتبار سے طنز ومزاح میں ایک نئی روح پھونک دی اور اپنے معاصرین میں سبقت لے گئے۔

20.2 مشتاق یوسفی کی سوانح وشخصیت

مشتاق احمد یوسفی کی پیدائش 4 ستمبر 1923 کو راجستھان میں ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں ہوئی۔آپ کے والد کا نام عبدالکریم خان یوسفی تھا اور وہ جے پور میں قانون ساز اسمبلی کے اسپیکر بھی مقرر ہوئے تھے۔مشتاق یوسفی اتنے معزز اور اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جس کی مناسبت سے ان کی ابتدائی تعلیم بہت اچھے طریقے سے ہوئی۔وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے آگرہ کے بہت اہم کالج سینٹ جانس کالج

سے فلسفہ میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور انہوں نے ہندوستان ہی میں پبلک سرویز کا امتحان بھی پاس کیا۔ 1950 میں مسلم کمرشیل بینک سے وابستہ ہوئے اور ڈپٹی جنرل منیجر کا عہدہ بھی سنبھالا۔ ہندوستان کی تاریخ میں تقسیم ہند کا سانحہ سب سے بڑا المیہ تھا جس نے ہندوستان کی عوام وخواص سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ یہ تقسیم دوقومی نظریے کے بنیاد پر ہوئی اور تقسیم سے سب سے زیادہ نقصان ہندوستان و پاکستان کے مہاجرین کو ہوا۔ مشتاق یوسفی بھی اس ہجرت کے المیے سے دوچار ہوئے وہ ہندوستان میں 1950 تک مقیم رہے لیکن انہوں نے بعد میں پاکستان منتقل ہونے کا فیصلہ کیا اور وہ پاکستان میں جا کر کراچی میں سکونت اختیار کی۔ لیکن وہ پاکستان میں بھی اپنا ذریعہ معاش کے لیے بینک ہی میں ملازمت کرنا پسند کیا۔ وہ پاکستان میں بھی متعدد اہم عہدوں پر فائز ہوئے۔ مینیجنگ ڈائرکٹر کا عہدہ بھی سنبھالا۔ 1975 میں یونائیٹیڈ بینک کے صدر اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ پاکستان بینکنگ کونسل کے صدر نشیں منتخب ہوئے تھے۔ اور تقریباً گیارہ برس وہ لندن میں بھی اپنی خدمات انجام دی ہیں۔ ان تمام ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے ساتھ وہ اردو کے ایک بہت اہم ادیب تھے۔ اردو ادب سے ان کو گہرا لگاؤ تھا۔ اور انہوں نے طنز ومزاح میں بہت شہرت حاصل کی۔ اردو کا مزاحیہ ادب آپ کے ذکر کے بغیر ادھورا رہے گا۔ ان کی تخلیقات اردو ادب کیلئے ایک گراں قدر سرمایہ ہیں۔ ان کی اولین کتاب ''چراغ تلے'' 1961 میں شائع ہوئی اور ان کی دیگر تخلیقات میں ''خاکم بدہن'' 1949، ''زرگزشت'' 1974، ''آب گم'' 1990، آخری کتاب ''شام شہر یاراں'' 2014 قابل ذر ہیں۔ مشتاق یوسفی کا ادبی سفر ارتقائی رہا ہے۔ ان کی تمام تصانیف فکری وفنی اعتبار سے غیر معمولی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کی شخصیت کی طرح ان کی تصانیف بھی اعلیٰ پائے کی ہیں۔ مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو ادب میں وہ ایک گہری چھاپ چھوڑ کر 20 جون 2018 کو 94 برس کی عمر میں اس دار فانی سے رحلت کر گئے۔

20.2.1 مشتاق یوسفی کے انشائیہ میں طنز ومزاح

مشتاق احمد یوسفی نے چار کتابیں قلم بند کر کے اردو طنز ومزاح کے میدان میں اپنے معاصرین پر سبقت لے گئے جن میں چراغ تلے، خاکم بدہن، زرگزشت اور آب گم ہیں۔ چراغ تلے اور خاکم بدہن ان کے انشائیوں کے مجموعے ہیں۔ ڈاکٹر محمد طاہر نے لکھا ہے کہ:

> ''پہلی تصنیف چراغ تلے میں پڑیے گر بیمار، کافی، یادش بخیر، موزی، سند، جنون لطیفہ، چارپائی اور کلچر، اور آنا گھر میں مرغیوں کا، کرکٹ، صنف لاغر، موسموں کا شہر اور کاغذی ہے پیرہن کے عنوانات بارہ انشائیے شامل ہیں۔ اگر مقدمہ پہلا پتھر کو بھی اس فہرست میں شامل کر لیا جائے تو ان کی تعداد تیرہ ہو جائے گی کیونکہ کتاب کا مقدمہ بھی انشائیے کے

طرز میں لکھا گیا ہے اور اس میں تمام اجزا شامل ہیں جو ایک انشائیے کے لیے لازمی قرار پاتے ہیں نیز یوسفی نے اس کا عنوان بھی مقدمے کے بجائے پہلا پتھر رکھا ہے۔ چراغ تلے میں شامل انشائیوں کے عنوانات سے ہی ان کے متنوع ہونے کا اشارہ ہوتا ہے۔'' (ایضاً،ص105)

مشتاق یوسفی کے انشائیوں کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ انہوں نے سماج اور معاشرے کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ چراغ تلے کے انشائیوں میں قاری کے دلچسپی کو برقرار رکھا ہے۔ مشتاق یوسفی نے جو مقدمہ ''پہلا پتھر'' کے نام سے قلم بند کیا ہے اس میں انشائیے کی خوبی موجود ہے۔ انہوں نے اس انشائیے میں اپنی بیوی کا تعارف کرنے کے ساتھ قاری کو مرزا عبداللہ بیگ کی شخصیت کا تعارف کرایا ہے اور یادش بخیر ناسٹلجیائی کیفیت سے دوچار لوگوں کے حالات کو مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے ان کے مضامین میں طنز و مزاح کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ مقدمہ ''پہلا پتھر'' ان مصنفین کے لیے ہے جو مقدمہ لکھتے نہیں لکھواتے ہیں، گویا دونوں کی حرکتوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

مجموعہ ''چراغ تلے'' میں ایک انشائیہ بعنوان ''پڑیے گر بیمار'' بہت ہی دلچسپ انشائیہ ہے اس انشائیے کی وساطت سے ان لوگوں کی حرکتوں سے قاری کو روشناس کرایا ہے جو عیادت کے لیے مریض کے پاس جاتے ہیں لیکن بجائے اسے تسلی دینے کے اس کو دوسرے وہم میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی اپنی طویل بیماریوں کی داستان اس انداز سے بیان کرتے ہیں جس سے وہ مریض نئے مسائل سے دوچار ہو جاتا ہے اس طرح کے موضوعات سے مشتاق یوسفی نے سماج کے حقیقی مسائل کو طنز و مزاح کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے طنز و مزاح کو انوکھے انداز میں پیش کیا ہے اس کی وجہ سے وہ اپنے معاصرین میں سب سے آگے نظر آتے ہیں۔ نامی انصاری نے لکھا ہے:

''مشتاق احمد یوسفی اس عہد کے سب سے بڑے مزاح نگار ہیں۔ انہوں نے اس فن میں پطرس اور رشید احمد صدیقی کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ان کی تحریروں میں جو ندرت، شائستگی، دقت نظر، معنی آفرینی، بالغ نظری، طرفگی و شگفتگی ہے وہ انہی سے مختص ہے۔ یوسفی صاحب بہت کم لکھتے ہیں اور اپنی تحریروں پر بے پناہ محنت کرتے ہیں۔ ایک ایک لفظ دقت نظر سے جانچتے ہیں۔ تحریر مکمل کرنے کے بعد اس کو پال میں رکھ دیتے ہیں۔ اگر اس کے رنگ، خوشبو اور ذائقے سے مطمئن ہو گئے تو اشاعت کے لیے دے دیتے ہیں ورنہ ضائع کر دیتے ہیں۔''

(نامی انصاری، بیسویں صدی میں طنز و مزاح، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2015)

مشتاق یوسفی نے انشائیہ ''پڑیے گر بیمار'' میں عیادت کرنے والوں کے تعلق سے لکھا ہے کہ:

''میں اس جسمانی تکلیف سے بالکل نہیں گھبراتا جو لازماً علالت ہے اسپر بن کی صرف ایک گولی یا مارقیا کا صرف ایک انجکشن اس سے نجات دلانے کے لیے کافی ہے۔لیکن اس روحانی اذیت کا کوئی علاج نہیں جو عیادت کرنے والوں سے مسلسل پہنچتی رہتی ہے۔'' (مشتاق احمد یوسفی، چراغ تلے، راہی کتاب گھر، دہلی، 2012، ص20)

مشتاق یوسفی کی کتاب ''خاکم بدہن'' میں شامل انشائیے بہت دلچسپ ہیں اور قاری کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔اس میں ایک انشائیہ کا نام سزرماتاہری اور مرزا کے عنوان سے ہے لیکن اس انشائیے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں مرزا شخصیت کے علاوہ سیزرکتا اور ماتاہری کتیا کے گرد خیالات کا تانا بانا بننے کی کوشش کی گئی ہے۔مشتاق یوسفی نے اس انشائیے کی وساطت سے سماج کی بہت سی برائیوں کی نقاب کشائی کی ہے۔اس انشائیہ میں کتوں کے متعلق معلومات اور ان کے نام نسل اور کتے کی دم کی اہمیت وافادیت پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

''غور کرو تو دم دار جانوروں میں کتا ہی تنہا ایسا جانور ہے جو اپنی دم بطور آلہ خلوص اور خوشنودی استعمال کرتا ہے۔ورنہ باقی ماندہ گنوار جانور تو اپنی پونچھ سے صرف مکھیاں اڑاتے ہیں۔دنبہ یہ بھی نہیں کرسکتا اس کی دم صرف کھانے کے کام آتی ہے۔البتہ بیل کی دم سے ایکسی لیٹر کا کام لیا جاتا ہے۔ایک فرانسیسی ادیبہ کیا خوب کہہ گئی ہیں آدمیوں کو جتنے قریب سے دیکھتی ہوں اتنے ہی کتے اچھے لگتے ہیں۔'' (بحوالہ: ڈاکٹر محمد طاہر، مشتاق یوسفی ادبی خدمات، ص117)

یوسفی کے انشائیے سماجی حقیقت کے غماز ہیں۔ناقدین کا ماننا ہے کہ یوسفی کے انشائیے طربیہ انداز میں تو شروع ہوتے ہیں لیکن اس کا انجام المیہ ہوتا ہے۔خاکم بدہن مجموعے کے ایک انشائیہ کا عنوان ''بارے آلو کا کچھ بیاں ہوجائے'' یہ انشائیہ طنز ومزاح سے بھرپور ہے۔اس میں بھی یوسفی نے قاری کو اچھا خاصا چکما دیا ہے کہ قاری کبھی آلو کی مدح سرائی سے لطف اندوز ہوتا ہے کہ کبھی اس کی برائی اور نقصانات سے آگاہ ہوتا ہے۔آلو کو بطور ڈش پیش کرتے ہوئے یوسفی لکھتے ہیں:

''آلو مٹر، آلو گوبھی، آلو میتھی، آلو گوشت، آلو مچھی، آلو بریانی، آلو کوفتہ، آلو پڑیاں، آلو سموسہ، آلو کا رافتہ، آلو کا بھرتا، آلو کیمیاں، آلو کھیر،.....آلو بریاں، آلو نیم عریاں بلکہ کہیں کہیں بالکل عریاں۔''

مشتاق احمد یوسفی نے اپنے تمام انشائیوں میں جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے وہ موضوعات بہت دلچسپ ہیں اور قاری کو اپیل بھی کرتے ہیں۔اور ان کے یہاں انتشار بھی ہے لیکن قاری کو کبھی بھی بے ربطی کا احساس نہیں ہوتا ہے اور یوسفی کے یہاں ناسٹلجیائی کیفیت بھی پائی

جاتی ہے اور ماضی پرستی ان کے مجموعے خاکم بدہن میں زیادہ ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کے فکروفن کے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو جملہ سازی کا فن آتا تھا اور ناقدین کا ماننا ہے کہ رشید احمد صدیقی کی طرح یوسفی بھی اپنے طنز ومزاح کو اقوال زریں میں سجاتے اور سنوارتے بھی تھے۔ مشتاق یوسفی کا کمال یہ ہے کہ ان کے قول اور ان کے بیانات اور کہانیوں سے اسی طرح وابستہ ہوگئے کہ اس کو اس سے جدا نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ان کے اقوال ہماری زندگی کی کسی حقیقت کے پروردہ ہوتے ہیں۔ چند اقوال مظہر احمد کی کتاب سے نقل کرتا ہوں۔

''کلام غالب کی سب سے بڑی مشکل اس کی شرحیں ہیں ورنہ غالب کا سمجھنا چنداں مشکل نہیں۔''

آب گم

''اپنا عقیدہ ہے کہ جسے ماضی یاد نہیں رہتا اس کی زندگی میں شاید کبھی کچھ ہوا ہی نہیں، لیکن جو اپنے ماضی یاد نہیں کرنا چاہتا وہ یقیناً لوفر رہا ہوگا۔''

چراغ تلے

20.3 مشتاق یوسفی کا اسلوب

کسی بھی فن پارے کا تعین قدر اس کے اسلوب بیان سے ہوتا ہے۔ موضوعات یکساں ہونے کے باوجود ایک اچھا فنکار اسلوب کی بنیاد پر ایک دوسرے پر سبقت لے جاتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کا اپنا منفرد اسلوب تھا اور اپنے اس منفرد اسلوب بیان سے اپنے معاصرین مزاح نگاروں میں اپنی نہ صرف الگ شناخت قائم کی بلکہ ان کے معاصرین نے بھی یوسفی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے۔ مشتاق یوسفی کی تخلیقات بالخصوص ان کے انشائیوں کے پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ اردو زبان تہذیبی اور فکری اعتبار سے ارتقا کی متعدد منازل طے کر چکی ہے۔ ان کے سادہ، شگفتہ اور لطیف اسالیب نے دوسرے مزاح نگاروں کو رشک کرنے پر مجبور کیا ہے۔ ان کی تحریریں اردو زبان کی فکری بازیافت ہیں۔ مشتاق یوسفی کی ایک خوبی جزئیات نگاری ہے۔ وہ کسی بھی واقعہ کو جب بیان کرتے ہیں تو وہ تمام پہلوؤں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ غنائیت، رنگین بیانی، ادبی تلمیحات، منظر نگاری، شوخی، نادر تشبیہات، لطافت، مبالغہ آرائی کا استعمال نہایت چابکدستی سے کیا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی نے اردو طنز ومزاح کو اپنے انشائیوں کے ذریعہ ایک نئی راہ دکھائی جس طرح ان کے انشائیوں میں خیال کی ندرت، فکر کا تنوع ہے اسی طرح ان کے اسلوب بیان میں بلا کا تنوع پایا جاتا ہے۔ مشتاق یوسفی کے انشائیوں کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کو زبان وبیان پر بڑی قدرت حاصل تھی اور بے جا الفاظ کے استعمال سے گریز کرتے ہوئے برمحل الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔ لفظوں کا انتخاب بھی ایک تخلیق

کار کے وسعت مطالعہ کا ضامن ہوتا ہے اور نادر تشبیہات اور استعارات کا برمحل استعمال کرنا ہر تخلیق کار کی بس کی بات نہیں ہے۔ یوسفی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ بدیع تشبیہات یعنی ایسی انوکھی اور طنز و مزاح سے بھرپور تشبیہات ایجاد کرتے ہیں جو قاری کو حیرت و استعجاب میں ڈال دیتی ہے۔ شائستہ طنز کا بھرپور استعمال ان کے یہاں ملتا ہے۔ نقادوں نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کے اسلوب کا ایک بڑا ہتھیار ''تحریف'' ہے وہ مشہور اشعار، ضرب الامثال، اور ادبی مقولوں میں معمولی سی تبدیلی کر کے اور اس میں ایسا مزاح پیدا کرتے ہیں جس میں طنز کی بھی آمیزش ہوتی ہے۔ ابن انشاء نے لکھا ہے کہ:

> ''یوسفی ایسے زمانے میں پیدا ہوئے، جب کہ زبان و ادب کی باریکیوں پر لوگوں کی نظر نہیں ورنہ ہم انہیں پیش قرار تنخواہ دے کر اور خلعت فاخرہ عطا کر کے بٹھا دیتے کہ بیٹھے ضرب الامثال اور اقوال حکمت گھڑتے رہیے۔ ان کی ٹکسال کے سکے تو ''چراغ تلے'' کے زمانے کے ہی اب تک چل رہے ہیں۔ ''خاکم بدہن'' میں کچھ اور نکھار آ گیا ہے..... یوسفی کے مزاح کی چند خصوصیات ہیں جنہیں جاننے والے جانتے ہیں ان کے یہاں مزاح واقعاتی یا سانحاتی نہیں ہے بلکہ گفتگو اور تبصرے کا ہے۔ شستگی اس مزاح کا جوہر ہے اور اس میں اس طرح کی خود کلامی ہے جیسی کسی ذاتی ڈائری میں ہوتی ہے۔ اس میں خلوص بھی ہوتا ہے جس مزاح میں یہ شائبہ ہو کہ گیلری کو سامنے رکھ کر لکھا ہے اس میں خواہی نخواہی چیز اس مارنے کی فرمائشی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔''
>
> (ڈاکٹر مظہر احمد (مرتب)، صاحب طرز ظرافت نگار، مشتاق احمد یوسفی ایک مطالعہ، کتابی دنیا، دہلی، 2010، ص182-180)

مشتاق یوسفی کے اسلوب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اپنی بات کو نہایت چابکدستی سے حتمی انداز میں کہتے ہیں۔ وہ بغیر کسی دباؤ کے اپنی بات کو قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ یوسفی کے اسلوب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کہیں کہیں انہوں نے ہم وزن الفاظ اور قافیہ کے استعمال سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ کسی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ یوسفی نے کہیں کہیں مزاح پیدا کرنے کے لیے غلط تلفظ کی ادائیگی کا بھی سہارا لیا ہے اور کہیں کہیں خود اپنے آپ ہنسنے اور اپنا مذاق اڑاتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے کہانیوں کے استعمال سے بھی مزاح پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔ کچھ نقادوں نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مشتاق احمد یوسفی کا اسلوب رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری کے اسلوب کی چغلی کھاتا ہے۔ ہمارے خیال میں اس میں کوئی عیب نہیں ہے کیونکہ ہر فنکار اپنے پیش روؤں سے ہی استفادہ کرتا ہے۔ مشتاق یوسفی نے اس استفادہ

کے ساتھ بھی اپنا منفرد مقام حاصل کیا ہے۔ مشتاق یوسفی کے اسلوب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے خیالات گنجلک نہیں ہے اور زبان سادہ اور سلیس ہے اور زبان ثقیل نہ ہونے کی وجہ سے عام قاری ان کے خیالات اور مزاح سے پوری طرح لطف انداز ہوتا ہے۔ اس لیے مشتاق یوسفی اپنے معاصرین مزاح نگاروں میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔

20.3.1 سرگرمی- آؤ اپنی پیش

عزیز طلبا وطالبات آیئے ایک لمحے کے لیے رکیں اب جبکہ آپ نے مشتاق احمد یوسفی کی سوانحی کوائف اور ان کی مزاح نگاری اور اسلوب کا بغور مطالعہ کرلیا ہے تو نیچے دی گئی مشق کو حل کرنے کی کوشش کریں اور صحیح یا غلط کا نشان لگائیں:

1۔ مشتاق احمد یوسفی نے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کیا تھا۔ ( )

2۔ ''چراغ تلے'' مشتاق احمد یوسفی کی تخلیق نہیں ہے۔ ( )

3۔ مشتاق یوسفی نے بنگلہ زبان میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ( )

4۔ مشتاق یوسفی کے اسلوب پر رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ ( )

5۔ مشتاق یوسفی کے والد کا نام عبدالکریم خاں یوسفی تھا۔ ( )

20.4 عمومی جائزہ

اردو طنز ومزاح کی روایت میں مشتاق احمد یوسفی کا اہم نام ہے۔ انہوں نے اپنے انشائیوں میں طنز ومزاح کے گل بوٹے سجائے ہیں۔ ان کے انشائیے قاری کو بار بار پڑھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ چراغ تلے، یوسفی کی انشا پردازی کا بین ثبوت ہے اور طنز ومزاح نگاری میں ان کا اپنا منفرد اسلوب ہے۔ وہ الفاظ، محاوروں اور کہاوتوں کی فنی ومعنوی جہات سے مزاح اور طنز کے نئے پہلو تراشتے ہیں۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ سیاست، معیشت اور کلچر کے باہمی رشتوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کی تخلیقات میں یہ تمام چیزیں موجود ہیں۔ مشتاق یوسفی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان ہی کا موضوع ہے اور وہ موضوع ان ہی کے اسلوب کا متقاضی بھی ہے۔

یوسفی کو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ان کے بیان میں جو ڈرامائیت ہے یہ ان کے اسلوب کا خاصہ ہے ان کے تمام انشائیے صرف دعوت فکر نہیں دیتے بلکہ قاری کو مسرت بہم پہنچاتے ہیں۔اپنے اسلوب کی وجہ سے اردو مزاح نگاری میں وہ اہم مقام رکھتے ہیں۔

20.5 فرہنگ

1۔ مشتاق	:	چاہنے والا
2۔ غنائیت	:	آواز، کیفیت
3۔ سانحہ	:	پیش آنے والا واقعہ
4۔ مسرت	:	خوشی
5۔ مبہم	:	غیر واضح، چھپا ہوا
6۔ امتزاج	:	آمیزش، اتحاد
7۔ عیادت	:	بیمار پرسی، بیمار کی خبر لینا
8۔ شوخی	:	بے باکی، گستاخی، بے حجابی
9۔ عقیدہ	:	ایمان، یقین
10۔ فرہنگ	:	آگاہی، دانائی، سمجھ بوجھ

20.8 نمونہ برائے امتحانی سوالات

طویل سوالات

1۔ مشتاق احمد یوسفی کی ابتدائی زندگی کے احوال قلم بند کیجئے۔

2۔ مشتاق احمد یوسفی کی سوانحی کوائف پر سیر حاصل گفتگو کیجئے۔

3۔ مشتاق احمد یوسفی کی انشائیہ نگاری کی انفرادیت واضح کیجئے۔

4 ۔ مشتاق احمد یوسفی کے مزاحیہ اسلوب سے بحث کیجئے۔

مختصر سوالات

1۔ مشتاق احمد یوسفی کے کسی ایک انشائیہ کا خلاصہ لکھئے۔

2۔ مشتاق احمد یوسفی کے ادبی اعزازات وانعامات کے حوالے سے اظہار خیال کیجئے۔

3۔ مشتاق احمد یوسفی کے انشائیہ ''جنون لطیفہ'' کے موضوع سے بحث کیجئے۔

4۔ اردو مزاح نگاروں میں مشتاق احمد یوسفی کا مقام متعین کیجئے۔

20.7 مشقی سوالات وجوابات

1۔ مشتاق احمد یوسفی کی پیدائش کب اور کہاں اور آپ کے والد کا نام کیا تھا۔

2۔ مشتاق احمد یوسفی کی چار تخلیقات کے نام مع سن اشاعت لکھئے۔

3۔ مشتاق احمد یوسفی کے پانچ اہم انشائیوں کے نام لکھیے۔

4۔ مشتاق احمد یوسفی نے ہندوستان سے پاکستان کب ہجرت کی اور ان کا انتقال کب ہوا؟

20.8 مشقی سوالات کے جوابات

1۔ مشتاق احمد یوسفی کی پیدائش 4 ستمبر 1923 کو راجستھان کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام عبدالکریم خان یوسفی تھا۔

2۔ مشتاق احمد یوسفی کے چار تخلیقات کے نام چراغ تلے (1941)، خاکم بدہن (1949)، زرگزشت (1974)، آب گم (1990) ہیں۔

3۔ مشتاق احمد یوسفی کے پانچ اہم انشائیوں میں پہلا پتھر، چراغ تلے، پڑیے گر بیمار، اور آنا گھر میں مرغیوں کا، جنون لطیفہ ہیں۔

4۔ مشتاق احمد یوسفی نے 1950 میں ہندوستان سے پاکستان ہجرت کیا اور 94 سال کی عمر میں 20 جون 2018 کو وفات پائی۔

20.9 امدادی کُتب Books Prescribe

ا۔انتخاب اُردو نثر 1857 1920ء ایجوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ۔

۲۔انتخاب اُردو نثر 1920 کے بعد ای جوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ

Books Recommended.

۱۔	مختصر تاریخ ادب اُردو۔ڈاکٹر سید اعجاز حسین ترجمہ واضافے	ڈاکٹر سید محمد عقیل
۲۔	اُردو ادب میں طنز ومزاح۔	ڈاکٹر وزیر آغا
۳۔	اُردو ادب میں طنز ومزاح۔	غلام احمد فرقت کاکوروی
۴۔	رشید احمد صدیقی۔شخصیت اور فن۔	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
۵۔	اُردو انشائیہ۔	وزیر آغا
۶۔	انشائیہ کے فنی سروکار۔	ڈاکٹر احمد امتیاز
۷۔	انشائیہ کی بنیاد۔	ڈاکٹر سلیم اختر
۸۔	فنِ انشائیہ اور انشائیے۔	ڈاکٹر فرحت شمیم
۹۔	انشائیہ کے خدوخال	وزیر آغا
۱۰۔	انشائیہ کی بنیاد	ڈاکٹر سلیم اختر
۱۱۔	انشائیہ اردو ادب میں	ڈاکٹر انور سدید
۱۲۔	انشائیہ	ڈاکٹر آدم شیخ
۱۳۔	ڈپٹی نذیر احمد احوال وآثار	محمد اکرام چغتائی
۱۴۔	مولوی نذیر احمد احوال وآثار	ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی
۱۵۔	لکچروں کا مجموعہ (مرتبہ)	محمد نذیر حسین
۱۶۔	نذیر احمد	نور الحسن نقوی
۱۷۔	فکر ونظر (ڈپٹی نذیر احمد نمبر) علی گڑھ	
۱۸۔	خواجہ حسن نظامی: شخصیت اور ادبی خدمات	نثار احمد فاروقی
۱۹۔	خواجہ حسن نظامی کی نثر	ڈاکٹر مولا بخش
۲۰۔	خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری	سید محمد نیر رضوی
۲۱۔	خواجہ حسن نظامی کتاب نما	خصوصی شمارہ

جموں یونیورسٹی

مرکز برائے فاصلاتی وآن لائن تعلیم

ایم اے اردو سمسٹر سوم

کورس کوڈ:URD-306 عنوان: غیر افسانوی ادب

ماڈل پرچہ

وقت:2 گھنٹے 30 منٹ کل نمبر:70

ہدایات تمام۔ ہدایت: تمام سوالات حل کرنا لازمی ہے۔ ہر سوال میں داخلی انتخاب دیا گیا ہے، لہٰذا ہر سوال کے دیے گئے متبادل میں سے کسی ایک کا انتخاب کر کے اس کا جواب تحریر کیجیے۔ تمام معروضی سوالات لازمی ہیں۔

سوال نمبر 1۔ الف۔ انشائیہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے اس کے بنیادی فنی اوصاف پر روشنی ڈالیے۔

یا

ب۔ اردو انشائیہ کے آغاز اور ارتقا پر مختصر نوٹ لکھیے۔ 7 نمبر

سوال نمبر 2۔ الف۔ سرسید احمد خاں کے انشائیہ تعصب کے فکری پہلوؤں پر روشنی ڈالیے۔

یا

ب۔ مولوی ذکاء اللہ کے مضمون کیا غلط خیال ہے کہ زمانہ برسرتنزل ہے کے بنیادی خیال کو واضح کیجیے۔ 7 نمبر

سوال نمبر 3۔ الف۔ اردو کے غیر افسانوی ادب میں طنز و مزاح کی روایت کا جائزہ لیتے ہوئے رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، کرشن چندر، مجتبیٰ حسین اور مشتاق احمد یوسفی کی خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

یا

ب۔ رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری کے طنزیہ و مزاحیہ اسلوب کا تقابلی مطالعہ کیجیے۔ 14 نمبر

سوال نمبر4۔ الف۔کرشن چندر،مجتبیٰ حسین اور مشتاق احمد یوسفی کے غیر افسانوی ادب کی فنی وفکری خصوصیات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

یا

ب۔اردو کے جدید طنزیہ ومزاحیہ ادب میں منتخب ادیبوں کے اسلوب اور طرزِ اظہار کی خصوصیات بیان کیجیے۔ 14 نمبر

سوال نمبر5۔ الف۔رشید احمد صدیقی کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات بیان کیجیے۔

یا

ب۔وکیل صاحب کے حوالے سے رشید احمد صدیقی کے طنزیہ ومزاحیہ انداز پر روشنی ڈالیے۔ 7 نمبر

سوال نمبر6۔ الف۔پطرس بخاری کے طنزیہ ومزاحیہ اسلوب کی خصوصیات بیان کیجیے۔

یا

ب۔مجتبیٰ حسین کے طنزیہ ومزاحیہ فن پر مختصر نوٹ لکھیے۔ 7 نمبر

سوال نمبر7۔درج ذیل سوالات کے درست جواب کا انتخاب کیجیے۔

1۔ انشائیہ بنیادی طور پر کس صنف سے تعلق رکھتا ہے؟

الف۔شاعری ب۔نثر

ج۔داستان د۔ناول

2۔ وکیل صاحب کے مصنف کون ہیں؟

الف۔پطرس بخاری ب۔رشید احمد صدیقی

ج۔کرشن چندر د۔مجتبیٰ حسین

3۔ پطرس بخاری کی نثر کی نمایاں خصوصیت کیا ہے؟

الف۔طنز ومزاح ب۔رزمیہ انداز

ج۔داستانویت د۔المیہ پن

4۔ **غالب جدید شعرا کی محفل میں کس کا ہے؟**

الف۔رشید احمد صدیقی　　ب۔پطرس بخاری

ج۔کرشن چندر　　د۔مشتاق احمد یوسفی

5۔ **اردو کا آخری قاری کس کا انشایہ ہے۔**

الف۔رشید احمد صدیقی　　ب۔پطرس بخاری

ج۔مجتبیٰ حسینس　　د۔مشتاق احمد

6۔ **مجتبیٰ حسین بنیادی طور پر کس حوالے سے معروف ہیں؟**

الف۔طنز و مزاح　　ب۔مرثیہ نگاری

ج۔غزل گوئی　　د۔داستان نگاری

7۔ **مشتاق احمد یوسفی کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت کیا ہے؟**

الف۔طنز و مزاح　　ب۔رزمیہ شاعری

ج۔عشقیہ شاعری　　د۔صوفیانہ اسلوب

8۔ **غیر افسانوی ادب میں انشائیہ کا بنیادی وسیلہ کیا ہے؟**

الف۔نثری اظہار　　ب۔عروض

ج۔قافیہ　　د۔ردیف

9۔ **طنز کا بنیادی تعلق کس چیز سے ہے؟**

الف۔معاشرتی رویوں پر معنی خیز تنقید　　ب۔صرف تاریخی واقعات

ج۔صرف عشقیہ جذبات　　د۔صرف داستانی واقعات

10۔ **مزاح کا بنیادی مقصد کیا ہوتا ہے؟**

الف۔شگفتگی پیدا کرنا　　ب۔خوف پیدا کرنا

ج۔المیہ کیفیت پیدا کرنا　　د۔رزمیہ کیفیت پیدا کرنا

11۔ انشائیہ میں مصنف کے کس پہلو کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے؟

الف۔شخصی اندازِ فکر و اظہار　　ب۔صرف تاریخی معلومات

ج۔صرف شعری اوزان　　د۔صرف داستانی واقعات

12۔ پطرس بخاری کے اسلوب میں کون سا عنصر نمایاں ہے؟

الف۔شگفتگی　　ب۔رزمیہ پن

ج۔المیہ پن　　د۔داستانویت

13۔ کرشن چندر کی تحریروں میں کون سا عنصر نمایاں ہے؟

الف۔انسانی اور سماجی شعور　　ب۔صرف صوفیانہ فکر

ج۔صرف رزمیہ عناصر　　د۔صرف عشقیہ موضوعات

14۔ مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں کس عنصر کو خصوصی اہمیت حاصل ہے؟

الف۔طنز و مزاح　　ب۔مرثیہ

ج۔قصیدہ　　د۔مثنوی

Course Contributors and Content Editing:

Dr. Shah Alam
Professor
Department of Urdu, Jamia Millia Islamia.

Dr Sayeed Ahmad
Assistant Prof. Department of Urdu
Aliah University, Park Circus Campus, Kolkata, West Bengal
PIN Code: 700014
Email id sayeed@aliah.ac.in 9868959972/ 8448370353

Content Editing/ Proofreading

Dr. Parshotam Paul Singh
Assistant professor,
Department of Urdu, CDOE.
University Of Jammu, Jammu.

© Centre for Distance & online Education, University of Jammu, 2026

* All rights reserved. No part of this work may be reproduced in any form, by mimeograph or any other means, without permission in writing from CDOE, University of Jammu.
* The script writer shall be responsible for the lesson/script submitted to CDOE and any plagiarism shall be his/her entire responsibility.

Printed By : Rahul Army Printers/ 2026/100 Nos.

CENTRE FOR DISTANCE & ONLINE EDUCATION
UNIVERSITY OF JAMMU

SELF LEARNING MATERIAL

FOR

M.A. URDU

SEMESTER -III

SESSION - 2025 ON WARDS

SUBJECT: Study of Non Fiction — UNIT I-IV

COURSE CODE URD -306 — LESSONS: 1-20

PROF. (DR.) SHOHAB INAYAT MALIK
COORDINATOR P.G. URDU

DR. PARSHOTAM PAUL SINGH
TEACHER INCHARGE Urdu

http:/www.distanceeducationju.in

Printed and published on behalf of the centre for Distance & Online Education, University of Jammu by the Director, CDOE, University of Jammu.